کچے رشتے
محی الدین نواب

چشم بینا جو دکھائے وہ کم ہے۔ یہ آنکھیں عید کا چاند بھی دکھاتی ہیں اور محرم کا بھی۔ یہ آنکھیں دکھانے پر آئیں تو دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی دکھا دیتی ہیں۔ نہ دکھانا چاہیں تو اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہ آئے۔ یہ آنکھیں پریشان کرنا چاہیں تو محبوب کی جدائی کا تماشا دکھائیں اور حیران کریں تو ایک خالی ڈبے کے اندر سے محبوب کے نکل آنے کا تماشا بھی دکھائیں۔

محبوب علی بڑی حیرانی سے وہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اسٹیج پر کھڑے ہوئے آدمی نے پہلے اپنے سر پر ایک انڈا رکھا تھا۔ پھر اس سر پر ایک لانبی ہیٹ پہن لی تھی۔ دوسرے ہی لمحے جب اس نے ہیٹ کو سر سے اتارا تو جہاں انڈا رکھا تھا اب وہاں کبوتر بیٹھا نظر آیا۔ پھر وہ کبوتر پھڑپھڑا کر سر پر سے اڑتا ہوا اسٹیج سے باہر چلا گیا۔

اکثر ایسی شعبدہ بازیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ شعبدہ بازی کے ایسے کمالات اتنے گھسے پٹے اور پرانے ہوچکے ہیں کہ بچے دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہوگئے اور اب ان بوڑھوں کے بچوں کے بچے بھی یہی کمالات دیکھ رہے ہیں۔ دیکھنے والوں کو تجسّس ہوتا ہے کہ جو بات ناممکن ہے وہ آنکھوں کے سامنے کیسے ہوجاتی ہے۔ ایک انڈے سے پہلے بچہ نکلتا ہے پھر وہ بچہ رفتہ رفتہ اپنی عمر گزار کر پرواز کرنے کے قابل ہوتا ہے لیکن جادوگر کے سر پر رکھا ہوا انڈا فوراً ہی کبوتر بن کر اڑ جاتا ہے۔

جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ فلسفہ بن جاتی ہے۔ جو عمل ناممکن طریقے سے نقصان پہنچائے' وہ جادو کہلاتا ہے اور جو ناممکن بات آنکھوں کے سامنے ممکن ہوجائے اور محض تماشے اور تفریح کے طور پر ہو' ایسا عمل شعبدے بازی کہلاتا ہے۔ فلسفہ' جادو اور شعبدہ بازی میں ایک بات مشترکہ ہے' وہ یہ کہ یہ تینوں عام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ عام

انسانوں کی زندگی میں بہت سے معمے ہوتے ہیں جو سمجھنے کے لئے ہوتے ہیں' نہ سمجھانے کے لئے۔

محبوب علی کے آس پاس اس کے چچا اور چچا زاد بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تماشے سے زیادہ محبوب علی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی حرکتوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کی حرکتیں کسی معمے سے کم نہیں تھیں۔ وہ چھبیس برس کا ایک خوبرو صحت مند جوان تھا لیکن ذہن بالکل بچگانہ تھا۔ وہ تماشا دیکھ رہا تھا اور بچوں کی طرح خوش ہو ہو کر تالیاں بجا رہا تھا اور بار بار پلٹ کر اپنے چچا سے اور کبھی چچا زاد بھائی اعظم سے پوچھتا تھا۔ "یہ کیسے ہوگیا؟"

اعظم نے مسکرا کر کہا۔ "یہ جادو ہے جادو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس دیکھتے جاؤ۔"

محبوب نے اس تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی مونا کو دیکھا۔ مونا اس کی بلی تھی۔ اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ "مونا! تم نے دیکھا' کتنا اچھا کمال دکھایا ہے۔ مداری نے' انڈے کو کبوتر بنا کر اڑا دیا۔"

اسی وقت اسٹیج پر ایک چھوٹا سا الماری نما ڈبہ لاکر رکھا گیا تھا۔ شعبدہ باز تقریر کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "ناظرین! آپ کے سامنے میں اس ڈبے کو پیش کر رہا ہوں۔ یہ دیکھئے۔ یہ بالکل خالی ہے۔"

اس نے ڈبے کے دونوں پٹ کھولے۔ وہ بالکل خالی نظر آرہا تھا۔ اس کے دو ساتھیوں نے ڈبے کو اٹھا کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے ناظرین کو دکھایا۔ پھر اسے اسی جگہ رکھ دیا۔ شعبدہ باز نے کہا۔ "ناظرین! میں پروفیسر بخاری آپ کے سامنے اب ایک حیرت انگیز کمال پیش کرتا ہوں۔ اس ڈبے کے اندر ایک کبوتر کو بند کیا جائے گا لیکن.........."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اسٹیج کے باہر بڑے سے ہال میں دور دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا کبوتر اڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ مجھے اپنا کمال دکھانے کے لئے کسی جانور کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی جانور ہو۔ میں اسے انسان بنا دوں گا۔"

محبوب نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا جانور' انسان بن سکتا ہے؟"

پروفیسر بخاری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ضرور بن سکتا ہے۔ آپ اپنی یہ بلی ذرا مجھے دیں۔ میں اسے ایک پیاری پیاری سی' ننھی منی سی لڑکی بنا دوں گا۔"

محبوب نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بچوں کی طرح خوش ہو کر اپنے دائیں بائیں چچا اور اپنے بھائی اعظم کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر وہ بلی' پروفیسر بخاری کے حوالے کر دی۔

پروفیسر اسے لے کر اسٹیج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو وہ بلی دکھانے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جسے وہ جادو کی چھڑی کہتا تھا اور کوئی بھی کمال دکھانے سے پہلے اس چھڑی کو استعمال کرتا تھا۔ اس نے اس چھڑی کو بلی کے اوپر پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ننھی منی سی' پیاری پیاری سی لڑکی بنو گی؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے بلی کو اپنی بغل میں ہولے سے دبایا۔ بلی کو تکلیف کا احساس ہوا تو اس نے میاؤں کیا۔

پروفیسر نے ناظرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے' یہ بلی جواب دے رہی ہے۔ کہتی ہے کہ اسے جانوروں کی زندگی پسند نہیں ہے۔ یہ لڑکی بنے گی۔ تو آیئے ہم اسے لڑکی بناتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ الماری نما ڈبے کے پاس آیا۔ اس کے پٹ کھولے پھر اس کے اندر بلی کو رکھنے لگا۔ محبوب بے چینی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ پیچھے سے لوگ چیخنے لگے۔ "اے بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"

اس کے چچا اور بھائی نے اس کے دونوں ہاتھوں کو دو طرف سے پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا کر رہے ہو؟ خاموشی سے تماشا دیکھو۔"

وہ تالی بجاتے ہوئے خوشی سے کہنے لگا۔ "میری بلی ایک لڑکی بن جائے گی۔ بس میں اس لڑکی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ اپنے ساتھ کھلاؤں گا' پلاؤں گا' اپنے ساتھ سلاؤں گا۔"

اس کے چچا نے تھپکتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں' جو چاہے کرنا' پہلے چپ چاپ تماشا دیکھو۔"

ایسا کہتے ہوئے اس کے چچا نے کن انکھیوں سے اپنے بیٹے اعظم کی طرف دیکھا۔

اعظم فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ محبوب اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے والی سیٹ پر جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے' اس کا یہ بچگانہ پن دیکھ رہے تھے۔ ایک نے ذرا جھک کر اس کے چچا سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ یہ چھ فٹ کا قد آور نوجوان ہے صحت بھی ماشاء اللہ ایسی ہے کہ باڈی بلڈر نظر آتا ہے لیکن یہ بچوں کی طرح حرکتیں کیوں کر رہا ہے؟"

اس کے چچا نے کہا۔ "بس یہ قدرت کے تماشے ہیں۔ اسے ایک مکمل نوجوان کا جسم دیا ہے مگر ذہن بچگانہ دے دیا ہے۔ یہ بچوں جیسی زندگی گزارتا ہے۔"

محبوب نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔ "نہیں چچاجی' میں بچہ نہیں ہوں۔ میں جوان ہوں۔ وہ نجو کہتی تھی........."

نجو کا نام آتے ہی اس کا چچا ایک دم سے گھبرا گیا۔ جلدی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "بیٹے محبوب' یہاں اتنے لوگوں کے بیچ میں کسی کا نام نہیں لیتے۔ یہ گھر کی باتیں ہیں' خاموش رہو۔ دیکھو وہ تمہاری بلی کو لڑکی بنا رہا ہے۔"

محبوب نے اسٹیج کی طرف دیکھا۔ بلی کو اس الماری نما ڈبے میں بند کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر کچھ منتر پڑھتا ہوا اس ڈبے پر جادو کی چھڑی گھما رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر اسٹیج کے کنارے آکر پوچھا۔ "مسٹر آپ کا نام کیا ہے؟"

محبوب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "میرا نام محبوب علی ہے۔" پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں جوان بھی ہوں۔"

اس کے بعد تمام لوگ قہقہے لگانے لگے۔ اعظم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور کرسی پر بٹھا لیا۔ پروفیسر نے پھر پوچھا۔ "اچھا مسٹر جوان محبوب علی' تمہاری بلی کا کوئی نام بھی ہے؟"

"ہاں' میری بلی کا نام مونا ہے۔"

پروفیسر بخاری نے کہا۔ "واہ۔ بڑا پیارا نام ہے۔ اب یہ نام ایک بلی کا نہیں۔ ایک پیاری پیاری سی' ننھی منی سی لڑکی کا ہوگا اور وہ لڑکی اب آپ کے سامنے آیا ہی چاہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے قریب گیا۔ پھر پلٹ کر یوں اپنے سینے پر ہاتھ مار کر ابکائی لینے لگا جیسے حلق سے کوئی چیز نکلنا چاہتی ہو۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ناظرین سے کہا۔ "میں آپ

سے معذرت چاہتا ہوں کہ اس وقت میری طبیعت کچھ بگڑ رہی ہے۔ لڑکی ذرا دیر سے آئے گی۔ اس لئے پہلے میں اپنا علاج کرالوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ گردن پر زور سے مارا۔ اس کا منہ کھل گیا اور کھلے ہوئے منہ سے کاغذ کی ایک ربن باہر جھانکنے لگی۔ سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ پروفیسر نے چھڑی کو اس الماری نما ڈبے پر رکھ دیا پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اس ربن کو تھام لیا۔ اسے آہستہ سے کھینچا تو ربن اور منہ سے نکل آئی۔ پھر اس نے اور کھینچا تو وہ ربن ایک گز لانبی ہوگئی۔ تب وہ ربن کھینچتا چلا گیا۔ ربن اس کے منہ سے نکلتی چلی گئی۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ ربن اس کے منہ سے نکلتی جارہی تھی۔ نکلتی جارہی تھی۔ وہ اسٹیج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جارہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ربن کو نکالتا بھی جارہا تھا۔ اسٹیج پر وہ ربن پھیلتی جارہی تھی' لہراتی اور اڑتی جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ آخر اتنی ساری ربن اس کے حلق میں کیسے گھسی ہوگی۔ جو نکلتی ہی چلی جارہی ہے۔

تمام تماشائی خوش ہوکر تالیاں بجا رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے۔ دراصل یہ شعبدہ بازی کا ایک گُر ہوتا ہے۔ پروفیسر بخاری تمام تماشائیوں کو ایک نئے تماشے میں الجھا کر ادھر موقع دے رہا تھا کہ الماری نما ڈبے کے اندر تبدیلی آجائے۔ وہ ڈبہ کچھ اس طرح کا بنا ہوا تھا کہ چور خانہ دور بیٹھے ہوئے تماشائیوں کو دکھائی نہیں دیتا تھا اور وہ مستطیل ڈبہ اس انداز میں اسٹیج پر لاکر رکھا جاتا تھا کہ دور سے چوکور نظر آتا تھا۔ پچھلا حصہ جو نظروں سے اوجھل رہتا تھا اسی پچھلے حصے میں تماشے کی کامیابی کا راز چھپا ہوتا تھا۔

بہرحال وہ تماشا ختم ہوا تو پھر پروفیسر اطمینان سے چلتا ہوا اس الماری نما ڈبے کے پاس آیا۔ اس پر سے چھڑی اٹھائی پھر منتر جنتر پڑھتے ہوئے چھڑی کو اس ڈبے پر گھماتے ہوئے اس نے محبوب کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیوں مسٹر' تم اپنی مونا کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

محبوب پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "ہاں' میری مونا کو مجھے دکھاؤ۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے کہا۔ "بھئی اس نوجوان کو اسٹیج پر بلالو۔ یہ بار بار

اٹھتا بیٹھتا رہتا ہے اور ہمیں پریشان کرتا ہے۔"

پروفیسر نے کہا۔ "مسٹر محبوب! آیئے' تشریف لایئے۔ آپ اسٹیج پر آکر اپنی مونا کو دیکھئے۔"

محبوب تیزی سے چلتا ہوا اسٹیج کے کنارے پر آیا۔ پھر اچھل کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔ لوگ ہنسنے لگے کیونکہ اسٹیج پر پہنچنے کے لئے ایک طرف باقاعدہ زینہ بنا ہوا تھا۔ پروفیسر بخاری نے پوچھا۔ "مونا کو دیکھنے کی بڑی جلدی ہے؟"

محبوب نے ہاں' ہاں کے انداز میں جلدی جلدی سر ہلایا۔ پروفیسر نے کہا۔ "میں نے اس جادو کی چھڑی سے تمہاری بلی کو ایک لڑکی بنا دیا ہے۔ اگر میں اسی چھڑی سے تمہیں آدمی سے گدھا بنا دوں' تو.........؟"

محبوب گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ تمام تماشائی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ پروفیسر بخاری نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں' تم انسان ہو۔" انسان ہی رہو گے۔" اس نے تمام تماشائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو' عزیزو اور دوستو! انسان کو انسان ہی بنا رہنا چاہئے۔ اگر یہاں کوئی انسان کے روپ میں حیوان ہے تو میرے پاس چلا آئے۔ میں اس بلی کی طرح اسے بھی انسان بنا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ الماری نما ڈبے کے پاس آیا۔ پھر اس نے چھڑی کو ڈبے کی اوپری سطح پر دوبارہ مارتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں مونا' تم آدمی کی طرح بولو گی یا بلی کی طرح؟"

ڈبے کے اندر سے آواز آئی۔ "میاؤں' میاؤں۔"

پروفیسر بخاری نے مایوس ہو کر مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "افسوس یہ ابھی تک بلی ہے' انسان بننا ہی نہیں چاہتی۔ بھائیو بڑی مجبوری ہے۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو جانور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ بہرحال پھر ایک بار کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پھر جادو کی چھڑی کو دوبارہ اس ڈبے پر مارا اور پھر کہا۔ "پیاری مونا' اب تو انسانوں کی طرح بولو۔"

ڈبے کے اندر سے ایک نہایت ہی سریلی آواز سنائی دی۔ "ہائے ہائے۔ کیا بولوں۔ یہاں تو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ مجھے باہر تو نکالو۔"

وہ آواز سنتے ہی محبوب ایک دم سے چونک کر اس ڈبے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بلی انسانوں کی طرح بول رہی تھی۔ اسٹیج کے باہر تماشائی بھی ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ حیرانی سے اس ڈبے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پروفیسر بخاری ابھی کچھ اور بکواس کرنا چاہتا تھا۔ تماشائیوں کے تجسّس کو اور زیادہ ابھارنا چاہتا تھا لیکن ادھر محبوب سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ یکبارگی دوڑتا ہوا اس ڈبے کے پاس آیا اور اس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہاں ایک ننھی منی سی لڑکی دو زانو ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مسکرائی۔ ایک ہاتھ اٹھا کر سلام کیا پھر رینگتے ہوئے ڈبے سے باہر نکل آئی۔ تمام تماشائی تالیاں بجا رہے تھے۔

اس لڑکی کی عمر تقریباً آٹھ برس ہو گی۔ بہت ہی گوری گوری' گلابی گلابی' ایک دم گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ گڑیا جیسا فراک بھی پہنا ہوا تھا۔ محبوب نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے چھو لیا۔ پھر پوچھا۔ "کیا تم میری مونا ہو؟"

لڑکی نے کھڑے ہو کر تماشائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ صاحب پوچھتے ہیں۔ کیا میں ان کی مونا ہوں تو بھائیو! اور بزرگو آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہے کہ کچھ دیر پہلے میں بلی کے روپ میں ان کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور اب انسان کے روپ میں آپ کے پاس کھڑی ہوئی ہوں۔ پھر بھی یہ مجھے نہیں پہچانتے۔ پوچھ رہے ہیں' کیا میں ان کی مونا ہوں۔ ہاں' میں ان کی مونا ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی محبوب نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا۔ پھر گھوم گھوم کر خوشی سے چیخنے لگا۔ تماشائیوں کو دکھانے لگا۔ "دیکھو! یہ میری مونا ہے۔ کتنی پیاری پیاری گڑیا بن گئی ہے۔ اب میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا اور کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔"

کتنے ہی تماشائی چیخنے لگے۔ "ارے یہ کوئی پاگل کا بچہ ہے۔ اسے باہر نکالو۔ یہ ہماری تفریح برباد کر رہا ہے۔"

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "اسے پکڑو' مارو' یہاں سے باہر نکالو۔"

بہت سے تماشائی کھڑے ہو گئے۔ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ پروفیسر نے بھی اس کی

طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "لاؤ یہ میری بیٹی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "تمہاری بیٹی کیسے ہوئی۔ یہ میری مونا بلی ہے' اسے میں کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔"

پروفیسر بخاری قریب آیا تو اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ڈبے کے اوپر گر پڑا۔ اسٹیج رِنگ کے پیچھے سے دو آدمی اسے پکڑنے کے لئے آئے۔ اس نے ایک کو زور کی لات ماری۔ دوسرے کو ایک گھونسہ رسید کیا۔ پھر رِنگ کے درمیان سے نکلتا ہوا اسٹیج سے غائب ہوگیا۔ اتنی دیر میں تماشائی دوڑتے ہوئے اسٹیج تک پہنچے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور نکل گیا تھا۔ اس کے چچا رجب علی نے اپنے بیٹے اعظم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہاں سے بھاگ چلو۔ اس لڑکے نے مصیبت پیدا کر دی ہے۔ تماشائیوں کا دھیان ہماری طرف جائے گا تو وہ ہمیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دیں گے۔"

وہ اس شور اور ہنگامے سے گزرتے ہوئے اجنبیوں کی طرح ان کے درمیان سے نکل کر ہال سے باہر آگئے۔ اعظم نے کہا۔ "آخر وہ لڑکی کو لے کر کہاں بھاگ سکتا ہے؟"

"کہیں نہیں بھاگے گا۔ وہ دماغی طور پر بالکل بچہ ہے۔ چھپنے کے لئے ایک ہی جگہ ہے۔ آؤ' میں بتاتا ہوں۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اپنی کار کے پاس آئے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر وہ لڑکی کے ساتھ دبکا بیٹھا تھا۔ رجب علی نے کہا۔ "دیکھو' میں نہ کہتا تھا۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔ اب اگر ہم اسے واپس اسٹیج میں لے جائیں گے تو تماشائی اس کے ساتھ ہمارا حلیہ بھی بگاڑ دیں گے۔ اس نے ساری تفریح برباد کر دی ہے۔ تماشا ادھورا رہ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم پہلے حمید اللہ چوہدری کے پاس چلیں' وہی اس معاملے کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔"

دونوں باپ بیٹے کار کے دروازے کو کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بیٹے نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ پچھلی سیٹ سے محبوب نے بچی کو اپنی گود میں بٹھا کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "نہیں' میں اپنی مونا کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں حمید اللہ چوہدری کے پاس نہیں جاؤں گا۔ وہ پولیس والا میری مونا کو مجھ سے چھین لے

گا۔"

اس کے بڑبڑانے کے دوران گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ پھر اس جگہ سے دور ہونے لگی۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی وقت بہت سے لوگ ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ ایک نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو' شاید وہ بچی کو لے کر اسی گاڑی میں بھاگ رہا ہے۔ دوڑو' پکڑو۔"

مگر دوڑنے اور پکڑنے والے پیچھے ہی رہ گئے۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اعظم نے عقب نما آئینے میں پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ "ڈیڈی عجیب بات ہے۔ یہ لڑکی اپنوں سے بچھڑ کر پریشان نہیں ہے۔ محبوب سے یوں لگی ہوئی ہے جیسے برسوں سے اسے پہچانتی ہو۔"

محبوب نے کہا۔ "کیوں نہیں پہچانے گی میری بلی ہے۔"

رجب نے کہا۔ "بیٹے' یہ بلی نہیں ہے' وہ سب شعبدے بازی تھی۔ تم نہیں سمجھتے ہو۔ یہ پروفیسر بخاری کی کوئی رشتہ دار ہوگی یا اس کی بیٹی ہوگی اسے واپس کر دینا چاہئے۔"

"میں واپس نہیں کروں گا۔ اگر زبردستی کرو گے تو میں دروازہ کھول کر باہر کود جاؤں گا۔"

رجب علی نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں نہیں بیٹے' ہم زبردستی نہیں کر رہے ہیں۔ تم آرام سے بیٹھو۔ تمہاری مونا تمہارے پاس ہی رہے گی۔"

پھر وہ اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے۔ اس بھتیجے نے تو جینا عذاب کر دیا ہے۔ اب اس لڑکی کو اس سے چھڑانا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ بڑی مصیبتیں پیدا کرے گا۔"

دوسری طرف وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ میرے دوست بنو گے؟"

محبوب نے کہا۔ "ہاں' میں تمہارا پہلے بھی دوست تھا۔ آج بھی ہوں۔"

لڑکی نے کہا۔ "وہ پروفیسر مجھے پیٹ بھر کر نہیں کھلاتا تھا۔ مجھے ٹافی بھی نہیں دیتا تھا۔ تم مجھے ٹافی کھلاؤ گے۔"

"ہاں ٹافیاں' چاکلیٹ' بسکٹ' مٹھائیاں سب کچھ کھلاؤں گا۔ میرے پاس بہت سے

کھلونے بھی ہیں۔

"سچ؟" لڑکی بہت خوش ہو رہی تھی، جیسے اسے اس کا من پسند ساتھی مل گیا ہو۔
اس کی کار ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ کوٹھی کے احاطے کے گیٹ پر ایک رائفل بردار سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ گیٹ کے پاس کیبن کے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے سپاہی نے رجب علی کو دیکھ کر پہچان لیا۔ پھر اس نے فون کے ذریعے کوٹھی کے اندر اپنے صاحب کو اطلاع دی۔ اس کے بعد اس نے مین گیٹ کو کھلوا دیا۔ انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ کار آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی پورچ میں آکر رک گئی۔

اعظم نے ناگواری سے محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو، اس لڑکی کو لے کر اندر چلو۔"

محبوب نے کہا۔ "نہیں، میں اس کوٹھی کے اندر نہیں جاؤں گا۔"

"تمہارا باپ بھی چلے گا۔"

رجب علی نے فوراً اعظم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "بیٹے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ نرمی سے پیش آؤ۔ یہ بچہ ہے۔"

یہ کہہ کر رجب علی نے آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا۔ اعظم نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "محبوب تو میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میری بات مانتا ہے۔ ہم اس گڑیا جیسی بچی کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں گے بس چوہدری صاحب سے کہیں گے کہ وہ اسے گھر لے جانے کی اجازت دیں۔"

محبوب نے خوش ہو کر کہا۔ "سچ بھائی جان، میں اپنی مونا کو اپنے ساتھ لے جاسکوں گا؟"

"ہاں، اسی لئے تو ہم تمہیں یہاں لائے ہیں۔ اب کار سے باہر نکلو۔"

وہ اسے سمجھا منا کر کوٹھی کے اندر لے آئے۔ پھر ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔
تھوڑی دیر بعد حمید اللہ چوہدری وہاں آئے۔ رجب علی اور اعظم نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ پھر رجب علی نے کہا۔ "سر! آپ محبوب کو بہت عزیز رکھتے ہیں اسی لئے ہم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو آپ ہی کے پاس چلے آتے ہیں۔ اب یہ نئی مصیبت محبوب نے اپنے

ساتھ لگا رکھی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
حمید اللہ چوہدری نے محبوب کے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں بیٹے، یہ بچی کون ہے؟"

محبوب نے کہا۔ "انکل، یہ میری بلی ہے مونا۔ ایک جادوگر نے اسے بلی سے انسان بنادیا ہے۔ اب یہ میرے پاس رہے گی۔"

حمید اللہ چوہدری نے رجب علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا قصہ ہے؟"

رجب علی، مختصر طور پر اسے ساری روداد سنانے لگا۔

حمید اللہ چوہدری نے سب کچھ سننے کے بعد فون کا ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کئے۔ پھر رابطہ قائم ہونے کے بعد کہا۔ "میں ڈی آئی جی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے جواباً کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ "تمہارے علاقے کے ہال میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "یس سر! وہاں ایک پروفیسر بخاری، اسٹیج شو کر رہا تھا کہ ایک شخص محبوب علی نام کا نیم پاگل آدمی اس کی بچی کو اٹھا کر لے گیا۔ پروفیسر بخاری اور اس کے ساتھ کئی لوگ آئے ہیں اور اس وقت میرے سامنے موجود ہیں۔"

حمید اللہ چوہدری نے کہا۔ "پروفیسر بخاری کو ساتھ لے کر میری کوٹھی پر آجاؤ۔ ان کی لڑکی میرے پاس ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر محبوب کے پاس آکر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "بیٹے، تم اپنی مونا کو لے کر دوسرے کمرے میں جاؤ۔ وہاں بہت سے کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ کھیلتے رہو۔"

محبوب نے پوچھا۔ "آپ نے اس جادوگر کو یہاں کیوں بلایا ہے۔ آپ بہت چالاک ہیں۔ مجھے وہاں کمرے میں بند کردیں گے اور میری مونا کو اس کے حوالے کردیں گے۔"

اس نے پچکارتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹے، تمہاری مونا تمہارے پاس رہے گی۔ میں اس جادوگر کو سمجھاؤں گا کہ وہ تم سے تمہاری مونا کو نہ چھینے۔"

وہ خوش ہو کر مونا کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے جانے لگا۔ جب وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا تو رجب علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "سر! یہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا چاہئے۔ ہم سب یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ

محبوب اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی' اس لڑکی کو نہیں چھوڑے گا۔ پچھلے تجربات ہمارے سامنے ہیں۔"

اعظم نے کہا۔ "سر! اس بلی کے لئے بھی اس نے بڑا پریشان کیا تھا۔ اس ایرانی خاتون کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ خاتون سیاحت کے لئے یہاں آئی تھیں۔ ان کے پاس کچھ رقم کم پڑ رہی تھی۔ واپس بھی جانا تھا اس لئے ہم نے دو ہزار روپے میں وہ بلی خرید کر محبوب کو دے دی۔"

رجب علی نے کہا۔ "ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ محبوب ہماری کوٹھی کے احاطے سے باہر نہ جائے۔ باہر جاتا ہے' کوئی چیز دیکھ لیتا ہے اور اسے پسند آجاتی ہے تو اس کے لئے مچل جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی رقم دے کر وہ چیز ہمیں حاصل کرنی پڑتی ہے۔"

حمید اللہ چوہدری نے پوچھا۔ "اتنی احتیاط کے باوجود اسے جادوگری کا تماشا دکھانے کے لئے وہاں کیوں لے گئے تھے؟"

"ہم نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ پڑوس کے ایک بچے نے یہ بات محبوب کے کان میں پھونک دی کہ کوئی بڑا جادوگر آیا ہے اور بڑے دلچسپ تماشے دکھاتا ہے۔ تمام بچے دیکھنے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے پیچھے پڑ گیا اور جب کسی بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو ہمیں اس کی وہ ضد پوری کرنی ہی پڑتی ہے۔"

اعظم نے کہا۔ "سر' ہم نے سوچا تھا کہ اسے کار میں بٹھا کر لے جائیں گے اور ہال میں اپنے درمیان بٹھائے رکھیں گے اور اسے کہیں بھٹکنے نہیں دیں گے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ جادوگر اس کی بلی لے کر شعبدہ دکھائے گا تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔"

"یہ بہت برا ہوا۔ محبوب کے بچگانہ ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ لڑکی اس کی بلی ہے اور اب اس لڑکی سے اسے علیحدہ کرنا بہت دشوار ہوگا۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔"

رجب علی نے کہا۔ "مشکل تو یہ ہے کہ کسی بات سے اگر زبردستی روکا جائے تو خودکشی کرنے لگتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ ایک بار چھت سے رسی لٹکا کر گلے میں پھندا ڈالے دیا تھا۔ اگر ہم عین وقت پر نہ پہنچ جاتے تو قانون کی گرفت میں آجاتے۔"

حمید اللہ چوہدری نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے' مسکرا کر کہا۔ "مسٹر رجب علی' تمہارا بھائی' محبوب کا باپ' میرا عزیز ترین دوست تھا۔ اس نے جو وصیت لکھوائی ہے۔ وہ میرے اشارے پر لکھوائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بعد اس کے بیٹے کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ تم اس کے سگے چچا ہو مگر میں قانون کا محافظ ہوں۔ کھری بات سب کے منہ پر بولتا ہوں۔ تم اس کی جان کے دشمن بن سکتے تھے۔ اس کے بعد اس کی ساری دولت اور جائیداد تمہارے اور تمہارے بیٹے کے حصے میں آسکتی تھی لیکن اس وصیت کی ایک شرط نے تم دونوں باپ بیٹے کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ اگر محبوب خودکشی کرے گا یا قتل کردیا جائے گا یا کسی حادثے کا شکار ہوکر مرے گا تو مجرموں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا وہ تو بعد کی بات ہے لیکن اگر محبوب طبعی موت بھی مرے گا تو تم دونوں باپ بیٹوں کو اس کی سرپرستی سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس کی سرپرستی کے صلے میں ہی تم لوگ اس کی دولت پر عیش کر رہے ہو۔ اس عیش کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے تم لوگ قدم قدم پر محبوب کی حفاظت کرتے ہو۔ ہمیشہ چوکنے رہتے ہو کہ کہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاک نہ ہوجائے اور دنیا والے سمجھتے ہیں کہ کتنے پیار کرنے والے چچا اور کتنے پیار کرنے والے بھائی ہو۔ محبوب کا اتنا خیال رکھتے ہو۔ دن رات اس کے لئے پریشان رہتے ہو۔ آہا' بے چارے۔"

وہ دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ایک اتنے بڑے پولیس آفیسر سے وہ بحث نہیں کرسکتے تھے۔ پھر یہ کہ وہ محبوب کے مرحوم والد کا بہت گہرا دوست تھا اور اس دوستی کے حوالے سے ان باپ بیٹے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ شاید اس کی طنزیہ باتیں ابھی جاری رہتیں' اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر سنا۔ پھر کہا۔ "ٹھیک ہے اندر بھیج دو۔"

اس کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس انسپکٹر' پروفیسر بخاری کے ساتھ ڈرائنگ روم میں حاضر ہوا اس نے حمید اللہ چوہدری کے سامنے آکر اسے سیلوٹ کیا پھر کہا۔ "جناب یہی پروفیسر بخاری ہیں۔"

پروفیسر بخاری نے جھک کر سلام کیا اور کہا۔ "جناب' میں ایک غریب شعبدہ باز

ہوں۔ بس ایسے ہی الٹے سیدھے کمالات دکھا کر اپنا پیٹ بھرتا ہوں۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔"

حمید اللہ چوہدری نے اس کی بات کاٹ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں سب جانتا ہوں۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔"

پروفیسر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور اس صوفے پر بیٹھ گیا۔ حمید اللہ چوہدری نے کہا۔ "جس لڑکے کے خلاف تم نے رپورٹ لکھائی ہے۔ وہ بہت ہی معصوم ہے۔ وہ جسمانی طور پر جوان اور قد آور ہے لیکن ذہنی طور پر بالکل ہی بچہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں تمہاری بیٹی کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بائی دی وے تم اس شہر میں کہاں رہتے ہو؟"

"حضور، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم گھوم پھر کر اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ میں اپنے دو اسسٹنٹ اور اپنی اس بچی کے ساتھ ایک پسماندہ علاقے کی جھگی میں رہتا ہوں۔"

حمید اللہ چوہدری نے کہا۔ "اگر تمہیں ایک کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہنے کے لئے جگہ دے دی جائے تو کیا وہاں رہنا پسند کرو گے؟"

"حضور، آپ کی نوازش ہے۔ اس شہر میں ٹھکانہ مل جائے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"جس لڑکے نے تمہاری بیٹی کو اپنا سمجھ کر حاصل کیا ہے۔ اس کا نام محبوب ہے۔ تم محبوب کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں کچھ روز رہو۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ تم نے اس کی بلی کو لڑکی بنا دیا ہے۔ اب وہ دو چار روز تک اس سے دل بہلا لے گا تو پھر کسی دن جب وہ سویا ہو گا تو تمہاری لڑکی کو اس کے پاس سے ہٹا لیا جائے گا اور اس کی بلی مونا کو اس کے پاس سلا دیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ وہ رفتہ رفتہ پھر بلی بن گئی ہے۔"

"حضور، میں سب سمجھ گیا۔ محبوب کا کوئی مینٹل کیس ہے۔ میں اس سلسلے میں تعاون کروں گا اور اپنی بیٹی کو اس کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہیں سرونٹ کوارٹر میں رہوں گا۔"

حمید اللہ چوہدری نے پوچھا۔ "محبوب کی وہ ایرانی بلی کہاں ہے۔"

پروفیسر چند لمحے تک ساکت رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہا۔ "حضور وہاں ایسی افراتفری تھی۔ تماشائی شور مچا رہے تھے کہ میں بدحواس ہو گیا تھا۔ میں نے بلی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ شاید میرے دونوں اسسٹنٹ جانتے ہوں گے۔ وہ بلی ان کے پاس ہو گی یا انہوں نے کہیں اسے حفاظت سے رکھ دیا ہو گا۔"

"جاؤ، اپنے اسسٹنٹ سے معلوم کرو۔ وہ بلی بہت اہم ہے۔"

پروفیسر بخاری نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے دونوں اسسٹنٹ باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ میں ان سے معلوم کر کے ابھی آتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ "حضور، وہاں! ہال میں اتنا ہنگامہ تھا۔ تماشائی اس قدر پریشان کر رہے تھے کہ میرے دونوں اسسٹنٹ اس بلی کی طرف دھیان نہ دے سکے۔ پتا نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے۔"

"تو پھر جاؤ۔ اسے کہیں سے تلاش کر کے لے آؤ۔"

"حضور عالی، ہم اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں تلاش کریں گے۔ آپ اجازت دیں تو کسی دوسری بلی کو لا کر رات کے وقت محبوب کے پاس سلا دیا جائے گا اور میں اپنی بیٹی کو لے کر چلا جاؤں گا۔"

حمید اللہ چوہدری نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ وہ ایرانی بلی تھی۔ محبوب اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس بلی کے رنگ کو پہچانتا ہے۔ اس کی عادت کو بھی خوب یاد رکھتا ہے۔ پھر وہ دوسری بلی کو کیسے قبول کرے گا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ہم اس بلی کو تمام شہر میں تلاش کریں گے لیکن اتنا بتا دیجئے اگر ہمیں ناکامی ہوئی اور وہ ایرانی بلی نہ مل سکی تب میری بیٹی کا کیا ہو گا؟"

حمید اللہ چوہدری نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر حاکمانہ انداز میں کہا۔ "تمہیں شعبدے بازی کا کمال دکھاتے وقت سوچنا چاہئے تھا، کسی کی چیز جب تم اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے حاصل کرتے ہو تو وہ چیز اسے واپس بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر نہ کر سکے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اگر تم قانون کے دروازے پر یہ فریاد کرنے آئے ہو کہ محبوب تمہاری بیٹی کو لے گیا ہے تو محبوب کی فریاد بھی سن لو کہ تم اس کی بلی کو کہیں غائب کر چکے

ہو۔"

"حضور' بلی اور انسانی جان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ میری لختِ جگر ہے۔"

"درست کہتے ہو۔ بلی سے بہت زیادہ اہمیت تمہاری بیٹی کی ہے لیکن یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرو کہ محبوب ایک دماغی مریض ہے۔ اگر اس نے بلی کے لئے ضد میں آکر خودکشی کرلی یا کسی طرح ہماری لاعلمی میں اپنی جان پر کھیل گیا تو پھر اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ ایسے وقت تمہاری بیٹی اور بلی کا موازنہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تمہاری بیٹی اور محبوب کی زندگی کا موازنہ کیا جائے گا۔ اب جاؤ اور اس بلی کو تلاش کرو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہاری بیٹی بالکل محفوظ' زندہ اور سلامت رہے گی۔"

پروفیسر بخاری سر جھکا کر جانے لگا۔ رجب علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اور اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر پروفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میری کوٹھی کا پتا ہے۔ تم اپنے دونوں اسسٹنٹ کے ساتھ وہاں آکر میرے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتے ہو۔ جب چاہو' چلے آنا۔"

پروفیسر وہ کارڈ لے کر چلا گیا۔

حمید اللہ چوہدری نے کہا۔ "مسٹر رجب علی! اب آپ انسپکٹر کے ساتھ جاکر تھانے میں رپورٹ درج کرائیں۔ رپورٹ کچھ ایسی ہو کہ محبوب علی ایک دماغی مریض ہے پروفیسر بخاری نے اپنے اسٹیج شو کے دوران محبوب علی سے اس کی ایک ایرانی بلی لی اور اسے اپنے ایک آئٹم میں استعمال کیا۔ اس بلی کو ایک ڈبے میں بند کیا اور اس کی جگہ ایک لڑکی کو برآمد کیا۔ یہ بات محبوب کے دماغ میں بیٹھ گئی کہ اس کی بلی لڑکی بن گئی ہے اور پروفیسر بخاری نے بھی کمال دکھانے سے پہلے یہ اعلان کیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس بلی کو ایک لڑکی بنا دے گا۔ اب محبوب علی کے دماغ میں جو بات نقش ہو گئی ہے اسے مٹانے کے لئے لازمی ہے کہ وہی ایرانی بلی واپس لاکر اس کے پاس رکھی جائے اور اس لڑکی کو اس کے پاس سے ہٹا دیا جائے۔ صورت حال یہ ہے کہ وہ ایرانی بلی لازمی طور پر واپس لائی جائے اور اگر وہ نہ ملے تو کوئی دوسری تدبیر کی جائے۔ ایسی تدبیر جس سے محبوب ذہنی طور

پر مشتعل نہ ہو اور اپنی جان کا دشمن نہ بنے۔ محبوب کے سلسلے میں جب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آئے گا' اس وقت تک وہ لڑکی محبوب کے پاس رہے گی اور اس لڑکی کی حفاظت اور سلامتی کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ اب تم لوگ جاؤ۔ رپورٹ درج کرانے کے بعد محبوب اور اس لڑکی کو یہاں سے لے جانا۔"

وہ چپ چاپ سر جھکائے کوٹھی سے باہر آگئے۔ اعظم اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رجب علی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر انسپکٹر کو بیٹھنے کے لئے کہا پھر خود بیٹھتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے پہلے محبوب کی نگرانی ہمارے ذمہ تھی اب اس لڑکی کی بھی نگرانی کرنی ہوگی۔ انہیں کچھ نقصان پہنچے گا تو ہم پر مصیبت آجائے گی۔"

اعظم نے کار اسٹارٹ کی۔ اسے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر لے گیا۔ پھر پولیس اسٹیشن کی طرف جانے لگا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "آخر قصہ کیا ہے؟ تھانے میں کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ محبوب نیم پاگل ہے۔"

"نیم پاگل تو نہیں ہے۔ ہاں' اس کا ذہن بچگانہ ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "جو بڑی عمر کا آدمی بچوں جیسی حرکتیں کرے اور کبھی عقل کی بات نہ کرے' کوئی بڑوں جیسا کام نہ کرے تو اسے نیم پاگل ہی کہتے ہیں۔ بڑے آدمی کو کوئی بچہ نہیں کہتا۔"

"وہ پاگل ہو یا نہ ہو مگر ہم جلدی ہی پاگل ہو جائیں گے۔"

"آخر اس کی یہ ذہنی حالت کیسے ہوگئی؟ کیا وہ پیدائشی ایسا ہے؟"

رجب علی نے ایک گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ پیدائشی طور پر ایسا ہی ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اس کے نگران مقرر کر دیئے گئے ہیں۔"

☆======☆======☆

اکثر لوگ خوش نصیب بننے کا خواب دیکھتے دیکھتے بدنصیبی کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی حد تک خوش نصیب بن جاتے ہیں مگر بدنصیبی ان کا پیچھا نہیں

چھوڑتی۔ رجب علی کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ اسے محبوب کی سرپرستی کے سلسلے میں اپنے مرحوم بھائی کی جائیداد سے ہرماہ پندرہ ہزار روپے ملتے تھے۔

اس کے مرحوم بھائی تراب علی نے کچھ یوں وصیت لکھی تھی کہ محبوب علی جب تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تراب آئرن ملز کے کاروبار کو سنبھالنے کے قابل نہ ہوجائے۔ اس وقت تک وہ کاروبار' بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تحت جاری رہے گا۔ ان ڈائریکٹروں میں اس وقت کے ڈی آئی جی حمید اللہ چوہدری اور تراب علی کے خاندانی وکیل حشمت بیگ کا نام قابل ذکر تھا۔ وہ دونوں تراب علی کے معتمد خاص تھے۔ تراب علی کو یقین تھا کہ اس کی موت کے بعد وہ دونوں اس کے کاروبار میں کوئی دھاندلی یا بے ایمانی نہیں کریں گے اور اس کے بیٹے کے حقوق محفوظ رکھیں گے۔

وصیت میں یہ بھی لکھا تھا کہ محبوب علی اپنے چچا رجب علی کی سرپرستی میں پرورش پائے گا۔ رجب علی اس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلے دس برس تک رجب علی کو ماہانہ پانچ ہزار روپے ملا کریں گے۔ جب محبوب علی پندرہ برس کا ہوجائے گا تو یہ رقم بڑھا دی جائے گی اور رجب علی کو دس ہزار روپے ماہانہ ملا کریں گے۔ محبوب علی اپنی عمر کے بیس برس کے بعد جب تک کاروبار سنبھالنے کے قابل نہ ہو اس وقت تک رجب علی کو پندرہ ہزار روپے ملا کریں گے۔

محبوب علی کے چچا رجب علی کو دیانت دار بنائے رکھنے کے لئے وصیت میں چند شرطیں پیش کی گئی تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ محبوب علی اپنی شادی کی عمر تک پہنچنے پر اپنے چچا کی لڑکی شبانہ سے شادی کرے۔ یہ شرط اس لئے تھی کہ رجب علی کو اپنی بیٹی کا مستقبل شاندار نظر آئے اور وہ محبوب علی کو کوئی جانی یا مالی نقصان نہ پہنچائے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ خدانخواستہ اگر محبوب علی کی طبعی موت واقع ہوجائے یا وہ ہلاک ہوجائے یا کسی حادثے کا شکار ہوجائے تو کسی بھی صورت میں رجب علی اور اس کے تمام اہل و عیال اس رقم سے محروم ہوجائیں گے جو انہیں ماہانہ ملا کرتی ہے۔

یہ دو بندشیں ایسی زبردست اور دانشمندانہ تھیں کہ کوئی جانی دشمن بھی محبوب کو اپنی سگی اولاد کی طرح پالنے اور اس کی دکھ بیماری میں رات رات بھر جاگنے کے لئے آمادہ

ہوجاتا اور رجب علی یہی فرائض انجام دے رہا تھا۔ ماہانہ پندرہ ہزار روپے حاصل کر رہا تھا۔ اگرچہ یہ رقم معمولی نہیں ہوتی تاہم مفت کی آمدنی منہ لگ جائے تو لالچ اور بڑھ جاتا ہے۔

وہ مختلف ہتھکنڈوں سے محبوب کے لئے مزید رقمیں حاصل کرتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ اسے ایسا ضدی بنا دیا تھا کہ وہ مہنگی سے مہنگی چیزیں خریدنے کی ضد کرتا۔ گھر میں ایک کار ہوتی تو محبوب کو ورغلایا جاتا۔ وہ دوسری ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھنے کی ضد کرتا۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کار محبوب کے لئے آتی لیکن اعظم وغیرہ کے استعمال میں رہتی۔ اس کے لئے جو چیز سو روپے کی آتی۔ اس کا بل ہزار روپے کا بنوایا جاتا تھا۔ اس ایرانی خاتون نے محبوب کو تحفتاً وہ بلی دی تھی اور رجب علی نے دو ہزار روپے کا بل بناکر وکیل حشمت بیگ کو پیش کیا تھا اور وہ رقم وصول کی تھی۔ وہ ایسے ہی ہتھکنڈوں سے مزید رقمیں حاصل کرتے رہتے تھے۔

جب محبوب علی سات ماہ کا تھا تب اس کی ماں مرگئی۔ رجب علی کی بیوی یعنی محبوب کی چچی نے اسے گود لیا اور ایک ماں کی ممتا کا بھرپور اظہار کیا۔ تراب علی اپنا زیادہ وقت اپنے بیٹے کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے باوجود بچے کی پرورش کے لئے ایک عورت لازمی ہوتی ہے' اسی لئے وہ اپنے بھائی رجب علی کی بیوی پر تکیہ کرنے پر مجبور تھا۔

وہ بڑے لاڈ پیار سے اس کی دیکھ بھال کرتی تھی لیکن جب رات کو بچہ روتا اور اس کی نیند میں خلل پڑتا تو وہ بیزار ہوجاتی تھی۔ بیزاری کا اظہار نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا اس نے بچے کو تھوڑی تھوڑی افیون دینی شروع کی۔ بچہ نشے میں آرام سے صبح تک سوتا رہتا تھا۔ جب رجب علی کو معلوم ہوا تو اس نے بیوی کو ڈانٹ کر کہا۔ یہ کیا کر رہی ہے۔ اگر بچہ نشے کا عادی ہوجائے گا تو سارا الزام ہم پر آئے گا کہ ہم نے اس کی زندگی برباد کی ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "میں کیا کروں۔ دکھاوے کے لئے دن بھر محبت کر سکتی ہوں۔ اس کی غلاظت صاف کرتی ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لئے میں اپنی

نیند خراب نہیں کر سکتی۔"

اس کے بعد سے بیگم نے اسے افیون نہیں دی لیکن جتنی دے چکی تھی اس کا وہ عادی ہوگیا تھا۔ اس کے بغیر وہ روتا' مچلتا رہتا تھا۔ ساری ساری رات بیگم کو جگاتا تھا اور وہ مجبور ہو کر جاگتی تھی۔ اسے گالیاں نہیں دے سکتی تھی۔ اسے مار نہیں سکتی تھی کیونکہ دوسرے ہی کمرے میں اس کا باپ تراب علی سوتا تھا۔ اکثر رات کو اٹھ کر کہتا تھا۔ "بھابی! آپ بچے کے لئے بڑی پریشانیاں اٹھا رہی ہیں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ تب بیگم خوش ہو جاتی تھی۔ سوچتی تھی۔ اتنی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود وہ تراب علی کے دل پر اثر کر رہی ہے اور اس کا کچھ بھلا ہونے والا ہے' دو برس کے بعد بیگم نے شبانہ کو جنم دیا۔ تراب علی نے اسے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بھابی! اب یہ میری بہو بنے گی۔ میں مرنے سے پہلے وصیت میں لکھ جاؤں گا کہ میرے بیٹے کو ہر حال میں شبانہ سے شادی کرنی ہوگی۔ خاندان میں ہی رشتہ ہو تو بہتر ہوتا ہے۔" تیسرے برس تراب علی کو دل کا دورہ پڑا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اس نے اپنے دوست حمید اللہ چوہدری اور وکیل حشمت بیگ کے مشورے کے مطابق وصیت لکھی اور اس کے کچھ دنوں بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ اپنے بھائی' بھابی اور ان کی اولاد کو اپنی وصیت کے جال میں پھانس کر چلا گیا۔ رجب علی نے تنہائی میں اپنی بیگم کو سمجھایا۔ "فکر نہ کرو۔ ہم محبوب کو اتنا پیار دیں گے' اتنا پیار کریں گے کہ وہ ہمارے لاڈ پیار میں بالکل ہی ناکارہ ہو جائے گا۔ دشمن کو مارنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ نفرت کا زہر دیا جائے محبت سے بھی مارا جاسکتا ہے اور ہمارے حق میں محبت کی مار بہتر ہوگی کیونکہ اس مار کے بعد بھی محبوب زندہ رہے گا اور ہمارے لئے آمدنی کا ذریعہ بنتا رہے گا۔"

تراب علی کی موت کے بعد حمید اللہ چوہدری برابر محبوب کا خیال رکھنے کے لئے گھر آیا کرتا تھا۔ پہلے' دن میں ایک بار آتا تھا۔ پھر مصروفیات کے باعث ہفتے میں ایک بار آنے لگا۔ ایک برس کے بعد ہی اس کا تبادلہ ہوگیا۔ لہٰذا اسے مجبوراً اس شہر سے جانا پڑا لیکن وہ ایک ماہ بعد ضرور آتا تھا۔ محبوب کو بھی دیکھتا تھا اور کاروبار کا حساب بھی چیک کرتا تھا۔ اسے محبوب کو دیکھ کر مایوسی ہوتی تھی۔ سال بھر تک الف۔ ب کا قاعدہ پڑھانے کے

باوجود اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ الف سے یے تک کے حروف بار بار بھول جاتا تھا۔ کچھ تو شاید قدرتی طور پر وہ کند ذہن ہوگا۔ کچھ افیون نے اپنا اثر دکھایا ہوگا۔ اس کے بگڑنے میں سب سے زیادہ ہاتھ چچا اور چچی کا تھا۔ وہ دونوں اس سے اتنا پیار کرتے تھے کہ اپنے والدین بھی ہوتے تو اتنا نہ کرتے۔ وہ اس کی ہر بات مان کر اسے ضدی بناتے رہتے تھے۔ اس کے غصے کو برداشت کر لیتے تھے۔ اس کے لئے قیمتی کھلونے خرید کر لاتے تھے اور کھیلوں میں دلچسپی پیدا کرتے تھے۔ ایسے میں بھلا وہ پڑھنے میں کیا دل لگاتا۔

اس کے برعکس شبانہ بہت ذہین تھی۔ اس نے گیارہ برس کی عمر میں سات جماعتیں پاس کر لیں۔ وہ محبوب کو بھی سمجھاتی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتی تھی لیکن اس کے لئے پڑھنے میں بھی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک دن اعظم کی بیوی نے کہا۔ "کیا آپ شبانہ کے تیور دیکھ رہے ہیں؟"

"اعظم نے پوچھا۔ "کیوں شبانہ کو کیا ہوا ہے؟"

"یہ ابھی سے محبوب کی بہت ہمدرد ہے۔ اسے بہت چاہتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد یہ محبوب کی ہو کر رہ جائے اور ہم سب کو بھول جائے۔ پرایا سمجھنے لگے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ میری بہن ہے۔ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا پہلے خیال کرے گی۔"

"یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ آج کل سو میں کوئی ایک لڑکی ایسی ہوتی ہے جو ماں باپ کا گھر بھرتی ہوگی۔ ورنہ سبھی اپنا بینک بیلنس بڑھانے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ اپنا مستقبل' اپنے بچوں کا مستقبل دیکھتی ہیں اور شوہر کو اپنے لئے انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ میں پہلے سے کہہ دیتی ہوں۔ یہ شبانہ صرف اپنے مطلب کی خاطر محبوب کو ہینڈل کرے گی اور ایک دن ہم سب کو اس کوٹھی سے نکال دے گی۔"

"تم کیا چاہتی ہو۔ کیا میں اپنی بہن کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالوں۔"

"کیا مارنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ کیا محبوب کو مار ڈالا گیا ہے۔ اسے بھی تو زندہ رکھا گیا ہے۔ شبانہ کو بھی کند ذہن بنا کر رکھا جاسکتا تھا۔ مگر آپ لوگوں نے یہ نہیں سوچا۔"

"بکواس مت کرو۔ امی نے سن لیا تو تمہاری دشمن بن جائیں گی۔ بھلا کوئی اپنی اولاد

کو جان بوجھ کر کند ذہن بناتا ہے۔"

"آپ اپنے والدین کی بات نہ کریں۔ بات میرے اور آپ کے درمیان ہو رہی ہے۔ اگر آپ اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو میں ایک مشورہ دیتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ محبوب اور شبانہ کی شادی کبھی نہ ہونے دیں۔ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتے رہیں۔ جس دن شادی ہوگی' وہ ہم سب کی تباہی کا پہلا دن ہوگا۔ آپ کو میری باتیں بری لگیں گی لیکن آپ تنہائی میں ٹھنڈے دل سے ذرا غور کرلیں۔"

اس وقت واقعی اعظم کو اپنی بیوی کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔ وہ غصے سے باہر چلا گیا لیکن رفتہ رفتہ یہ بات اس کے دماغ میں پکنے لگی۔ لڑکیاں بڑی خود غرض ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد اگر دولت ان کے قدموں میں ہو تو بھائی' باپ اور ماں کو بھی نہیں پوچھتیں۔ میکے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتیں۔ اگر شبانہ بھی ایسی نکلی تو کیا ہوگا اور اس کی بیوی نے سچ ہی کہا تھا۔ شبانہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ محبوب سے بہت ہمدردی کرتی ہے اور اس سے کچھ لگاؤ بھی رکھتی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں یہ حال ہے تو آگے جاکر کیا ہوگا۔

وہ کچھ دنوں تک پریشان رہا۔ اسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔ ایک دن اس کے باپ رجب علی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے۔ آج کل تم کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہتے ہو؟"

اعظم نے اپنے باپ کو وہ تمام باتیں بتادیں جو اس کی بیوی سے ہوئی تھیں۔ رجب علی غور سے سنتا رہا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "بہو ٹھیک کہتی ہے۔ شبانہ کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ بہت خود سر نکلے گی اور ہم سے زیادہ محبوب کی طرف مائل رہے گی۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ تو ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ ہماری آمدنی محفوظ رہے۔ ورنہ ہم ایک ایک پیسے کے محتاج ہوجائیں گے؟"

رجب علی نے کہا۔ "وہ ہماری بیٹی ہے' تمہاری بہن ہے۔ ہم اس سے دشمنی بھی نہیں کرسکتے۔ ایک ہی راستہ سمجھ میں آتا ہے کہ جتنے سال تک ہم شبانہ کو تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رکھ سکتے ہیں' ایسا کرتے رہیں۔ اگر ہم نے پندرہ برس تک بھی اسے

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصروف رکھا تو ان پندرہ برسوں میں ہم بہت کچھ اپنا بینک بیلنس بڑھالیں گے۔ اس کے بعد پھر جو حالات ہوں گے' دیکھا جائے گا۔"

"ہم اپنے بینک اکاؤنٹ میں کیا خاک جمع کریں گے ڈیڈی' یہاں کوئی تیسرا سننے والا نہیں ہے۔ ہم باپ بیٹے کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم دونوں ہی فضول خرچ ہیں۔ آج تک کبھی بڑی رقم بچاکر نہیں رکھ سکے' آئندہ کیا بچائیں گے۔ پھر میری بیگم کی یعنی آپ کی بہو کی فرمائشیں دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ شاپنگ بھی ہزاروں کی ہوتی ہے۔ بھلا ایسے میں ہم کیا بچائیں گے۔ ہمارا مستقبل بس اسی میں ہے کہ محبوب زندہ رہے' سلامت رہے۔ ہماری سرپرستی میں رہے اور شبانہ ہمارے اشاروں پر ناچتی رہے یا پھر دونوں کی شادی کبھی نہ ہونے پائے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ شادی تو ضرور ہوگی۔ اگر ہم نے زیادہ عرصہ تک شادی کو ٹالنے کی کوشش کی۔ بہانے کرتے رہے تو حمید اللہ چوہدری اور وہ وکیل حشمت بیگ ہمیں قانونی طور پر نوٹس دیتے رہیں گے اور شادی پر مجبور کریں گے۔ ہم نے اگر اس نوٹس پر عمل نہ کیا تو پھر وہ اس وصیت کو بدلنے کے مجاز ہوں گے اور کسی دوسری لڑکی سے اس کی شادی کردیں گے۔ باہر کی لڑکی بہو بن کر آئے گی تو وہ ہمارے لئے ایک کھلا چیلنج ہوگی۔ ہمیں یہاں ٹکنے نہیں دے گی۔"

دونوں باپ بیٹے بہت دیر تک غور کرتے رہے۔ پھر اعظم نے کہا۔ "ایک تدبیر ہے۔ ایک ڈاکٹر سے میری گہری دوستی ہے۔ وہ اچھی خاصی رقم لے کر ڈاکٹری اصولوں کے خلاف دوائیں دیتا ہے۔ اگر میں اس سے کوئی ایسی دوا لوں جس سے دماغ کو کمزور بنایا جاسکتا ہے تو ہم شبانہ کو بھی محبوب کی طرح کند ذہن بنالیں گے۔ وہ ہمیشہ کے لئے بے ضرر ہوجائے گی۔ ان کی شادی سے پھر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اپنے اچھے مستقبل کی سلامتی کے لئے دیکھا جائے تو اس کے سوا کوئی اور راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے اب ہم اپنی اولاد کو مار نہیں سکتے لیکن اسے کمزور بنا کر اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ میں ابھی اس مسئلے پر غور کروں گا پھر کوئی فیصلہ کن جواب دوں گا۔"

اعظم نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر پہاڑی علاقے میں گرمیاں گزارنے گیا ہے۔ کیوں نہ ہم بھی وہاں چلیں۔ اچھی خاصی تفریح بھی ہوجائے گی۔ اس عرصے میں آپ کوئی فیصلہ بھی کرلیں گے اور میں ڈاکٹر سے کوئی ایسی دوا بھی حاصل کرلوں گا۔"

دوسرے دن پہاڑی علاقے سری پور جانے کا فیصلہ ہوگیا۔ وہ بذریعہ طیارہ وہاں پہنچے۔ ایک کاٹیج کرائے پر لیا۔ رجب علی نے کئی بار سوچا کہ شبانہ کے سلسلے میں اپنی بیوی سے مشورہ لے پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ ایک ماں کبھی اپنی بیٹی کے دماغ کو کمزور بنانے کی تائید نہیں کرے گی بلکہ مخالفت کرے گی۔ اِدھر اعظم نے بھی کچھ اسی طرح سوچا' وہ اپنی بیوی کو بتانا چاہتا تھا۔ اپنا راز دار بنانا چاہتا تھا پھر دماغ نے سمجھایا کہ ایسے معاملات میں عورت کو رازدار نہیں بنانا چاہئے۔ ایک دن یہی بیوی طعنے دے گی کہ دولت کی خاطر اپنی بہن کے دماغ کو کمزور بنادیا۔ یہ سوچ کر اس نے بھی ارادہ ترک کردیا۔ چپ چاپ ڈاکٹر سے ملنے کے لئے چلا گیا۔

جب وہ دو گھنٹے کے بعد واپس آیا تو کاٹیج میں اس کے ڈیڈی اور ممی بہت پریشان تھے۔ پتا چلا کہ شبانہ صبح سے کاٹیج میں نہیں ہے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ محبوب کے ساتھ کہیں کھیل رہی ہوگی۔ محبوب سے پوچھنے پر پتا چلا کہ اس نے بھی اسے صبح سے نہیں دیکھا ہے۔ اعظم نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا۔ "فیروزہ کہاں ہے؟"

اس کی ممی نے کہا۔ "میں کیا بتاؤں۔ وہ تو صبح سے نکلی ہے۔ کہہ کر گئی تھی کہ شاپنگ کے لئے جارہی ہے۔ دیر سے واپس آئے گی۔"

یہ سنتے ہی اعظم نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے باپ نے کہا۔ "بیٹے' مجھے یہی خیال آرہا ہے' کہیں ہماری بہو نے کوئی غلط قدم نہ اٹھایا ہو۔ کہیں اسی نے شبانہ کو........."

اعظم کچھ سننے سے پہلے ہی وہاں سے پلٹ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا کاٹیج کے احاطے سے باہر جانے لگا۔ باہر محبوب ایک گلہری کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اعظم نے اسے آواز دی۔ "محبوب سنو! کیا تمہیں شبانہ سے محبت نہیں ہے۔ وہ تمہاری بہت اچھی دوست ہے اور وہ کہیں گم ہوگئی ہے۔"

محبوب نے پلٹ کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے ناراض ہوکر چلی گئی ہے اور........."

اعظم نے غصے سے کہا۔ "احمق' وہ ناراض ہوکر نہیں گئی ہے بلکہ تمہاری بھابی نے اسے کہیں غائب کر دیا ہے۔ وہ اس کی دشمن ہے' وہ تمہاری شبانہ کو جان سے مار دے گی۔ چلو' اپنی بھابی کو تلاش کروں۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے بازار میں پہنچے۔ سری پور کا بازار بہت چھوٹا تھا۔ دولت مند خواتین کے لئے دو چار بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ وہاں دیکھ لینے کے بعد وہ جھیل کی طرف جانے لگے۔ جھیل وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ اعظم کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ فیروزہ کہیں اپنے بھائی اور اس کے غنڈوں کے ذریعے شبانہ کو جھیل میں لے جاکر ڈبو نہ دے۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے ہی فیروزہ بہت دور نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی اعظم رک گیا۔ اس نے محبوب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "محبوب' تم شبانہ کو کتنا چاہتے ہو؟"

"میں بہت چاہتا ہوں۔ وہ بہت اچھی دوست ہے۔ اس کے ساتھ کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

اعظم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ان دنوں محبوب پندرہ برس کا تھا لیکن قد ل اعظم کے برابر تھا۔ ڈیل ڈول میں بھی بھاری تھا۔ اچھی صحت تھی۔ مضبوط ہاتھ پاؤں تھے۔ بس ایک کھوپڑی خالی تھی۔ اعظم نے اسے غور سے دیکھنے کے بعد چند لمحوں تک کچھ سوچا پھر جھک کر اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے دونوں ہاتھ نکال کر دونوں کان پکڑ لئے۔ مرغا بن گیا۔

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ "بھائی جان' یہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

اعظم نے کہا۔ "میں مرغا بن گیا ہوں۔ مرغا بننے سے عقل بڑھتی ہے اور معلوم جاتا ہے کہ ہمارا دشمن کون ہے۔"

محبوب نے پوچھا۔ "ہمارا دشمن کون ہے؟"

"تمہاری بھابی۔ تمہاری بھابی شبانہ کو لے کر کہیں گئی ہے۔ اسے مار ڈالا اور اس کی لاش کو کہیں چھپا دیا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی بھابی کو مار ڈالوں گا۔ بہت زور سے ماروں گا۔"

"احمق کہیں کے۔ بہت زور سے مارنے سے کوئی نہیں مرتا۔ اس کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔"

"اچھا سمجھ گیا۔ گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔"

"دونوں ہاتھوں سے۔"

"ہاں دونوں ہاتھوں سے۔"

"احمق کہیں کے۔ پھر سوچتے کیا ہو۔ وہ ادھر تمہاری بھابی نظر آ رہی ہے۔ جاؤ اور اس سے پوچھو کہ شبانہ کو کہاں چھپایا ہے۔ وہ جواب دینے سے انکار کرے تو اسے ختم کر دینا۔"

اس کا حکم سنتے ہی وہ تعمیل کے لئے دوڑتا ہوا فیروزہ کی طرف جانے لگا۔ اعظم مرغے سے انسان بن گیا۔ وہ ایک درخت کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور تماشا دیکھنے لگا۔

اُدھر فیروزہ نے محبوب کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پوچھا۔ "محبوب کہاں سے آ رہے ہو۔ اکیلے ہو؟"

"ہاں' اکیلا ہوں اور تمہیں جان سے مار ڈالنے کے لئے آیا ہوں۔"

فیروزہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں' تم مجھے کیوں مارو گے؟"

"تم نے میری شبانہ کو مار ڈالا ہے۔ بتاؤ' اسے کہاں چھپایا ہے؟"

فیروزہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں.......... میں نے اسے کہیں نہیں چھپایا ہے۔ تم سے کسی نے غلط کہا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی محبوب نے ایک زور کا طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی۔ سمجھ گئی کہ اس خر دماغ سے بحث کرنا فضول ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا ہو گا۔ محبوب پھر قریب آنے لگا تو اس نے ایک دم سے چونک کر اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے' یہ تو شبانہ آ گئی۔"

محبوب نے فوراً ہی اُدھر پلٹ کر دیکھا۔ اسی وقت فیروزہ نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ دونوں اونچائی پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا گرا تو ڈھلان کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

اعظم نے درخت کے پیچھے سے دیکھا۔ فیروزہ اسے دھکا دینے کے بعد ایک طرف بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اعظم بھی اسی طرف دوڑنے لگا۔ وہ کبھی دوڑ رہی تھی' کبھی تیزی سے چل رہی تھی۔ آخر ایک جگہ تھک کر جھاڑی کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ اسی وقت قدموں کی دھمک سنائی دی۔ وہ پھر چیخ کر بھاگنا چاہتی تھی کہ اعظم کو دیکھتے ہی رک گئی۔ اس نے کہا۔ "اعظم' وہ پاگل کا بچہ میرا دشمن ہو گیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے شبانہ کو مار ڈالا ہے۔ مجھے اس پاگل سے بچاؤ۔"

اعظم آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ پھر اس کے دوپٹے کے ایک سرے کو تھام کر بولا۔ "اس سرد علاقے میں تم دوڑتے دوڑتے کس طرح پسینے میں نہا رہی ہو۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ اس کے چہرے سے اور گردن سے پسینہ خشک کرنے لگا۔ "شبانہ صبح سے غائب ہے۔ کاٹیج کے آس پاس ہم نے دیکھ لیا۔ بازار میں بھی ڈھونڈ لیا۔ یقیناً تم اس کا پتا مجھے بتاؤ گی۔"

"اعظم! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں شبانہ کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئی؟"

"شبانہ ہم سب کی سگی بھی ہے اور دشمن بھی۔ ایسی دشمن جسے ہم ہلاک نہیں کر سکتے لیکن تم بھابی ہو۔ اپنے مفاد کی خاطر اس کی جان بھی لے سکتی ہو۔"

اچانک فیروزہ کو احساس ہوا کہ وہ باتوں ہی باتوں میں اس کے دوپٹے کو اس کی گردن کے اطراف لپیٹ رہا ہے۔ وہ چونک کر بولی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ دوپٹے کو کس طرح لپیٹ دیا ہے؟"

اعظم نے دوسرے ہی لمحے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر کہا۔ "ہاں! تو بتاؤ' شبانہ کہاں ہے؟"

گردن پر انگلیوں کا دباؤ بڑھنے لگا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں کہنے لگی۔ "مم.........."

میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔"

"دیکھو فیروزہ، تم کچھ جانو یا نہ جانو۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ تم زندگی کے کسی بھی مرحلے پر مجھے طعنے دے سکتی ہو کہ میں نے ہی اپنی بہن کو غائب کیا ہے یا پھر اس کے غائب ہونے پر ایک بھائی کی محبت اور غیرت کے ساتھ اسے تلاش نہیں کیا۔ تمہیں اس لئے بھی مرنا چاہئے کہ تم اب پرانی ہو چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میری بہن مجھے نہیں ملے گی۔ اس کی جگہ کوئی دوسری، بہن نہیں بن سکتی، لیکن کوئی دوسری بیوی تو آسکتی ہے۔"

فیروزہ کی سانس رک رہی تھی۔ تکلیف بڑھ رہی تھی۔ دیدے پھیل رہے تھے۔ اعظم نے کہا۔ "میں دو شرائط پر تمہیں زندہ چھوڑ سکتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ شبانہ کو جن کے حوالے کیا ہے۔ ان کا پتا بتا دو، دوسرے یہ کہ تم میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ۔ خود ہی طلاق لے لو۔"

فیروزہ نے بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "مم......... میں بتاتی ہوں۔"

اعظم نے اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ وہ گہری سانس لینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "نہیں، تمہیں اس وقت جتنی سانس میسر آرہی ہے، اس کا سہارا لے کر بتاؤ، شبانہ کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اسے غائب کرنے کے لئے اپنے بھائی کو یہاں بلایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ یہاں سے آسانی سے شبانہ کو غائب کیا جاسکے گا لیکن میرا منصوبہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں یہاں اپنے بھائی کو تلاش کرنے آئی تھی۔ شبانہ کہاں چلی گئی۔ یہ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔"

اعظم نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے بھائی کو بلایا، شبانہ غائب ہوگئی اور ڈھیٹ بن کر قسم کھا رہی ہو کہ تم اس سلسلے میں معصوم ہو، مکار عورت تمہیں مرجانا چاہئے۔"

☆======☆======☆

محبوب، ڈھلان سے لڑھکتا ہوا جب نیچے پہنچا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر بلندی کی طرف غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ خوب زور سے ماروں گا۔ نہیں، زور سے نہیں ماروں گا۔ بھائی جان کہتے ہیں گلا گھونٹنے سے تم مرو گی۔ میں گلا گھونٹ دوں گا دونوں ہاتھوں سے۔ ہاں، دونوں ہاتھوں سے۔" وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا، بلندی کی طرف دوڑتا ہوا جانے لگا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فیروزہ بلندی پر نہیں تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ بھٹکنے کے دوران اس کی نظر اپنے اعظم بھائی جان پر گئی۔ اس کا بھائی جان اسی طرح درخت کے پاس مرغا بنا ہوا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں گیا۔ اعظم نے پوچھا۔ "میں ابھی تک مرغا بنا ہوا دانشمندی کی باتیں سوچ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم فیروزہ کو نہیں پکڑ سکے۔ وہ چھپ گئی ہے۔ اُدھر دیکھو! جہاں دو جھاڑیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ وہیں وہ چھپی ہوئی ہے اور آرام سے سو رہی ہے۔ فوراً جاؤ ورنہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے گی۔"

وہ پلٹ کر دوڑتا ہوا ان جھاڑیوں کی طرف جانے لگا۔ جب وہ دور نکل گیا تو اعظم مرغے سے انسان بن گیا۔ اس نے چند لمحوں تک اسے دیکھا پھر وہاں سے پلٹ کر بھاگتا ہوا کاٹیج میں آیا۔ وہاں اس کے ڈیڈی اور ممی اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا شبانہ ملی؟"

"نہیں، امی۔ شبانہ تو نہیں ملی ہے۔ ہم ابھی تھانے میں رپورٹ لکھائیں گے لیکن کچھ اور ہوگیا ہے۔"

وہ فیروزہ کے متعلق بتانے لگا۔ اس کے ماں باپ حیرانی سے منہ کھولے سن رہے تھے پھر باپ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ تم نے کیا کیا۔ اسے ہلاک کیوں کر دیا؟"

"ڈیڈی' وہ بہت ہی ڈھیٹ ہے۔ کبھی اقرار نہیں کرے گی اور نہ ہی بتائے گی ک شبانہ کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ اس لئے میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ یوں بھی امی کو بھو پس نہیں تھی اور وہ میرے لئے بھی ناقابل برداشت بوجھ بن گئی تھی۔ میں نے اسے را سے ہٹا دیا۔"

اس کی ممی نے کہا۔ "جہنم میں گئی فیروزہ' میری بیٹی کا کیا ہوگا؟"

"ممی! وہ مل جائے گی آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم ابھی جاکر رپورٹ درج کرا ہیں۔"

وہ اپنے باپ کے ساتھ اٹھ گیا۔ وہاں سے تھانے کی طرف جانے لگا۔

راستے میں رجب علی نے کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا۔ اس احمق کو فیروزہ کی لاش کے پاس کیوں بھیج دیا؟"

"ڈیڈی' میں نے خوب سوچ سمجھ کر ایسا کیا۔ اب وہ الٹے سیدھے بیان دے گا پولیس الجھ جائے گی اور مجھ تک نہیں پہنچ سکے گی۔ فیروزہ کے متعلق ہم بیان دیں گے ک وہ زیورات پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بدن پر اب زیورات نہیں ہیں۔ یہ خیال قائم ک جائے گا کہ کسی نے ان زیورات کی خاطر اسے ہلاک کیا ہے۔ پھر محبوب کا احمقانہ بیا پولیس والوں کو الجھائے گا۔"

رجب علی نے کہا۔ "مگر محبوب حراست میں لے لیا جائے گا' جیل بھیج دیا جائے گا مقدمہ چلے گا۔"

"ڈیڈی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مقدمے کے اخراجات کتنے ہوتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں۔ ہم بڑھا چڑھا کر اس کا بل بنائیں گے۔ ساری رقم ہمارے ہاتھ آئے گی۔ ہم بہت مہنگے اور تجربہ کار وکیل کی خدمات حاصل کریں گے۔ محبوب کے احمقانہ بیانات کے مطابق اسے سزا نہیں ہوسکتی پھر یہ کہ ہمارے پاس اس کی بچپن سے لے کر اب تک کی ڈاکٹری رپورٹ موجود ہے۔ وہ دماغی طور پر کمزور ہے لیکن پاگل نہیں ہے۔ کسی کو کو جانی نقصان نہیں پہنچاتا ہے۔ ہمارے دوست' احباب' رشتہ دار' محلے' پڑوس کے لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ نہایت ہی معصوم سا لڑکا ہے اور بچوں جیسی زندگی گزار

ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے شبانہ اور محبوب کی گمشدگی کی رپورٹ لکھائی۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "آپ کو کسی پر شبہ ہے؟"

اعظم نے کہا۔ "ہمیں کسی پر شبہ نہیں ہے۔ میری بیوی فیروزہ صبح یہ کہہ کر گئی ہے کہ شاپنگ کے لئے جا رہی ہے۔ دیر سے واپس آئے گی۔ گھر کے باقی تمام افراد پریشان ہیں۔ فیروزہ کو ابھی اس گمشدگی کی خبر نہیں ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ نے بیان میں لکھوایا ہے کہ محبوب سولہ برس کا جوان لڑکا ہے' پھر تو وہ اچھا خاصا سمجھدار ہوگا اپنی گیارہ برس کی بہن کو کہیں گھمانے پھرانے لے گیا ہوگا۔"

رجب علی نے کہا۔ "جناب! آپ نہیں جانتے۔ محبوب بالکل ہی احمق لڑکا ہے۔ بچپن سے اس کی میڈیکل رپورٹ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کا نفسیاتی طور پر بھی علاج ہوتا رہتا ہے۔ بظاہر وہ مکمل نوجوان نظر آتا ہے لیکن ذہنی طور پر بالکل بچہ ہے۔"

اعظم نے کہا۔ "وہ ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ایسی باتیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے لیکن اس بات پر یقین نہیں آتا۔ پھر یہ کہ اس کی یادداشت کمزور ہے۔ جو بات گزر جاتی ہے اسے جلدی بھول جاتا ہے۔"

اسی وقت پولیس اسٹیشن کے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ ایک سپاہی نے آکر کہا۔ "جناب' کچھ لوگ ایک قاتل کو پکڑ کر لائے ہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک عورت کا گلا گھونٹ کر اسے مار رہا تھا۔"

یہ سنتے ہی اعظم چونک گیا لیکن اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا تاکہ اس کے چہرے سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہو۔

انسپکٹر نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ عورت مرچکی ہے؟"

"جی ہاں' وہ لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔"

"لاش کہاں ہے؟"

"وہیں ایک جھاڑی کے پیچھے ہے۔ اس لاش کے پاس کچھ لوگ نگرانی کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

انسپکٹر تیزی سے چلتا ہوا پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں آیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے محبوب کو پکڑ رکھا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "تم نے کیوں قتل کیا ہے؟"

"میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مارا ہے۔"

"ہاں' ہاں' اسی کو قتل کرنا کہتے ہیں۔ وہ عورت کون تھی؟"

"وہ میری بھابی تھی۔ میری چچا زاد بہن شبانہ کو اس نے مار ڈالا ہے۔"

"شبانہ؟" انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے اندر دفتر کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو ایک شبانہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے بلکہ شبانہ اور اس کے ساتھ ایک سولہ برس کا جوان لڑکا ہے۔ اس کا نام.......... ہاں' یاد آیا محبوب ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "میرا نام محبوب ہے اور شبانہ میری دوست ہے۔"

"اچھا' اس عورت کا نام کیا ہے جسے تم نے قتل کیا ہے؟"

"اس کا نام بھابی ہے۔"

"یہ نام نہیں رشتہ ہے۔ نام بتاؤ۔"

محبوب سوچنے لگا۔ وہ گھر میں کئی بار فیروزہ کا نام سن چکا تھا مگر اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا اس کا نام فیروزہ ہے؟"

محبوب نے چونک کر کہا۔ "ہاں' ہاں' آپ تو بہت کچھ جانتے ہیں۔ میری بھابی کا نام فیروزہ ہے۔"

اتنے میں اعظم اور رجب علی دفتری کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے۔ محبوب نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "ارے بھائی جان' چاچا جان' آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو وہاں تلاش کر رہا تھا۔"

"اعظم نے پوچھا۔ "کسے تلاش کر رہے تھے؟"

"بھائی جان' آپ کو۔ آپ وہاں مرغا بنے ہوئے تھے۔"

اعظم نے مسکرا کر انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "سن لیجئے' کیوں محبوب! کیا میں مرغا نظر آ رہا تھا؟"

"نہیں نہیں' وہ مرغا نہیں' ایسا والا مرغا۔" اس نے جھک کر دونوں ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر اپنے کان پکڑ لئے' پھر کہا۔ "وہ ایسے مرغا بنے ہوئے تھے۔"

انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "سیدھی طرح کھڑے ہو جاؤ۔ کیا تم پاگل ہو؟"

اعظم نے آگے بڑھ کر کہا۔ "نہیں انسپکٹر صاحب' ہم پہلے بتا چکے ہیں یہ پاگل نہیں' اس کے اندر بچپنا ہے۔ اس کا ذہن بہت کمزور ہے۔"

رجب علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "انسپکٹر صاحب! ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ محبوب کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ آج تک اس نے ایک چیونٹی کو نہیں مارا ہے۔ یہ پتا نہیں کیوں ایسی باتیں کر رہا ہے۔ ذرا اس سے پوچھئے کہ اس نے میری بہو پر کس طرح حملہ کیا تھا؟"

محبوب نے کہا۔ "چاچا جی! میں کیا حملہ کروں گا۔ بھابی نے خود ہی مجھ پر حملہ کیا۔ مجھے بڑی زور سے دھکا دیا۔ میں نیچے لڑھکتا چلا گیا اور وہ بھاگ گئیں۔ پھر میں انہیں تلاش کرتے ہوئے بھائی جان کے پاس آیا۔ یہ مرغا بنے ہوئے تھے۔"

انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "پھر وہی مرغا' سیدھی طرح بات کرو۔ پھر کیا ہوا؟"

اعظم نے جلدی سے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یعنی پھر تم اس کے پیچھے پہنچ گئے؟"

محبوب نے کہا۔ "ہاں' میں وہاں پہنچا تو بھابی مجھے دھکا دے کر وہاں آرام سے سو رہی تھیں۔"

انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا۔ "سو رہی تھیں؟"

"ہاں' میں نے جا کر کہا۔ مجھ سے چھپنے کی کوشش نہ کرو۔ تم جاگ رہی ہو۔ جواب دو۔ میری شبانہ کہاں ہے مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے قریب پہنچ کر جھنجھوڑا۔ ایک طمانچہ بھی مارا مگر انہوں نے آنکھ نہیں کھولی۔ تب میں نے غصے میں آ کر ان کا گلا گھونٹ دیا۔"

رجب علی نے کہا۔ "دیکھئے انسپکٹر صاحب! ذرا اس کے بیان پر غور کیجئے۔ میری بہو پہلے سے مرچکی تھی۔ وہ سو نہیں رہی تھی۔ یہ احمق سمجھ رہا ہے کہ.........."

انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس آپ لوگ خاموش رہیں۔ میں سمجھ لوں گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس لڑکے کو حوالات میں بند کرو اور آپ دونوں میں سے کوئی ایک میرے ساتھ چلے تاکہ لاش کی شناخت ہو سکے۔"

اعظم نے کہا۔ "میری بیوی کا معاملہ ہے اس لئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں' ڈیڈی یہیں رہیں گے۔"

وہ انسپکٹر اور چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ دو سپاہی محبوب کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے لے جانے لگے محبوب نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ "چاچا جی' یہ لوگ مجھے پکڑ کرلے جارہے ہیں' مجھے بچایئے۔"

رجب علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "بیٹے' ایک تو تم احمقانہ باتیں کرتے ہو۔ تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ تم ایسا مت کہو۔"

"وہ کیوں نہ کہوں۔ میں نے ایسا کیا ہے۔"

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ایک سپاہی نے رجب علی کے پاس آکر کہا۔ "بڑے میاں! کسی ملزم سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ وہاں دفتر میں جاکر بیٹھیں۔"

رجب علی نے جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکالا پھر ایک سگریٹ اپنے منہ میں دباتے ہوئے پیکٹ سپاہی کی طرف بڑھا دیا۔ سپاہی نے مسکرا کر پیکٹ کو ہاتھ میں لیا۔ ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پیکٹ واپس کرنے لگا۔ رجب علی نے کہا۔ "میں زیادہ سگریٹ نہیں پیتا ہوں۔ آپ یہ پیکٹ رکھ لیجئے۔"

سپاہی نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

رجب علی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس کی ڈبیہ اس طرح نکالی کہ ڈبیہ کے ساتھ سو کا ایک نوٹ بھی نکل آیا۔ سپاہی نے ڈبیہ کے ساتھ اسے بھی لے لیا۔ نوٹ کو جیب میں رکھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ رجب علی نے کہا۔ "ملزم میرا بھتیجا ہے۔ میں ذرا اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

سپاہی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ پھر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "وہاں دو سپاہی اور ہیں۔"

رجب علی نے جیب سے پھر سو کا ایک نوٹ اور نکال کر کہا۔ "انہیں آپ پچاس پچاس دے دیں۔"

"اچھا' آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ حوالات کی طرف گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ رجب علی کو محبوب سے ملنے کی اجازت مل گئی۔ وہ آہنی سلاخوں کے پاس پہنچا تو سپاہی وہاں سے دور چلے گئے۔ رجب علی نے پوچھا۔ "بیٹے! مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا اور تم نے کیا کیا؟"

محبوب بتانے لگا۔ رجب علی اس کی باتوں کے دوران اسے ٹوکنے لگا۔ سمجھانے لگا کہ اسے کون سی بات کہنا چاہئے اور کون سی بات نہیں کہنا چاہئے بلکہ اسے اب یہی کہنا چاہئے کہ اسی نے اپنی بھابی کا گلا گھونٹ کر اسے مارا ہے۔ اگر وہ اس بیان پر قائم رہے گا تو اسے احمق ثابت کرکے بچا لیا جائے گا' پھر اس نے محبوب سے پوچھا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ پولیس والے تمہارے بھائی جان کو پھانسی پر چڑھا دیں؟"

محبوب نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں نہیں' میرے بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ جو ان کو پھانسی پر چڑھائے گا میں اس کا بھی گلا دبا دوں گا۔"

"تمہارے گلا دبانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے بھائی جان تو مرجائیں گے نا' اس لئے جو سمجھاتا ہوں اس پر عمل کرو۔ پولیس والوں سے یہ نہ کہو کہ بھائی جان نے تمہیں بھابی کا گلا گھونٹنے کے لئے کہا تھا۔"

"اچھا' میں یہ نہیں کہوں گا۔"

"تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم پھر بھول جاؤ گے۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھو۔ یہ کبھی نہ کہنا کہ تمہارے بھائی جان نے ایسا کہا تھا۔"

"میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں کبھی ایسا نہیں کہوں گا۔"

"ہاں' یہ ضرور کہنا کہ تمہارے بھائی جان وہاں مرغا بنے ہوئے تھے۔"

"اچھی بات ہے یہ کہوں گا۔"

رجب علی جو سمجھا رہا تھا' وہ سمجھ رہا تھا۔ جو سکھا رہا تھا وہ سیکھ رہا تھا۔ بچپن سے وہ رجب علی اور اس کی بیوی یعنی اپنی چچی کے زیر سایہ رہا تھا۔ ان سے متاثر ہوتا رہا تھا اور ان کی ہر بات مان لیتا تھا کیونکہ وہ لوگ بہت اچھے تھے اور اس کو ضد کرنا سکھایا کرتے تھے اور اس کی وہ ضد پوری ہوجایا کرتی تھی۔

قتل کا وہ کیس تھانے سے عدالت پہنچ گیا اور محبوب تھانے سے لے کر عدالت تک ایک دلچسپ تماشا بنا گیا۔ پولیس سے لے کر وکیل' سرکاری وکیل اور جج صاحبان اس کے بیانات سنتے تھے اور زیر لب مسکراتے تھے۔ حمید اللہ چوہدری اور وکیل حشمت بیگ' رجب علی' اعظم سبھی نے محبوب کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اہم ثبوت پیش کئے۔ بڑے بڑے دماغی امراض کے ڈاکٹروں کی رپورٹیں بھی پیش کی گئیں۔ عدالت کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ ملزم محبوب کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ دماغی امراض کے ماہرین کی مزید رپورٹیں حاصل کی جائیں اور نفسیاتی طریقۂ کار کے مطابق محبوب کے متعلق اس بات کی تصدیق کی جائے کہ واقعی وہ احمق ہے یا بن رہا ہے۔

دماغی امراض کے ماہرین اور ماہر نفسیات نے جو رپورٹ پیش کی' اس کا خلاصہ یہ تھا کہ محبوب واقعی معصوم اور بچگانہ ذہن کا مالک ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ انسان کے جسم کے ساتھ اس کی دماغی صلاحیت بھی بڑھتی جائے۔ کتنے ہی لوگ دبلے پتلے اور کمزور ہوتے ہیں لیکن بے حد عقلمند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قد آور' شہ زور لوگ کم عقل ہوتے ہیں۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ دماغی صلاحیت کا جسمانی نشوونما سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ انسان کی عمر سے ہے۔ جیسے جیسے عمر گزرتی ہے' اپنے ماحول کے مطابق آس پاس کے لوگوں کی عقل' فراست اور ان کے عمل اور ردعمل سے ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات کی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ محبوب اگرچہ بچگانہ ذہن کا مالک ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بچوں کی طرح بالکل سچا ہے اور مکر و فریب کو نہیں جانتا ہے۔ جو بولتا ہے سچ بولتا ہے۔ اس نے یقیناً سچ کہا ہے کہ اس نے اس خاتون کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے گلا گھونٹنے سے

پہلے ہی کسی نے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ محبوب کا بیان غور طلب ہے کہ مقتولہ واردات کے وقت سوتی رہی۔ گلا گھونٹنے کے دوران بھی اس نے اپنے بچاؤ کے لئے جدوجہد نہیں کی۔ وہ یقیناً پہلے ہی مرچکی تھی۔

آخر کار محبوب کو قتل کے الزام سے بری کر دیا گیا۔ اعظم پر شبہ کیا جاسکتا تھا لیکن کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ پھر اپنی بیوی کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ بھی ثابت نہ ہوسکا کہ بیوی سے کسی بات پر اختلاف تھا یا دشمنی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ صرف یہ رائے قائم کر لینا کہ چھوٹی بہن کے گم ہوجانے کے باعث اعظم نے مشتعل ہو کر اپنی بیوی کو ہلاک کیا ہوگا۔ قابلِ قبول نہ تھا۔ اگر یہ قابل قبول ہوتا' تب بھی اعظم کو قاتل ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بالآخر یہی رائے قائم کی گئی کہ مقتولہ فیروزہ قیمتی زیورات پہنے ہوئے تھی' ان زیورات کو حاصل کرنے کے لئے کسی نے اس کو قتل کیا۔ زیورات لئے اور غائب ہوگیا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے درخواست کی گئی کہ ایسے کسی گمنام قاتل کو تلاش کیا جائے۔

محبوب رہا ہو کر آگیا۔ پھر اپنے بچگانہ طرز پر زندگی گزارنے لگا۔

اعظم کی ماں نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔ "کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ میری بچی چلی گئی۔ کسی کو اس کی فکر نہیں ہے۔ کوئی اسے تلاش نہیں کرتا۔"

رجب علی اور اعظم نے سمجھایا کہ اسے جگہ جگہ تلاش کیا گیا ہے۔ ملک کے تمام پولیس اسٹیشنوں میں اس کی تصویریں پہنچائی گئی ہیں۔ پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں۔

اس کی ممی نے کہا۔ "کیا خاک تلاش کر رہے ہو۔ مقدمہ ایک سال تک چلتا رہا۔ ایک طرف یہ اندیشہ تھا کہ محبوب کو سزائے موت یا عمر قید نہ ہوجائے۔ ہماری آمدنی ماری جائے گی۔ دوسری طرف بیٹی کی فکر تھی۔ محبوب تو رہا ہو کر آگیا۔ بیٹی اب نہ جانے کب ملے گی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہے' زندہ بھی ہے یا............؟" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ روتے روتے زیر لب بڑبڑانے لگی۔ "میں نے کسی ماں کی کوکھ اجاڑنے کی فکر کی تھی۔ محبوب کو ذہنی طور پر برباد کر دیا۔ اس کی سزا مجھے قدرتی طور پر مل رہی ہے۔" وہ روتی رہی اندر ہی

اندر گھلتی رہی۔ آخر ایک ماں تھی۔ بڑی منتوں' مرادوں کے بعد ایک بیٹی کی آرزو پوری ہوئی تھی۔ گیارہ برس تک اسے پھول کی طرح اپنی آغوش کے گلدان میں سجا کر رکھا تھا۔ اسے خوب پیار کیا تھا۔ بڑے ارمان نکالے تھے۔ اب وہی ارمان وہی پیار اسے تڑپا رہا تھا۔ آخر دو برس تک اس کا انتظار کرتے کرتے اس کی یاد میں تڑپتے تڑپتے وہ ممتا کی ماری مرگئی۔

مرنے والی مرگئی۔ دنیا میں اسے جو کرنا تھا کر گئی۔ کاش وہ اپنی قبر سے جھانک کر دیکھتی۔ جس سے دشمنی کی تھی' جسے وہ بچپن میں افیون دیا کرتی تھی' جسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ وہی لڑکا' وہی محبوب اس کی یاد میں روتا تھا۔ اسے تلاش کرتا تھا۔ ضد کرتا تھا کہ میری چچی جان کو بلا کر لاؤ۔ وہ نفرت اور دشمنی کو نہیں سمجھتا تھا۔ صرف اس محبت کو جانتا تھا جو بچپن سے ملتی رہی تھی۔ وہ چچی اس کی ماں سے زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ ماں کو تو اس نے کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا اور نہ ہی اسے کبھی یاد کرایا گیا تھا۔

اعظم نے دوسری شادی کرلی کیونکہ گھر میں تین مرد رہ گئے تھے۔ رجب علی' اعظم اور محبوب' کوئی عورت نہیں تھی۔ گھر سنبھالنے کے لئے عورت لازمی ہوتی ہے۔ بہرحال گھر میں پھر ایک بہو آگئی۔

محبوب پچیس برس کا کڑیل جوان ہوگیا تھا۔ ایسا قد آور ایسا خوبرو' ایسا چوڑا سینہ اور بھرے بھرے بازو اور مضبوط پنجے تھے کہ کیا مرد اور کیا عورت سبھی اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے تھے۔ عورتیں تو دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی تھیں کیونکہ وہ چھوٹے بچوں سے دوستی کرتا تھا۔ عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔

اب اس نے عمر کے ساتھ ساتھ نئے مشغلے اپنا لئے تھے۔ رجب علی نے اسے چھوٹا سا پروجیکٹر لا کر دیا تھا۔ وہ اپنے بند کمرے میں کبھی کارٹون فلمیں دیکھتا تھا اور کبھی ایسی ہی پریوں کے دیس والی فلمیں دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ پھر اس نے پوچھا یہ فلمیں کیسے تیار ہوتی ہیں' رجب علی نے اسے ایک چھوٹا سا مووی کیمرہ لا کر دیا۔ اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی تصویریں اتاریں۔ اسے پروجیکٹر میں چلا کر دکھایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد وہ کیمرہ لے کر جگہ جگہ گھومنے لگا جہاں اس کا دل چاہتا تھا۔ وہاں کے نظاروں کو متحرک فلموں میں

ریکارڈ کرلیتا تھا پھر ان کی ڈویلپنگ اور پرنٹنگ کے بعد اپنے پروجیکٹر کے ذریعے دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

وہ چونکہ بچوں سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا اس لئے جہاں بھی بچے نظر آتے تھے' دوستی کرلیتا تھا۔ ان کی تصویریں اتارتا تھا پھر انہیں اپنے گھر میں بلا کر انہیں پروجیکٹر کے ذریعے وہ تصویریں دکھاتا تھا' اس طرح اس کے دوستوں کا حلقہ بڑھتا جارہا تھا اور اس حلقے میں صرف بچے ہی بچے تھے۔

ایک روز شام کے وقت وہ شانے سے کیمرہ لٹکائے ایک مکان کے قریب سے گزر رہا تھا تب ایک چھوٹی سی لڑکی نے اسے آواز دی۔ "اے کیمرے والے' ادھر دیکھو۔"

اس نے ادھر دیکھا۔ ایک سات آٹھ برس کی لڑکی گڑیا جیسی فراک پہنے ایک لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "دیکھو اس ریلنگ میں یہ دائرے بنے ہوئے ہیں۔ میں ان دائروں میں پاؤں رکھتے ہوئے اس ریلنگ سے اِدھر اُدھر جاسکتی ہوں۔ یہ کمال دکھاؤں گی تو کیا تم میری تصویر اتارو گے؟"

محبوب نے خوش ہوکر کہا۔ "ہاں' ضرور اتاروں گا چلو' تم یہاں سے وہاں تک چل کر دکھاؤ۔"

وہ لڑکی ریلنگ پر چڑھ گئی۔ پھر اس ریلنگ میں بنے ہوئے دائروں کے اندر ایک ایک پاؤں سنبھل سنبھل کر رکھنے لگی اور اس ریلنگ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے لگی۔ محبوب کیمرہ اپنی ایک آنکھ سے لگائے اسے آن کئے اس کی متحرک فلم تیار کررہا تھا۔

ریلنگ کے دوسرے سرے پر برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد کمرے کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ لڑکی ادھر پہنچتے ہی دوڑتے ہوئے کمرے کے دروازے سے اندر گئی۔ پھر نظر نہیں آئی۔ محبوب نے کیمرے کو آف کرکے ادھر دیکھا۔ پھر اسے آواز دی۔ "اے! تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ پھر اس نے آواز دی۔ اسے جواب نہیں ملا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر اندر جھانکنے لگا۔ وہ کمرہ بڑی

خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ ایک آرام دہ بستر پر ایک بہت ہی خوبصورت نوجوان عور
لیٹی ہوئی تھی۔ "وہ لڑکی کہاں گئی ہے؟"

"وہ آجائے گی تم یہاں آکر بیٹھو!"

"میں نہیں بیٹھوں گا۔ مجھے بتاؤ میری دوست کہاں گئی ہے؟"

وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں بھی تمہاری دوس
ہوں۔ مجھے دیکھو! میں بالکل ننھی سی بچی ہوں۔"

محبوب نے ہنستے ہوئے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم بچی ہو۔ نہیں نہیں تم
اتنی بڑی عورت ہو۔"

"اور تم بھی تو اتنے بڑے مرد ہو۔ پھر بچوں جیسی حرکتیں کیوں کرتے ہو؟ بچو
سے دوستی کیوں کرتے ہو؟"

"میں تو بچہ ہوں۔"

"میں بھی بچی ہوں۔ آئینے میں دیکھو' جس طرح تم اتنے لمبے چوڑے ہو اور
ہو۔ اسی طرح میں بھی اونچی پوری عورت ہوں مگر تمہاری طرح بچی ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"اور نہیں تو کیا۔ اچھی بچیاں جھوٹ نہیں بولتیں اور میں بہت اچھی بچی ہوں
کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو' اس لئے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا' اب ہم دوست بن جائیں گے مگر وہ ریلنگ پر چلنے والی لڑکی کہاں ہے؟"

"میں نے اسے دوسرے دروازے سے بھگا دیا ہے۔ وہ لالچی لڑکی تھی۔ اسے ٹافیو
کا لالچ دے کر' اس کے ذریعے تمہیں میں نے اپنے پاس بلایا کیونکہ تم مجھے بری عور
سمجھ کر میری طرف دیکھتے نہیں تھے۔"

"اب دیکھوں گا۔ تم بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہارے چاچا جی' بھائی جان اور بھابی کہا
ہیں؟"

اس عورت نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ میرے چاچا جی' بھائی جان اور بھابی......
کہاں سے آگئے۔ تمہیں پوچھنا چاہئے تھا کہ میرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"کہاں ہیں؟"

"سب مر گئے۔ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔"

"اکیلی! دن بھر' رات بھر رہتی ہو؟"

"ہاں' اور تمہیں دور دور سے دیکھتی رہتی ہوں۔ تمہارے متعلق معلومات حاصل
کرتی رہی۔ تمہارے گھر کے ایک نوکر نے بتایا کہ تم میری طرح بالکل ایک بچے ہو۔ اس
لئے میں خوش ہوگئی اور ابھی تم سے میں نے دوستی کرلی۔ اب ہم دوست ہیں نا؟"

وہ دوستی پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے بعد روز صبح اور شام اس کے پاس جانے لگا۔ وہ
اتنی چالاک تھی کہ اسے اپنے قابو میں کرنا جانتی تھی۔ اپنی ذات میں دلچسپی پیدا کرانے کے
گر جانتی تھی۔ اس کے ساتھ بچوں جیسا کھیل کھیلتی تھی اور ہر کھیل اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ
وہ دوسرے بچوں کو بھی بھول جاتا تھا۔ رات کو جب وہ بستر پر سوتا تو اسے نجو یاد آتی
رہتی۔ اس کا نام نجمہ تھا۔ وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس عمر رسیدہ بچے کے لئے ایسے نسخے
لکھ رہی تھی کہ وہ اسی کا بیمار بن کر رہ گیا تھا۔ پہلے جتنے بچے دوست تھے اب ان کے
ساتھ کھیلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ صبح ہوتے ہی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ جب وہ ڈیوٹی پر
جاتی تو یہ واپس آجاتا شام کو پھر اس کے گھر پہنچ جاتا۔

رجب علی' اعظم اور اس کی بیوی دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اس میں
تبدیلی آرہی ہے اور وہ صبح و شام کہیں پابندی سے جایا کرتا ہے اور رات کو بہت دیر سے
واپس آتا ہے۔ اعظم نے اس کا تعاقب کیا اور لیڈی ڈاکٹر نجمہ کے مکان تک پہنچ گیا۔
محبوب اس روز رات کے دس بجے واپس آیا تو ڈرائنگ روم میں رجب علی اور اعظم
بیٹھے ہوئے تھے۔ اعظم نے اس سے پوچھا۔ "تم اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں جاتے
ہو؟"

"میں کسی ڈاکٹر کو نہیں جانتا۔ میں تو نجو کے پاس جاتا ہوں۔"

"اچھا' تو تم لیڈی ڈاکٹر نجمہ کو نجو کہتے ہو۔ اس سے اتنے فری ہو' بات کیا ہے؟"

"وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔"

رجب علی نے کہا۔ "بیٹے' کسی پرائی عورت کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔"

تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی کو پسند کرو اور اچھا کہو؟"

"چاچاجی! وہ عورت نہیں ہے۔ وہ میری طرح ایک بچی ہے۔"

اعظم نے پوچھا۔ "کیا نجو نے تم سے کہا ہے کہ وہ بچی ہے؟"

"ہاں' اسی نے مجھے بتایا ہے۔ میرے ساتھ وہ کھیلتی ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"وہ تمہیں اور کیا کہتی ہے؟"

"کہتی ہے ہم شادی کریں گے۔ میں دولہا بنوں گا۔ وہ میری دلہن بنے گی۔ بڑا مزا آئے گا۔ خوب باجے بجیں گے۔"

رجب علی اور اعظم ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ خطرے کی گھنٹی بجنے گ تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر رجب علی نے کہا "ٹھیک ہے بیٹے' تم جاؤ' روٹی کھانے کے بعد آرام سے سوجاؤ۔"

وہ ڈرائنگ روم سے چلاگیا۔ اعظم نے مٹھیاں بھینچ کر غصے سے کہا۔ "وہ لیڈی ڈا اسے آدمی بنا رہی ہے۔ اپنے قابو میں کر رہی ہے۔ اب یہ بھی اس سے شادی کے خوا دیکھ رہا ہے۔ اگر اس نے شادی کے لئے ضد کی تو مصیبت آجائے گی' ڈیڈی! آپ کو ا بیٹی پر اعتماد نہیں تھا۔ مجھے اپنی بہن پر بھروسہ نہیں تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ وہ اس نالا سے شادی کرکے اسے آدمی بنا دے گی اور ہمارے خلاف محاذ قائم کرلے گی۔ ہمیں گھ سے نکال دے گی۔ اب ایک پرائی عورت اس گھر کی بہو بن کر آئے گی تو ہمارا کیا انجا ہوگا؟"

رجب علی نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہت برا انجا ہوگا۔ اس آندھی کو ہمارے گھر کی طرف بڑھنے سے پہلے ہی روک دینا چاہئے۔"

"اسے روکنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل تو محبوب کو روکنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ ا کتنا ضدی ہے۔ وہ لیڈی ڈاکٹر اس سے دور بھاگے گی تو وہ اس کے پیچھے بھاگے گا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

اعظم نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جب اس ایک پسندیدہ کھلونا ٹوٹ جاتا ہے اور کھیلنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ صبر کرلیتا ہے۔ کچ

دوسرے کھلونے سے بہل جاتا ہے۔ کبھی وہ شبانہ کو بھی بہت چاہتا تھا۔ جب وہ گم ہوگئی تو اس نے صبر کرلیا۔ اسی طرح لیڈی ڈاکٹر اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے گم ہوجائے تو ہم پھر اسے بچہ بنا کر رکھ سکتے ہیں۔"

رجب علی نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ "بچہ بنائے رکھنا اب بہت مشکل ہے۔ اسے جوانی کی ہوا لگ گئی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

دوسرے دن محبوب' مووی کیمرہ شانے سے لٹکائے لیڈی ڈاکٹر نجمہ کے پاس پہنچا۔ نجمہ نے ہسپتال سے چھٹی لی تھی۔ پہلے سے پروگرام طے تھا کہ وہ پکنک منانے کے لئے کہیں دور جائیں گے۔ نجمہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یہ بہت بری بات ہے کہ تمہارے پاس ایئر کنڈیشنڈ کار ہے اور تم پیدل چلتے ہو۔ خود ڈرائیو نہیں کرسکتے۔"

"چاچاجی کہتے ہیں' مجھے کار ڈرائیو نہیں کرنا چاہئے۔ میں ابھی بچہ ہوں۔"

"میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ اب ہم دونوں بچے نہیں رہے۔ اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔"

"واہ' بچے کیسے نہیں رہے۔ روز جو ہم بچوں کی طرح کھیلتے ہیں؟"

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ جیسے بڑے لوگ کرکٹ کھیلتے ہیں' ہاکی کھیلتے ہیں' کبڈی کھیلتے ہیں' کشتی لڑتے ہیں' اسی طرح اب ہم بڑے لوگوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔"

"وہ خوش ہوکر بولا۔ "آہا' کتنا اچھا لگتا ہے۔ چلو' پھر کھیلیں۔"

اس نے انکار کیا۔ "اُوں ہوں۔ ابھی ہم پکنک کے لئے جارہے ہیں۔"

"بعد میں جائیں گے۔"

"نہیں' دیکھو کھیل صرف اِن ڈور نہیں ہوتا۔ آؤٹ ڈور بھی ہوتا ہے۔ وہاں ہم خوب کھیلیں گے۔ چلو۔"

وہ پکنک کا سامان اٹھا کر ایک بس اسٹاپ پر آئے۔ وہاں سے ایک بس میں سوار ہوئے۔ شہر سے دور ہائی وے پر بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔ وہاں چاروں طرف ہریالی تھی۔ اونچے گھنے درخت تھے۔ ذرا فاصلے پر ایک صاف و شفاف دریا بہہ رہا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیاں بھی تھیں۔ بہت اچھا منظر تھا۔ فوٹو گرافی اور

پکنک کے لئے بہت ہی موزوں تھا۔

محبوب نے کیمرہ سنبھال لیا۔ نجمہ کھانے کا باسکٹ اٹھائے آگے آگے جارہی تھی۔ بڑی غضب کی چال تھی۔ ان خوش رنگ مناظر میں وہ اپنی چال اور اپنی شخصیت سے اور زیادہ متاثر کر رہی تھی۔ وہ مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں اتارتا جارہا تھا۔ دور دور پر کچھ عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں نظر آرہی تھیں۔ سبھی پکنک اور تفریح کی غرض سے وہاں آیا کرتے تھے۔ وہ دوسروں سے کتراتے ہوئے ایک ٹیلے کے پیچھے آگئے۔ وہ جگہ جو ان بچوں کے لئے کھیلنے کودنے کے لئے مناسب تھی۔ نجمہ نے ایک جگہ زمین پر چادر بچھا دی کھانے کی ٹوکری ایک طرف رکھ دی محبوب ٹیلے کی طرف آیا پھر وہاں ایک اونچے سے پتھر پر کیمرے کو رکھ کر اس جگہ کی فریمنگ کرنے لگا۔ جہاں چادر بچھائی گئی تھی اور نجمہ وہاں بیٹھی کھانے پینے کا سامان نکال رہی تھی۔ کیمرے میں اس جگہ کو فریم کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”نجو! میں کیمرہ آن کرکے تمہارے پاس آرہا ہوں۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کیمرہ پتھر پر ایسی جگہ رکھا ہوا تھا کہ صاف طور سے نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ کیمرے کی آنکھ سے دیکھی جاسکتی تھی۔ محبوب نے کیمرے کو آن کیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ وہ چادر پر کبھی بیٹھنے لگے۔ کبھی لیٹنے لگے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے‘ ہنس رہے تھے۔ بول رہے تھے۔ پھر نجمہ نے چونک کر کہا۔ ”آخر‘ وہ کیمرہ کب تک آن رہے گا۔ شاید اس کی فلم رن آؤٹ ہوگئی ہے؟“

محبوب نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح معلوم ہے ابھی یہ فلم چلتی رہے گی۔ آدھے گھنٹے تک کیمرہ آن رہے گا۔“

”تو پھر کیمرے کی پوزیشن بدل دو۔ دوسری طرف سے فوٹو گرافی کرو۔ ایک ہی زاویے سے اچھا نہیں لگتا۔“

وہ دونوں سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ کوئی تیسرا ان کی گفتگو سننے کے باوجود دور کھڑا رہ کر سمجھ نہیں سکتا تھا اور وہاں جو ٹیلے کے پاس کھڑا ہوا تھا‘ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جنہیں وہ دیکھ رہا ہے وہ کیمرے کی زد

میں ہیں اور کیمرہ کہیں رکھا ہوا آن ہے۔

جب محبوب‘ نجمہ کے پاس سے اٹھ کر کیمرے کی طرف جانے لگا تو اسے ٹیلے کی طرف سے گھوم کر جانا پڑا کیونکہ دوسری طرف ایک گہرا گڑھا تھا۔ جب وہ ٹیلے کے قریب پہنچا تو اچانک ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی۔ کسی نے بڑی شدید ضرب لگائی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

وہ ہوش میں تھا لیکن سر چکرا رہا تھا۔ اس نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ آواز اس سے دور جارہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسے نجمہ کی چیخ سنائی دی۔ اس نے اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے‘ دونوں ہاتھ پاؤں سے زمین پر رینگتے ہوئے دوسری طرف گھوم کر دیکھا۔ کوئی نجمہ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور وہاں سے بھاگنے لگا۔ اس کے منہ پر اور سر پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ بھاگنے والے کو پہچان نہ سکا۔ زمین پر دونوں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا بڑی مشکل سے نجمہ کے قریب پہنچا تو اس کے سینے میں ایک خنجر دستے تک پیوست نظر آیا۔

وہ چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر سانس لے رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے محبوب کی طرف دیکھا۔ محبوب نے قریب آکر خنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”نن.......... نہیں۔ اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔ اسے میرے جسم سے باہر نہ نکالو۔ یہ جب تک میرے سینے میں اٹکا ہوا ہے‘ میرا دم بھی اٹکا ہوا ہے ورنہ اس کے ساتھ میری سانس بھی اکھڑ جائے گی۔“

محبوب نے خنجر کو پریشان ہو کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ چاقو بدن میں چبھ جائے اور کسی کو چاقو مار دیا جائے تو وہ مرجاتا ہے۔ کسی نے تمہارے سینے میں یہ چاقو گھونپ دیا ہے۔ تم مر رہی ہو۔ میں اس چاقو کو نکال لوں گا۔ تمہیں جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پھر چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ٹھہرو! ٹھہرو محبوب! کیا تم مجھے فوراً ہی مار ڈالنا چاہتے

ہو۔ کیا مجھے زندہ نہیں رکھو گے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے۔ چاقو نہ نکالو۔ مجھے اپنی محبت کے سائے میں رکھو۔ مجھے اپنے بازوؤں میں چھپالو۔"

"میں تمہیں اپنے بازوؤں میں چھپا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ مگر تم مجھ سے زیادہ بچی ہو۔ جو بات میں اچھی طرح سمجھتا ہوں تم نہیں سمجھتی ہو۔ میں ابھی یہ چاقو نکال کر تمہیں........." یہ کہتے کہتے اس نے چاقو کے دستے کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی سینے سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ نجمہ نے ایک گہری سانس لی۔ آخری ہچکی آئی پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

محبوب نے اسے بازوؤں میں چھپالیا۔ اسے آوازیں دینے لگا۔ اسے پیار کرنے لگا مگر اب وہ اس کی محبت سے بہت دور جاچکی تھی۔ پھر اس نے اسے جھنجھوڑا۔ تب پتا چلا کہ اس کی نجمہ اس کی بھابی کی طرح مرگئی ہے۔ تب اس کے دماغ میں نجمہ کی بات گونجنے لگی۔ کیا تم چاقو میرے سینے سے نکال کر مجھے فوراً مار ڈالنا چاہتے ہو۔ چاقو نہ نکالو۔ مجھ سے محبت کرو۔ جب تک چاقو اٹکا رہے گا۔ میں زندہ رہوں گی۔

یہ باتیں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ جیسے اسی نے چاقو نکال کر اسے ہلاک کر دیا ہو کوئی چاقو گھونپ کر مارتا ہے۔ کوئی چاقو کو بدن سے کانٹے کی طرح نکال کر مار ڈالتا ہے اور اس نے اپنی نجو کو مار ڈالا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یقیناً نجو کی آخری چیخ دور تک گئی ہوگی۔ الگ الگ ٹولیاں بنا کر تفریح کرنے والوں نے وہ چیخ سنی ہوگی۔ اسی لئے وہ دوڑتے ہوئے اُدھر آرہے تھے۔ اِدھر محبوب نے خنجر کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر کہا۔ "میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں بچہ ہوں۔ میں نے اپنی نجو کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔ میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔"

شاید وہ اس خنجر کو اپنے سینے میں اتار لیتا۔ اسی وقت پیچھے سے آکر کچھ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ آس پاس کتنی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "یہ قاتل ہے۔ یہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اسے تھانے لے چلو۔" کسی نے اس کا چاقو لے کر رومال میں لپیٹ لیا۔ تاکہ چاقو کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات محفوظ رہیں۔ ایک نے کہا۔ "لاش سے دور

رہو۔ کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے۔ پولیس والے اس سے قاتل کے خلاف اور بھی ثبوت حاصل کرسکتے ہیں۔"

دو آدمیوں نے محبوب کے دونوں ہاتھوں کو رسی سے پشت پر باندھ دیا تھا۔ ایک عورت نے غصے سے پوچھا۔ "تمہیں ایک کمزور عورت کے سینے میں خنجر گھونپتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

محبوب نے کہا۔ "میں نے اسے خنجر گھونپ کر نہیں بلکہ اس کے سینے سے خنجر نکال کر مار ڈالا ہے۔ میں اس کا قاتل ہوں۔"

ایک آدمی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا؟ تم کیا بک رہے ہو۔ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو' کیا خنجر نکالنے سے کوئی مرتا ہے یا خنجر گھونپنے سے؟"

محبوب نے سینہ تان کر کہا۔ "خنجر نکالنے سے مرتا ہے۔ میں نے ابھی اسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا ہے۔"

جائے واردات کے قریب وہ کیمرہ بھی نظر آیا۔ ایک شخص نے کہا۔ "یہ آن ہے۔ فلم رن آؤٹ ہوگئی ہے۔ شاید اس فلم کے ذریعے بھی قاتل کے خلاف کوئی ثبوت مل سکے۔"

وہ تھانے پہنچایا گیا۔ تھانے میں بھی اس نے یہی کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ میری نجمہ کے سینے میں کس نے خنجر گھونپ دیا لیکن وہ زندہ تھی۔ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے پیار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں اس کا قاتل ہوں۔ میں نے اس کے سینے سے خنجر نکال کر اسے ہلاک کر دیا۔"

وہ تھانے سے عدالت میں پہنچایا گیا۔ وہاں بھی اس نے یہی بیان دیا۔ رجب علی' اعظم' حمید اللہ چوہدری' وکیل حشمت بیگ نے اس کی حمایت میں پھر وہی ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کی رپورٹیں پیش کیں۔ اس نے سولہ برس کی عمر میں بھی اپنی بھابی کے قاتل ہونے کا دعویٰ کیا تھا جو غلط ثابت ہوا تھا۔ اس کیس کی فائلیں بھی نکالی گئیں۔ اس وقت کا فیصلہ بھی مدنظر رکھا گیا۔ پھر مووی کیمرے سے جو فلم ڈیولپ کی گئی تھی اور پرنٹ تیار کرنے کے بعد اسکرین پر دیکھی گئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ کوئی اپنے چہرے

کے اطراف کپڑا لپیٹ کر آیا تھا۔ اس کے سر پر بھی کپڑا بندھا ہوا تھا۔ ذرا سی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کیمرے کی آنکھ نے سب کچھ دکھایا تھا۔ اس نے نجمہ کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا اور وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ پھر کیمرے کی آنکھ نے دکھایا کہ محبوب دونوں ہاتھ اور پاؤں سے زمین پر رینگتا ہوا بڑی مشکل سے نجمہ کے پاس پہنچا تھا۔ کچھ باتیں ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ فلم ساؤنڈ سے خالی تھی اس لئے باتیں سمجھ میں نہیں آئیں' لیکن محبوب کے بیان کے مطابق کیمرے نے بتایا کہ اس نے خنجر اس کے سینے سے نکالا۔ اس کے بعد ہی نجمہ کا دم نکل گیا۔ اس لحاظ سے محبوب اپنے دعوے میں خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا کہ نجمہ کا قاتل وہی ہے۔

اس کے بچگانہ اور احمقانہ طرز زندگی کے متعلق محلے اور پڑوس والے تو جانتے ہی تھے۔ اب تھانے سے لے کر عدالت تک بھی لوگ اسے اچھی طرح سمجھ گئے۔ ایسا احمق پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا تھا۔ خود کو قاتل ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا' جیسے زندگی سے تنگ آگیا ہو اور موت کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔

لیڈی ڈاکٹر نجمہ کے متعلق بھی تحقیقات کی گئی تھیں۔ اس کے کمرے کی تلاشی لینے پر ایک ڈائری ہاتھ لگی۔ اس میں نجمہ نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا کہ وہ ایک نوجوان بیوہ تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد تقریباً دو سال تک بیوگی کی زندگی گزارتی رہی۔ پھر اچانک ایک دن اسے محبوب نظر آگیا۔ وہ اس کے دل اور دماغ پر چھا گیا۔ اس نے محبوب کے متعلق معلومات حاصل کیں اور یہ معلوم کرکے حیران رہ گئی کہ وہ ذہنی طور پر بالکل بچہ ہے۔

اس ڈائری میں محبوب کی بچگانہ حرکتوں کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ کس طرح ایک چھوٹی بچی کے ذریعے اس نے محبوب کو اپنے گھر میں بلایا تھا اور پھر کس طرح اسے محبت سے اپنایا تھا اور بڑی ہی سنجیدگی سے اور دل کی گہرائیوں سے اپنایا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے وہ رفتہ رفتہ اسے بچے سے جوان بنا سکھا رہی تھی۔

ڈائری میں یہ بات تفصیل سے لکھی گئی تھی کہ محبوب اس کا کس قدر دیوانہ ہے

اور اب اس سے زیادہ دنیا میں کسی کو نہیں چاہتا ہے۔ دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے لئے راتوں کو جاگتا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر وہ کبھی مرجائے گی تو شاید محبوب بھی اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکے۔

ڈائری کے یہ الفاظ ثابت کر رہے تھے کہ محبوب سے نجمہ کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے کبھی ہلاک نہیں کرسکتا تھا۔ فلم اس بات کی گواہ تھی۔

اس بار فیصلہ سنانے والے جج نے اسے قتل کے الزام سے بری کرتے ہوئے وارننگ دی اور کہا۔ "مسٹر محبوب' تم اپنی احمقانہ حرکتوں سے پولیس اور عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرتے ہو۔ تمہیں تنبیہہ کی جاتی ہے کہ آئندہ خود کو کبھی قاتل نہ سمجھنا۔ تم ایک اچھے' معصوم انسان ہو' اچھی باتیں کرتے ہو۔ ہمیشہ سچ بولتے ہو پھر اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ کوئی تمہاری معصومیت کی آڑ میں اپنے جرائم پر پردہ ڈال رہا ہو۔ آئندہ تم تھانے یا عدالت میں قاتل بن کر آؤ گے اور ہمارا وقت برباد کرو گے تو تمہیں تمہاری کوٹھی میں ہمیشہ کے لئے نظربند کر دیا جائے گا۔ تم اپنی کوٹھی سے نہ باہر نکل سکو گے۔ نہ ہی کسی کے قتل کا الزام اپنے سر لے سکو گے۔"

وہ بری ہوکر پھر اپنی کوٹھی میں آگیا۔ پھر اس کا وہی کھلونوں سے بھرا ہوا کمرہ تھا لیکن اب وہ کھلونوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ سوتا تھا' بیٹھتا تھا' اٹھتا تھا' کھاتا تھا' پیتا تھا مگر ہر لمحہ نجمہ اس کے سامنے رہتی تھی۔ اس کی ایک ایک بات' ایک ایک ادا یاد آتی تھی۔ اس نے ایسا جادو کیا تھا کہ وہ جادو سر سے نہیں اتر رہا تھا۔

رجب علی اور اعظم بھی ضد کے پکے تھے۔ اسے بہلانے' پھسلانے کے تمام جتن کرتے تھے۔ نئی نئی تفریحات میں اسے مصروف رکھتے تھے۔ بس اس کی ایک ہی کمزوری تھی کہ یادداشت کمزور تھی۔ وہ بڑی سے بڑی بات کچھ عرصے بعد بھول جاتا تھا وہ نجو کو بالکل بھلا نہ سکا' لیکن رفتہ رفتہ اس کی یاد میں وہ شدت نہ رہی۔ اس شدت کو ختم کرنے کے لئے رجب علی نے ایک اور چال چلی۔ اس جوان بچے کی خدمت کے لئے ایک جوان ملازمہ گھر میں رکھ لی۔ وہ گھر کی بات تھی۔ گھر کی چار دیواری میں رہی باہر کوئی نہ جان سکا

کہ نجو اس کے کمزور دماغ کے تہہ خانے میں کس طرح دفن کر دی گئی ہے۔

چھ ماہ بعد وہ ملازمہ گھر سے بھاگ گئی۔ کسی دوسری ملازمہ کا انتظام جلد ہی نہ ہو سکا وہ اپنے چاچا جی کو پریشان کرنے لگا اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو اس کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتا رہے یا کھیلتی رہے۔ رجب علی اور اعظم نے بیزار ہو کر اسے خواب آور گولی کھلائی۔ اس رات وہ سکون سے سو گیا۔ پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔ اسے سکون سے سلانے کے لئے خواب آور گولیاں کھلائی جاتی تھیں۔ دن کے وقت اسے کھلونوں سے اور چھوٹے چھوٹے بچوں سے بہلایا جاتا تھا۔ سچ ہے کہ دولت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ دونوں باپ بیٹے' دولت حاصل کرنے یا محبوب کی دولت پر عیش کرنے کے لئے جو پاپڑ بیل رہے تھے' جتنی مصیبتیں اٹھا رہے تھے' یہ وہی جانتے تھے۔ جو محنت مزدوری کرنا نہیں جانتے' وہ فراڈ کرنا جانتے ہیں۔ خواہ وہ فراڈ کتنا ہی مہنگا پڑتا رہے۔

انہی دنوں وہ ایرانی بلی محبوب کو مل گئی۔ وہ اس بلی سے بہلنے لگا مگر رجب علی اور اعظم کے نصیب میں ابھی نت نئی پریشانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ اسے بہلانے کے لئے پروفیسر بخاری کے کمالات دکھانے لے گئے تھے لیکن وہاں کچھ اور ہو گیا۔ محبوب کی ایرانی بلی ایک آٹھ برس کی خوبصورت سی گڑیا جیسی لڑکی بن گئی اور پروفیسر بخاری بھی وہ کمال دکھا کر مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ پتا نہیں وہ ایرانی بلی کہاں گم ہو گئی تھی۔ جب تک وہ اسے تلاش کر کے نہ لاتا۔ اسے اس کی اپنی بیٹی واپس نہ ملتی اور اگر ملتی تو اس شرط پر کہ وہ محبوب کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہ کر ہی زندگی گزارے یا پھر کوئی ایسی تدبیر کرے جس سے بیٹی واپس مل جائے اور محبوب کی بچگانہ ضد ختم ہو جائے۔

☆======☆======☆

پروفیسر بخاری تمام دن اپنے ماتحتوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس ایرانی بلی کو تلاش کرتا رہا۔ پھر تھک ہار کر' ناکام ہو کر محبوب کی کوٹھی میں واپس آ گیا۔ اس کی بیٹی جس کا نام ایرانی بلی کی مناسبت سے مونا پڑ گیا تھا۔ باغیچے میں محبوب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ محبوب کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ آگے پھیلاتا ہوا' مونا کو تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مونا ہنستی ہوئی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ پروفیسر نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی تو اس نے کہا۔ "بیٹی' تم یہاں بہت خوش ہو۔ اس کے ساتھ تمہارا دل لگ گیا ہے۔ کیا یہاں سے بھاگنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"نہیں' پاپا یہ آدمی بہت اچھا ہے۔ ایک دم بچوں جیسا ہے۔ بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے بہت سی ٹافیاں دیتا ہے جو مانگتی ہوں وہ میرے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اتنے قیمتی قیمتی کھلونے مجھے دینے کے لئے تیار ہے۔ میں تو یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"بڑی مشکل ہے ایک تو وہ بڑا بچہ ہے اور ایک تم چھوٹی بچی ہو۔ دونوں کی ضد ہمارے لئے مصیبت بن جائے گی۔ میں یہاں سے کبھی نہیں جا سکوں گا۔"

رات کو انہیں سرونٹ کوارٹر سے بلا کر کھانا کھلایا گیا تو اتنا لذیذ کھانا کھانے کے بعد پروفیسر بخاری کا ارادہ بدل گیا۔ سوچا' اب وہیں رہنا چاہئے۔ اس نے زندگی میں لذیذ کھانے ضرور کھائے تھے لیکن ایک ہی دستر خوان پر اتنی ڈشیں اور ساری کی ساری لذیذ ڈشیں' اس نے کبھی بیک وقت نہیں چکھی تھیں۔ اس کی زندگی یوں گزر رہی تھی کہ شہر میں کہیں اپنے کمالات دکھانے کا موقع ملتا تو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصے تک اچھا کھا

پی کر گزارہ ہو جاتا تھا ورنہ فاقہ مستی ہوتی تھی۔

وہ رات کو سرونٹ کوارٹر کے بستر پر کروٹیں بدل بدل کر سوچتا رہا۔ اسی وقت رجب علی نے آکر کہا۔ "حمید اللہ چوہدری صاحب نے دو سپاہیوں کو بھیجا ہے اور تمہیں ابھی طلب کیا ہے۔"

پروفیسر بخاری نے گھبرا کر پوچھا۔ "مجھے کیوں طلب کیا ہے۔ میرا کیا قصور ہے؟"

"ہم نہیں جانتے۔ میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے تمہیں اکیلے بلایا ہے۔"

پروفیسر دو سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ رجب علی نے کوٹھی میں آکر دیکھا۔ محبوب کی خواب گاہ کی لائٹ آن تھی۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب آکر انہیں چپ چاپ دیکھنے لگا۔ محبوب اس کے ساتھ لوڈو کھیل رہا تھا اور اپنی مونا سے کہہ رہا تھا۔ "کتنا اچھا ہوتا تم بچی نہ ہوتیں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اب بچوں سے کھیلتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے تم بیٹھے بیٹھے جوان ہو جاؤ۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میرا بھی دل چاہتا ہے۔ لال لال جوڑا پہنوں۔ خوب زیورات پہنوں اور دلہن بن جاؤں۔ جب میں بہت سی دلہنوں کو دیکھتی ہوں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔"

محبوب نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "چلو، ہم دولہا دلہن کا کھیل کھیلیں گے۔ تم دلہن بن جانا۔ میں بارات لے کر آؤں گا۔ دولہا بن کر آؤں گا۔"

"مگر ابھی کیسے کھیل سکتے ہو۔ میرے پاس تو سرخ جوڑا نہیں ہے۔ زیورات نہیں ہیں۔ تمہارے پاس دولہا کے کپڑے نہیں ہیں۔"

"مونا تم نہیں جانتی ہو۔ میں جس بات کی ضد کرتا ہوں اسے پورا کرا لیتا ہوں۔ میں ابھی چچا جی سے کہوں گا کہ وہ تمہارے لئے راتوں رات جوڑا سلوائیں گے۔ مجھے بھی دولہا بنائیں گے۔ چلو، ہم چچا جی کے پاس چلتے ہیں۔"

چچا جی خود ہی ان کے کمرے میں آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس یقین کے ساتھ گھبرایا ہوا تھا کہ اب بھتیجے کی ایک نئی ضد پوری کرنی ہوگی۔ اس نے کہا۔ "بیٹے! میں یہاں آتے وقت سب کچھ سن چکا ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ اب تم

لوگوں کو سو جانا چاہئے۔ اگر دولہا دلہن کا کھیل کھیلنا چاہتے ہو تو کل میں دن کے وقت درزی کو بلواؤں گا اور تم لوگوں کے لئے نئے جوڑے سلواؤں گا۔ پھر باجے والے آئیں گے۔ ہم بڑی دھوم دھام سے کھانے پکوائیں گے اور لوگوں کو بلائیں گے اور جب یہ کھیل ہو گا تو بڑا مزہ آئے گا۔ سب لوگ تالیاں بجائیں گے۔"

محبوب نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی کھیلیں گے۔ ابھی سب لوگوں کو بلائیں گے۔ یہاں مونا کے وہ جادوگر لوگ ہیں۔ ہمارے گھر میں بھائی جان ہیں، بھابی ہیں، آپ ہیں۔ پھر اپنے نوکر بھی ہیں۔ سب لوگ باراتی بن جائیں گے اور سب لوگ تالیاں بجائیں گے۔"

اس کی ضد شروع ہو گئی اور رجب علی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے اس وقت بہلا نہیں سکے گا۔ اس کے دماغ میں یہی بات بیٹھی ہوئی تھی کہ مونا کو دلہن بنانا ہے اور اسے جوان مونا کے روپ میں دیکھنا ہے۔ یہ جو کچھ بھی وہ چاہتا تھا اس کا سہرا رجب علی اور اعظم کے سر تھا۔ انہوں نے ہی اسے بگاڑا تھا۔ نت نئے طریقوں سے اسے ضدی بنایا تھا۔

رجب علی نے حساب لگانا شروع کیا۔ اگر ان کا جوڑا بنایا جائے تو کتنی رقم خرچ ہو گی اور کتنی رقم زیادہ بتا کر اپنی آمدنی میں اضافہ کیا جائے گا۔ وہ حساب کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے حمید اللہ کی آواز سنائی دی۔

"میں چوہدری بول رہا ہوں۔ اس وقت پروفیسر بخاری میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ ابھی میرے دماغ میں ایک تدبیر آئی ہے اس کے ذریعے ہم پروفیسر کی لڑکی کو اس کے حوالے کر سکتے ہیں اور محبوب کی ضد ختم کر سکتے ہیں۔"

رجب علی نے کہا۔ "جناب، یہاں تو بات ہی کچھ اور ہو رہی ہے۔ محبوب مونا کو دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ یہ لڑکی جوان ہو جائے۔ بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "کیا کہا! محبوب یہ چاہتا ہے کہ مونا جوان ہو جائے؟"

"جی ہاں، ابھی وہ ضد کر رہا ہے کہ مونا کے لئے دلہن کے کپڑے سلوائے جائیں۔

اور اسے بھی دولہا بنایا جائے۔ گھر کے سب لوگوں کو باراتی بنا کر شادی کی جائے۔"

"رجب علی، تم نے اسے زبردست ضدی بنایا ہے اور اس کی ضد سے تم خود ک
فائدہ اٹھاتے ہو، یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں نادان نہ سمجھو۔"

"سر! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میں زیادہ باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تھوڑی دیر انتظار کرو
میں ابھی بات کرتا ہوں۔ ریسیور نہ رکھنا۔"

وہاں فون پر خاموشی چھا گئی۔ رجب علی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ایک
منٹ تک اسے انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد حمیداللہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو، تم موجو
ہو؟"

"جی ہاں، جناب! میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"سنو، دلہن کا جوڑا میں تیار کر رہا ہوں۔ تم دولہا کا جوڑا تیار کراؤ۔ جو درز
تمہارے پاس آئے۔ محبوب کے سامنے، اس سے کہنا کہ مونا کا دلہن کا جوڑا تیار کرا۔
اور محبوب کے پیٹھ پیچھے سمجھا دینا کہ مونا کے لئے صرف کوئی خوبصورت سی فراک ت
دے۔"

رجب علی نے پوچھا۔ "لیکن جب محبوب کو معلوم ہو گا کہ............"

اس کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ "اسے جب معلوم ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ اسے سمجھ
کہ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کپڑے صبح تک تیار ہو جائیں گے۔ صبح اس کی بارا
تمہارے گھر سے نکلے گی اور میرے گھر آئے گی۔ مونا کو ہم یہاں لے آئیں گے۔ اس
کہنا کہ اسے دلہن بنایا جا رہا ہے۔ میں ابھی ایک بجے تک جاگتا رہوں گا۔ تم جب چا
فون پر رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ اس کے بعد صبح پانچ بجے کے بعد پھر رابطہ قائم ہو سکتا ہے
ہم وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے فون کے ذریعے پروگرام طے کرتے رہیں گے کہ آئند
ہمیں کیا کرنا ہے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ رجب علی نے اپنے بیٹے اعظم کو بلا کر ساری باتیں بتائیں۔ اعظ
نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آخر یہ چوہدری صاحب کرنا کیا چاہتے ہیں۔ وہاں پروفیسر بخار

ان کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ یقیناً ان کے درمیان کوئی سمجھوتا ہوا ہے۔"

رجب علی نے کہا۔ "سمجھوتا کیا ہو سکتا ہے۔ کیا پروفیسر بخاری، اپنی بیٹی کو ہمارے
حوالے کر دے گا۔ کیا اتنی سی عمر میں محبوب کے ساتھ بیاہ دے گا۔ یہ تو عجیب مضحکہ خیز
بات ہے۔ اسے چوہدری صاحب جیسے لوگ تسلیم بھی نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کیا کرنا چاہتے
ہیں؟"

اعظم نے کہا۔ "ڈیڈی اگر وہ اس لڑکی کو محبوب کی ضد کے مطابق یا اسے بہلانے
پھسلانے کے لئے اس سے منسوب کر دیتے ہیں، یا جھوٹ موٹ کا نکاح پڑھا دیتے ہیں تو یہ
ہمارے لئے اچھا ہے۔ وہ لڑکی مونا جب تک جوان ہو گی اس وقت تک تو ہمارے عیش
ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہو گا کہ محبوب کا دھیان شادی سے، اور کسی جوان عورت سے
ہٹ جائے گا۔

رجب علی نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اس طرح تو بات ہمارے حق میں بنتی
ہے۔ چلو، دیکھتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوتا ہے۔"

وہ پھر گڈا گڈی کی شادی کے سلسلے میں مصروف ہو گئے۔ گھر سے نکل کر درزی کے
پاس گئے۔ اپنے ساتھ محبوب اور مونا کو بھی لے گئے۔ جب ایک گھنٹے بعد واپس آئے تو
ان کی کوٹھی میں دو سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے کہا۔ "آپ چوہدری صاحب سے فون پر
بات کر لیں۔"

رجب علی نے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے حمیداللہ نے کہا۔
"مونا کو ان سپاہیوں کے حوالے کر دو۔ وہ اسے میرے پاس پہنچا دیں گے۔ کل صبح نو بجے
محبوب کو دولہا بنا کر میری کوٹھی میں لے آنا۔"

جب محبوب کو معلوم ہوا کہ مونا اس سے بچھڑنے والی ہے تو وہ ضد کرنے لگا میں
مونا کو نہیں جانے دوں گا۔ یہ میرے پاس رہے گی۔ رجب علی اور اعظم نے اسے سمجھایا
کہ جو دلہن ہوتی ہے وہ شادی سے پہلے اپنے دولہا کے پاس نہیں رہتی۔ پھر رجب علی
نے مونا سے کہا کہ وہ بھی سمجھائے۔ پھر مونا نے سمجھایا کہ صبح وہ دلہن بن کر ملے گی۔
جب وہ دونوں دولہا دلہن بن کر ملیں گے تو بڑا مزہ آئے گا۔ سب لوگ خوش ہوں گے۔

مونا کے بار بار سمجھانے کے بعد وہ راضی ہوگیا۔ آخر مونا سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چا گئی۔ اعظم کی بیوی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہاں اس لڑکی کے لئے دلہن کا جوڑا سلو جائے گا' اسی لئے بلایا گیا ہے۔"

اعظم نے آہستگی سے کہا۔ "چلو اچھا ہے۔ اگر کسی طرح یہ لڑکا مونا کو دلہن تسل کرلے اور اس کے جوان ہونے تک بہل جائے تو ہم سب کے لئے بڑی اچھی با ہوگی۔ ایک طویل عرصے تک کے لئے ہماری پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔"

وہ سب رات کے تین بجے تک جاگتے رہے پھر سو گئے صبح چھ بجے درزی نے آ اٹھایا۔ اس نے جوڑا تیار کرلیا تھا اور منہ مانگی قیمت حاصل کی تھی۔ صبح آٹھ بجے جب دولہا کی چمکیلی شیروانی محبوب کو پہنائی گئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ لوگ ٹھیک نو بجے ا ایئر کنڈیشنڈ کار میں بٹھا کر حمید اللہ چوہدری کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ گڈا گڈ کا کھیل نہیں تھا اور ایک جوان مرد اور ایک ننھی بچی کی شادی بھی مضحکہ خیز تھی۔ سارا سارا کھیل' بچوں کا کھیل تھا لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ تھی کہ اس کھیل م بڑے شریک ہو رہے تھے۔ اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ بچے کو بہلانے پھسلانے کے ل بڑے لوگ اس کے سامنے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ منہ بناتے ہیں۔ طرح طرح آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی گھوڑا بن جاتے ہیں کبھی سر کے بل کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگ ان بزرگوں کی توجہ سے اسٹڈی کی جائے تو یہ بچوں سے بھی زیادہ بچے نظر آتے ہیں بچوں کی طرح انہیں احساس نہیں ہوتا کہ ایسے وقت وہ بچے بن گئے ہیں۔

وہ لوگ حمید اللہ کی کوٹھی کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کئی کار کھڑی ہوئی تھیں۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک بڑا سا شامیانہ تھا اور وہ شامیانہ قناتوں گھیرا گیا تھا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے شادی کا گھر ہو لیکن اس شامیانے کے ایک طرف سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور اسٹیج پر پروفیسر بخاری شعبدہ بازی کے کمالات دکھا رہا تھا۔

ان کی کار شامیانے کے سامنے پہنچی تو سب لوگوں نے اٹھ کر محبوب کا استقبال ا ہی کیا جیسے ایک دولہا کو ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہو۔ سب لوگ اسے اسٹیج پر لے آئے۔ ا

کے ایک کنارے پر آرام دہ کرسی رکھی ہوئی تھی۔ وہاں اس دولہا کو بٹھا دیا گیا۔ وہ مارے خوشی کے سہرے کے پھولوں کی طرح کھل رہا تھا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ وہ سہرے کے پیچھے بتیسی نکالے بیٹھا ہے اور اِدھر اُدھر بے چینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اعظم کو اشارے سے بلایا۔

اعظم نے قریب آکر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "میری مونا کہاں ہے؟"

اعظم نے کہا۔ "خاموش رہو۔ شادی سے پہلے دلہن کی بات نہ کرو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ تمہیں بچہ سمجھیں گے اور جب تمہیں بچہ سمجھیں گے تو تمہاری شادی نہیں ہوگی۔ جانتے ہو نا صرف جوانوں کی شادی ہوتی ہے۔"

اس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ خاموش بیٹھ گیا۔ ادھر اسٹیج پر پروفیسر بخاری مختلف قسم کے کمالات دکھا رہا تھا اور لوگوں سے داد وصول کر رہا تھا۔

پھر اس نے جادوگروں کے انداز میں اپنی جادو کی چھڑی کو نچاتے ہوئے کہا۔ "حاضرین و ناظرین' میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دیا۔ اب میں آپ کو اپنا آخری کمال دکھا رہا ہوں۔ یہ جو دولہا میاں آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں' ان کے پاس ایک ایرانی بلی تھی جسے لے کر میں نے ایک ڈبے میں بند کیا اور اس بلی کو میں نے ایک آٹھ برس کی ننھی منھی سی' پیاری پیاری سی بچی بنا دیا۔ اب ہمارے یہ دولہا میاں اس بچی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے میں آپ کے سامنے اس بچی کو پیش کرتا ہوں۔ تالیاں بجایئے۔"

تمام تماشائی تالیاں بجانے لگے۔ ان تالیوں کے شور میں مونا اسٹیج کے ایک سرے سے داخل ہوئی اور ناظرین اور حاضرین کے سامنے سلام عرض کیا۔ محبوب اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پروفیسر بخاری نے کہا۔ "دولہا میاں' ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آپ کی دلہن آپ کو ضرور ملے گی۔"

وہ بیٹھ گیا۔ مونا وہی لباس پہنے ہوئے تھی۔ جسے وہ کل رات سلوا کر لایا تھا۔ اسٹیج پر جہاں پروفیسر بخاری کھڑا ہوا تھا اس کے پیچھے ایک سفید پردہ تھا۔ اس پردے کو ہٹایا گیا۔

پردے کے پیچھے ایک بڑا سا صندوق تھا۔ پروفیسر بخاری نے کہا۔ "معزز حاضرین! آپ دیکھ رہے ہیں کہ دولہا میاں بانکے تگڑے اور مکمل جوان ہیں ماشاء اللہ' قد میں چھ فٹ ضرور ہوں گے اور آپ اس طرف اس دلہن کو دیکھ رہے ہیں جو صرف آٹھ برس کی ہے۔ آٹھ برس کی دلہن سے اتنے بڑے دولہا کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم دولہا میاں سے پوچھتے ہیں کیا ان کی مونا کو جوان بنا دیں' دلہن بنا دیں؟"

محبوب نے سہرے کو دونوں طرف سے ہٹا کر مونا کو دیکھا پھر پروفیسر سے پوچھا۔ "کیا اسے میری نجو کی طرح بنا دو گے؟"

پروفیسر نے سوال کیا۔ "نجو؟ یہ نجو کون ہے یا کون تھی؟"

کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ کچھ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں' نہیں' میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ عدالت والے جج صاحب نے کہا ہے کہ میں اپنے آپ کو قاتل نہ کہوں' نہیں تو مجھے کوٹھی میں نظر بند کر دیں گے۔"

پروفیسر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اچھا' اچھا تم یہ بتاؤ تمہاری نجو' مونا کی طرح اتنی سی تھی یا جوان تھی؟"

محبوب نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "وہ اتنی بڑی تھی۔ جب میں اسے گلے سے لگاتا تھا تو وہ میرے سینے تک آتی تھی۔"

سب اس بات پر ہنسنے لگے۔ پروفیسر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش رہنے کے لئے کہا۔ پھر محبوب سے پوچھا۔ "اچھا' تو تم چاہتے ہو کہ مونا تمہاری نجو جیسی بڑی ہو جائے؟"

اس نے جلدی جلدی ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں' میں بس ویسی ہی دلہن چاہتا ہوں۔ بڑی والی دلہن۔"

پروفیسر بخاری صندوق کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے جادو کی چھڑی کو ایک بار صندوق پر مارتے ہوئے کہا۔ "اس کے پٹ کھول دو۔"

اس کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ماتحت اسٹیج پر آئے' پھر انہوں نے صندوق کے سامنے والے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہ بظاہر صندوق نظر آرہا تھا مگر اس کے سامنے

والے دو پٹ کھل رہے تھے۔ اس لئے نہ وہ صندوق تھا نہ وہ الماری تھی۔ بس ایک بڑا سا جادوئی ڈبہ تھا۔ پروفیسر بخاری نے اس صندوق پر چھڑی کو مارتے ہوئے کہا۔ "معزز حاضرین! آپ دور سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور قریب سے بھی۔ یہ صندوق بالکل خالی ہے۔ اب اس میں اس لڑکی کو بند کیا جائے گا اور جب اس کے پٹ کھولے جائیں گے تو یہ لڑکی جوان ہو چکی ہوگی اور دلہن بن کر آپ کے سامنے آجائے گی' یعنی دولہا میاں کے پاس پہنچ جائے گی۔"

محبوب بڑے شوق' بڑی بے چینی سے کبھی اس جادوئی ڈبے کو دیکھتا تھا اور کبھی مونا کو اور نظروں ہی نظروں میں جیسے مونا سے کہتا تھا۔ "جلدی سے ڈبے کے اندر جاؤ اور میری بڑی سی دلہن بن کر آجاؤ۔"

بخاری نے کہا۔ "بیٹی' بس آجاؤ۔ اس ڈبے کے اندر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں دلہن بناؤں گا۔ بہت ہی خوبصورت دلہن۔"

مونا نے تماشائیوں کے سامنے جھک کر سلام کیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر ڈبے کے پاس آئی۔ زمین پر دو زانو ہوئی اور رینگتے ہوئے ڈبے کے اندر پہنچ گئی۔ پروفیسر کے دونوں ماتحتوں نے اس ڈبے کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ پھر پیچھے ہٹتے ہوئے اسٹیج سے چلے گئے۔ پروفیسر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "معزز حاضرین! میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ بہت جلد اپنا کمال دکھا کر آپ سے داد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر صندوق کے پاس گیا پھر چھڑی کو گھماتے ہوئے صندوق کے چاروں طرف گھوم گھوم کر منتر پڑھنے لگا۔ محبوب بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی نظریں اس ڈبے کے دونوں پٹوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر پروفیسر نے ایک جگہ رک کر اس ڈبے پر دو بار چھڑی مارتے ہوئے کہا۔ "کیوں بیٹی مونا' تم جوان بنو گی؟"

ڈبے کے اندر سے مونا کی آواز سنائی دی۔ "ہاں' بنوں گی۔"

"کیا تم یہاں سے جاؤ گی؟"

پھر مونا کی آواز سنائی دی۔ "مگر جاؤں گی تو مجھے کیا ملے گا؟"

پروفیسر بخاری نے کہا۔ "جناب حمید اللہ صاحب نے تمہیں ٹافیاں کھانے کے لئے دو

ہزار روپے دیئے ہیں۔ دو ہزار روپے کے کھلونے دلوائے ہیں اور تم کیا چاہتی ہو؟"

"اگر وہ سب کچھ میرا ہوگا تو میں چلی جاؤں گی۔"

"شاباش' اب تم ایک ننھی سی بچی کے بجائے فوراً جوان بن جاؤ اور مجھے آ دو۔"

یہ کہہ کر پروفیسر پھر ڈبے کے چاروں طرف گھوم کر منتر پڑھنے لگا۔ اس کے ایک جگہ رک کر اس نے جادو کی چھڑی دو بار ڈبے پر ماری۔ پھر کہا۔ "ہاں بیٹی مونا' جوان بن کر آواز دو۔"

ڈبے کے اندر سے آواز سنائی دی۔ "میاؤں' میاؤں۔"

تمام تماشائی ہنسنے لگے۔ محبوب ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "یہ تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ میری مونا کو تم نے پھر سے بلی بنا دیا ہے۔ مجھے بلی نہیں چاہئے مجھے دلہن چاہئے۔ بڑی دلہن چاہئے۔"

پروفیسر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میرے منتر جنتر میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ آرام سے بیٹھو میں ابھی تمہیں دلہن لا کر دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر ڈبے کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ منتر پڑھنے لگا پھر ایک جگہ رک کر اس نے جادوئی چھڑی کو دوبار ڈبے پر مارتے ہوئے کہا۔ "بیٹی مونا! خدا کے لئے اب جوان ہوجاؤ۔ ورنہ میں بوڑھا ہونے سے پہلے ہی تمہارے دولہا میاں کے ہاتھوں مر جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد خاموشی چھاگئی۔ پروفیسر جھک کر ڈبے سے کان لگا کر سننے لگا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تمام تماشائیوں سے زیادہ محبوب کے اندر تجسّس پیدا ہوگیا تھا۔ وہ بے چینی سے اس ڈبے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر بخاری نے ڈبے دوبارہ چھڑی مارتے ہوئے کہا۔ "مونا جواب دو۔"

ڈبے کے اندر سے آواز سنائی دی۔ "ہائے مجھے جلدی سے باہر نکالو۔ میں بڑی ہوگئی ہوں اور یہ ڈبہ چھوٹا ہوگیا ہے۔ میری سانس رک رہی ہے۔"

پروفیسر نے خوش ہوکر فاتحانہ انداز میں پہلے محبوب کو' پھر تماشائیوں کو دیکھا او

اپنے ماتحتوں کو آواز دی۔ اس کے دونوں ماتحتوں نے آکر اس ڈبے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ اس کے کھلتے ہی سرخ لباس نظر آیا۔ وہ گٹھڑی بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ محبوب دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیک کر' جھک کر اس ڈبے کے اندر دیکھنے لگا۔ ہولے ہولے ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ بڑی ہی مترنم ہنسی تھی اور اس کے گورے گورے' گلابی گلابی ہاتھ نظر آرہے تھے۔ ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی۔ سونے کی چوڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی ڈبے سے نکلنے لگی۔ پھر وہ نکل کر ڈبے کے سامنے فرش پر دو زانو ہوگئی۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا اس کا رخ تماشائیوں کی طرف تھا۔ محبوب جلدی سے دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "مونا' کیا تم جوان ہوگئی ہو؟"

کوئی جواب نہیں ملا۔ دلہن شرما رہی تھی۔ محبوب سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ کو اٹھا کر الٹ دیا۔ تب وہ حسین مکھڑا نظر آیا۔ اسے محبوب نے دیکھا تو ایک دم سے ساکت ہوگیا' جیسے ساری دنیا کو بھول گیا ہو۔ وہ اتنی حسین تھی۔ ایسی پیاری پیاری صورت تھی کہ اس پر سے نظریں ہٹنا نہیں چاہتی تھیں۔

تماشائیوں کی طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "دولہا میاں' دولہا میاں' ذرا سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

محبوب ساری دنیا کو بھول چکا تھا۔ تماشائیوں کی آوازیں بھی اس کے کانوں تک نہیں آرہی تھیں۔ اس نے دلہن کا ہاتھ تھام کر اسے بڑی حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مونا کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے' تمہارے ہاتھ کتنے بڑے ہوگئے ہیں۔ نجو کے ہاتھوں کی طرح۔ تم نجو کی طرح میرے ساتھ کھیلو گی نا؟"

دلہن نے شرما کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ پروفیسر بخاری نے پاس آکر کہا۔

"دولہا میاں' آپ ذرا ایک طرف ہوجائیں۔ نکاح سے پہلے دلہن سے بات نہیں کرنا چاہئے۔ چلیں' اپنی جگہ جا کر بیٹھیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی کے پاس لے آیا اور وہاں اسے بٹھا دیا۔ دلہن نے وہاں سے اٹھ کر' تماشائیوں کی طرف جھک کر اسی انداز میں سلام کیا جیسے مونا نے ڈبے میں بند ہونے سے پہلے سلام کیا تھا۔ رجب علی اور اعظم پہلی

قطار میں بیٹھے ہوئے تھے اور بڑے غور سے اس دلہن کو دیکھ رہے تھے۔ اعظم نے کہا۔ "ڈیڈی! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اس لڑکی کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

رجب علی نے کہا۔ "ہاں' میرا دل بھی عجیب طرح سے دھڑک رہا ہے۔ کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔ یہ جانی پہچانی صورت ہے مگر یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے؟"

"ڈیڈی' کہیں بھی دیکھا ہو لیکن یہ چوہدری صاحب کی بہت بڑی سازش ہے۔ مونا کو محبوب کے سامنے ڈبے میں بند کر کے اس کی جگہ ایک نوجوان لڑکی پیش کر دی۔ وہ بھی دلہن کے روپ میں' جبکہ محبوب دلہن کا تقاضا کر رہا تھا۔ اب تو یہ کمبخت اس سے شادی کئے بغیر نہیں مانے گا اور اگر شادی ہوگئی تو ہماری بربادی سمجھئے۔"

"ہم یہ شادی نہیں ہونے دیں گے۔ وصیت کی رو سے محبوب کی شادی میری شبانہ سے..........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک دم سے چونک کر دلہن کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹیج کے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ سر جھکائے ہوئے تھی۔ رجب علی نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کو اچانک ہی مضبوطی سے گرفت میں لے لیا' پھر کانپتے ہوئے بولا۔ "بیٹے دیکھو' غور سے دیکھو۔ کیا یہ ہماری شبانہ کی طرح نہیں لگ رہی ہے؟" اعظم اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ رجب علی نے کہا۔ "گیارہ برس کی شبانہ کو یاد کرو' اس کا چہرہ کیسا تھا۔ اب وہ جہاں بھی ہوگی' اگر جوان ہوگی تو کیا روپ رنگ میں بالکل ایسی نہیں ہوگی؟"

اعظم نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں' شبانہ کو گم ہوئے تقریباً دس برس گزر چکے ہیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اگر آپ نے اسے شبانہ تسلیم کر لیا تو جانتے ہیں کیا ہوگا۔ وصیت کی رو سے ان کی ابھی شادی کر دینی ہوگی۔ ہم مجبور ہو جائیں گے۔ آپ ذرا عقل سے کام لیں۔"

رجب علی کو عقل آگئی۔ اگر وہ شبانہ کی طرح لگ رہی تھی تو اسے شبانہ تسلیم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تسلیم کرنے کا مطلب اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا۔

اسٹیج پر کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ حمید اللہ نے وہاں پہنچ کر محبوب سے کہا۔

"میاں صاحبزادے! تم دولہا تو بن گئے ہو مگر تمہارے ہاتھ میں مہندی نہیں لگی ہے۔ اندر عورتیں مہندی کی رسم ادا کرنا چاہتی ہیں۔ تم اندر جاؤ' تمہیں تھوڑی دیر بعد بلا لیا جائے گا۔"

دو آدمی محبوب کے آس پاس آکر کھڑے ہوگئے اور اس سے چلنے کے لئے کہنے لگے۔ محبوب نے کہا۔ "نہیں' میں اپنی مونا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

حمید اللہ نے سمجھایا۔ "ابھی تمہارا نکاح پڑھایا جائے گا اس کے بعد یہ تمہاری دلہن ہو جائے گی۔ شادی سے پہلے ضد نہ کرو' ورنہ پھر ہم یہ شادی نہیں ہونے دیں گے۔"

وہ اس دھمکی سے متاثر ہو کر ان آدمیوں کے ساتھ کوٹھی کے اندر عورتوں میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دلہن اپنا گھونگھٹ ہٹا کر بڑے اچھے انداز میں لباس کو درست کرتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رجب علی نے کھڑے ہو کر پوچھا۔ "جناب چوہدری صاحب! کیا واقعی محبوب کی شادی اس لڑکی سے کرائی جائے گی۔ یہ مہندی کی رسم ادا کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

حمید اللہ نے کہا۔ "مسٹر رجب علی! تمہیں جو کچھ کہنا ہو' اسٹیج پر آکر کہو۔"

رجب علی اور اعظم دونوں وہاں سے اسٹیج پر آگئے۔ انہوں نے ایک نظر اس لڑکی کو دیکھا' پھر رجب علی نے اپنا سوال دہرایا۔ حمید اللہ نے کہا۔ "ہاں' ابھی سب کے سامنے ان کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ قاضی صاحب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ قاضی صاحب! آپ اسٹیج پر تشریف لائیں اور ایک کرسی پر بیٹھ جائیں۔"

رجب علی نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ محبوب کے والد مرحوم نے وصیت میں لکھا ہے کہ محبوب کی شادی میری بیٹی شبانہ سے ہوگی۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "اور تم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری بیٹی کی شادی محبوب سے ہو۔ اسی لئے باپ بیٹے نے شبانہ کو گم ہو جانے پر مجبور کر دیا۔"

رجب علی نے کہا۔ "جناب! آپ بہت بڑے آفیسر ہیں لیکن یہ بہت غیر ذمہ داری کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں۔ کیا یہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو خواہ مخواہ کہیں گم کر دے گا؟"

"خواہ مخواہ نہیں بلکہ خاص مقصد کے تحت۔ منصوبہ یہ تھا کہ محبوب کی شادی کبھی نہ ہونے پائے۔ شادی ہونے کا مطلب یہ ہوتا کہ محبوب کی دیکھ بھال اور گھر کے اخراجات سب کچھ شبانہ کے ہاتھ میں آجاتے اور تم باپ بیٹے بالکل خالی ہوجاتے۔ تمہاری سرپرستی برائے نام رہتی۔ تمہارے ہاتھ میں وہ بڑی بڑی رقمیں نہ آتیں جن کے ذریعے تم محبوب کی پرورش کر رہے ہو۔"

اعظم نے کہا۔ "آپ بڑے آدمی ہیں۔ قانون کے محافظ ہیں' جو چاہیں الزام لگا سکتے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہمارے دل میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ میرے ڈیڈی نے پوری ذمہ داری سے اپنی سرپرستی کے فرائض انجام دیئے ہیں' جس کا ثبوت یہ ہے کہ محبوب ایک صحت مند جوان کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔ کوئی فکر اس کے قریب پھٹکنے نہیں پاتی۔ وہ بیمار پڑتا ہے تو ہم ساری ساری رات اس کے سرہانے جاگ کر گزار دیتے ہیں۔"

"چلو' مان لیا کہ تم دونوں نیک اور دیانت دار ہو' اور وصیت کی رو سے تم دونوں کو محبوب اور شبانہ کی شادی پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

رجب علی نے کہا۔ "ہاں' میری بیٹی شبانہ مجھے مل جائے گی تو میں اسی دن محبوب کی شادی اس سے کرا دوں گا۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کھڑی ہوئی ہے۔ تم کیسے باپ ہو کہ اپنی اولاد کو نہیں پہچان سکتے۔"

رجب علی اور اعظم نے گھوم کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ان کی طرف منہ کرکے بولی۔ "ڈیڈی! میں شبانہ ہوں۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ بھائی جان سے کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ یہ تو میرے دماغ کو کمزور بنانا چاہتے تھے۔ اپنے ڈاکٹر دوست سے کوئی ایسی دوا حاصل کرنا چاہتے تھے کہ جس کے ذریعے میرا دماغ رفتہ رفتہ کمزور ہوجائے۔ میں بھی محبوب کی طرح بچگانہ زندگی گزارنے لگوں۔ پھر آپ دونوں مجھے اور محبوب کو کٹھ پتلی کی طرح نچاتے اور محبوب کی دولت پر ساری زندگی عیش کرتے رہتے۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ باپ بیٹے اندر ہی اندر بری طرح گھبرا رہے تھے۔ اوپر سے

سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رجب علی کا دل چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے بیٹی کہے اور اسے اپنے سینے سے لگالے لیکن اعظم نے اسی وقت جھلا کر کہا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"یہ جھوٹ نہیں ہے بھائی جان! اس رات آپ کے بیڈ روم میں' ڈیڈی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور آپ دونوں یہی باتیں کر رہے تھے جو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ اس وقت میں اسی کمرے میں پلنگ کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ میں اور محبوب آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ وہ مجھے تلاش کر رہا تھا اور میں نے اس سے چھپنے کے لئے اسی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔"

اعظم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بہت اچھی کہانی بنائی گئی ہے۔ اب ہماری بہن شبانہ تو رہی نہیں' تم شبانہ بن کر جو کہو گی' اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

شبانہ نے کہا۔ "ہاں' ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ اس وقت میں گیارہ برس کی تھی۔ اگرچہ میں ذہین سمجھی جاتی تھی مگر بعض حالات میں بچوں کی ذہانت کام نہیں کرتی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں' لیکن خطرے کو سمجھ گئی تھی۔ آپ لوگ جب تک کمرے میں موجود رہے میں وہیں چھپی رہی۔ آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں وہاں سے نکلی۔ میں نے محبوب کو سمجھایا۔ دیکھو' یہ لوگ تمہاری طرح میرا بھی دماغ کمزور بنا دیں گے۔ یہ بھائی جان میرے دشمن ہیں۔ میرے ڈیڈی کو میرے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور ڈیڈی بھی بھائی جان کی باتوں میں آرہے ہیں۔ وہ محبت سے میرے لئے سوچتے بھی ہیں اور بھائی جان کے مشوروں کے آگے جھکتے بھی ہیں۔ یہاں خطرہ ہے ہمیں بھاگ جانا چاہئے۔" وہ ذرا توقف کے بعد بولی۔ "محبوب بچپن ہی سے میری ممی کو ماں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ ممی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے سمجھانے لگے کہ گھر چھوڑ کر بھاگنا بری بات ہے۔ اچھے بچے ایسا کام نہیں کرتے۔ پھر میں نے سوچا کہ محبوب کو اپنا راز دار نہیں بنانا چاہئے۔ وہ کسی وقت بھی میرے بھاگنے کی بات آپ لوگوں کے کانوں میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے محبوب کو بہلانا پھسلانا شروع کیا۔ دوسری باتوں میں لگا دیا اور یہ

بات ان کے دماغ سے نکال دی کہ میں نے انہیں بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب ہم پہاڑی علاقے میں پہنچے تو میں نے صبح ہونے سے پہلے وہ کاٹیج چھوڑ دیا۔"

اعظم نے کہا۔ "کیا خوب۔ تو تم وہاں سے بھاگ گئیں اور دس برس کے بعد جوان ہو کر اس جادوئی ڈبے سے نکل آئیں۔"

شبانہ نے جواب دیا۔ "میں دس برس پہلے ہی آجاتی لیکن اس وقت کچھ میری کم عمری اور نادانی نے مجھے سوچنے اور سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ میں چاہتی تو اپنے انکل وکیل حشمت بیگ کے پاس چلی جاتی لیکن اس لئے نہیں گئی کہ بھابی کا میکہ ان کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ مجھے اس بات کا ڈر لگا کہ بھابی نے دیکھ لیا تو پھر مجھے تمہارے پاس پہنچا دیں گی۔ ہمارے یہ چوہدری انکل ان دنوں ہمارے قریب نہیں رہتے تھے۔ ان کا کہیں تبادلہ ہو گیا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ یہ کہاں ہیں؟ لہٰذا کاٹیج سے بھاگنے کے بعد میں ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں ایک سفید رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کا پچھلا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ اور اگلی سیٹ کے درمیان چھپ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مرد اور عورت کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں اگلی سیٹ کے دروازے کھول کر بیٹھ رہے تھے۔ پھر گاڑی چل پڑی۔ میں چھپی رہی۔ پتا نہیں وہ گاڑی کتنے فاصلے طے کر رہی تھی۔ کتنے گھنٹے گزرتے جا رہے تھے۔ میں اکڑوں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی رونے لگی۔ میری آواز سنتے ہی اچانک گاڑی رک گئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ اس کے بعد مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ لوگ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ میرے دماغ کو کمزور بنانا چاہتے ہیں۔

اس شخص نے کہا۔ "یہ لڑکی سہمی ہوئی ہے اور مصیبت کی ماری ہے۔ ضرور اس کے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ چلو، ہم اسے کسی پولیس اسٹیشن میں پہنچا دیتے ہیں۔"

عورت نے پچھلی سیٹ پر پہنچ کر مجھے اٹھایا اور اپنے پاس بٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر مجھے تھپکنے لگی۔ پھر اپنے شوہر سے کہا۔ "نہیں، میں اسے پولیس اسٹیشن نہیں لے جاؤں گی۔ یہ میری بیٹی ہے۔ ہم اسے گھر لے جائیں گے۔"

مرد اور عورت کے درمیان بحث ہونے لگی۔ بالآخر عورت جیت گئی۔ مرد نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم اولاد کے لئے ترستی ہو۔ چلو، اس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک بیٹی دے دی۔ تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔"

شبانہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھیں پہلی قطار میں جو خاتون بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کے پاس جو صاحب ہیں، وہی میرے ممی اور ڈیڈی ہیں۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے۔"

شبانہ نے جس طرف اشارہ کیا تھا، حمید اللہ نے اُدھر مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مسٹر سرفراز! آپ اسٹیج پر تشریف لائیں اور اپنا بیان دیں۔"

سرفراز نے اسٹیج پر پہنچ کر کہا۔ "یہ درست ہے۔ میں نے اپنی اس بیٹی کو، اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر پایا۔ یہ ایک طرح کا جرم ہے کہ میں نے اسے اس کے والدین تک نہیں پہنچایا۔ اس کی بھی وجہ میری بیٹی بتا چکی ہے۔ یہ سہمی ہوئی تھی، اور اپنے باپ اور بھائی کو دشمن سمجھتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کسی اور سرپرست کے پاس پہنچایا جائے تو اس نے انکار کر دیا۔ گیارہ برس کی عمر میں اس نے اپنے طور پر جو داستان سنائی، اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس بچی کو اعلیٰ علیم دلانی چاہئے تاکہ جب یہ گھر واپس جائے تو اپنے بچگانہ منگیتر کے لئے ایک ڈھال بن جائے اور صحیح معنوں میں اپنے شوہر کی حفاظت کر سکے۔ آج میں نے اسے اس قابل بنا دیا ہے آپ اس کے والد ہیں اور آپ اس کے بھائی ہیں۔ اسے شبانہ تسلیم کریں یا نہ کریں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کوئی کنگال یا محتاج لڑکی نہیں ہے۔ یہ ہماری بیٹی ہے۔ دولت کے لالچ میں آپ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے شبانہ بن کر نہیں آئی ہے۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "مسٹر رجب علی! یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے سامنے یہ اتنے تماشائی بیٹھے ہوئے ہیں، یہ عام لوگ ہیں۔ نہیں، یہ سب کے سب پولیس اور انٹیلی جنس کے لوگ ہیں، اور انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ کیا ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے اور کس طرح تم باپ بیٹے کو بے نقاب کرنا ہے۔ کیا تم اسے اپنی بیٹی تسلیم کرتے ہو؟"

رجب علی نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایک باپ ہوں۔ ایسا باپ جو اپنی

بیٹی کو کھو چکا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو بھاگنے پر مجبور نہیں کیا لیکن دس برس بعد کوئی بھی لڑکی میرے سامنے آکر یہ کہے گی کہ ڈیڈی! میں آپ کی شبانہ ہوں تو ایک باپ کا تڑپتا ہوا دل اسے تسلیم کرے گا۔ خواہ وہ میری بیٹی ہو یا نہ ہو۔ میں اسے اپنی بیٹی شبانہ تسلیم کرتا ہوں' لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ ثبوت کیا ہے' تو نہ میرے پاس ثبوت ہے' نہ اس لڑکی شبانہ کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہوگا جس سے یہ میری بیٹی ثابت ہو سکے۔"

شبانہ نے کہا۔ "یہ درست ہے۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میرے جسم پر بھی کوئی ایسا پیدائشی نشان نہیں ہے' جس کو ہم تمام خاندان والے بچپن سے جانتے ہوں۔"

اعظم نے کہا۔ "میں تمہیں کسی حال میں اپنی بہن تسلیم نہیں کروں گا۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "بے شک تم باپ بیٹے اسے کبھی نہیں اپناؤ گے کیونکہ اسے تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لڑکی سچی ہے۔ جب یہ سچی ہے تو جو الزامات تم باپ بیٹے پر عائد کر رہی ہے' وہ بھی درست ہیں۔ ان الزامات سے بچنے کا تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ اسے شبانہ تسلیم نہ کیا جائے۔"

رجب علی شاید پدرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے بیٹی تسلیم کر لیتا لیکن اس کے لالچی دماغ نے اسے سمجھایا کہ بیٹی تسلیم کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے' اگر تسلیم نہ کیا جائے تب بھی وہ ایسے دولت مند ماں باپ کو پا چکی ہے کہ کسی کی محتاج نہ رہے گی۔ ساری زندگی عیش و عشرت سے گزارے گی۔ ہاں' اگر بیٹی تسلیم کر لیا جائے تو یہ ابھی سے ہم پر الزامات لگا رہی ہے آئندہ پتا نہیں کیا کیا گل کھلائے گی۔ ہمیں کہیں کا نہیں رکھے گی۔ اس نے حمید اللہ کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالیٰ! ہم آپ کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اگر مجرم نظر آرہے ہیں تو ہمیں سزا سنا دیجئے یا ہمیں جیل بھیج دیجئے۔ مگر ہم کسی ثبوت کے بغیر اسے شبانہ تسلیم نہیں کریں گے۔"

اعظم نے کہا۔ "اور جو الزامات ہم پر لگائے جا رہے ہیں اگر اس کے ثبوت موجود ہوں تو ہم ہر طرح سے سزا پانے کو تیار ہیں۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "تم دونوں باپ بیٹے اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ ہم نے تم پر

پوری توجہ نہیں دی۔ میرا تبادلہ ہوا۔ میں تم لوگوں سے دور چلا گیا اور وکیل حشمت بیگ صاحب اپنی مصروفیات کے باعث صرف مرحوم تراب علی کے کاروبار کی طرف ہی توجہ دے سکتے تھے۔ تمہارے گھر کی طرف بہت کم آتے تھے' اس لئے تم لوگوں کو بہت کھل کر کھیلنے کا موقع ملا اور اپنے خلاف تم لوگوں نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' اس وقت محض الزامات ہیں۔ شاید آگے چل کر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مقتولہ فیروزہ اور مقتولہ نجمہ کے قاتل کون لوگ ہیں۔"

اعظم نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "کیا یہ الزام بھی آپ ہمارے سر لادنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یاد رکھو' مجرم صرف ثبوت اور گواہ کے ذریعے گرفت میں نہیں آتے۔ بعض حالات میں وہ قانون کی گرفت سے نکل جاتے ہیں مگر قدرت کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ انہیں ان کے کئے کی سزا ضرور ملتی ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "جناب! میری بیٹی یہاں بیٹھی ہوئی ہے اور مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اسے عورتوں میں بھیج دیجئے اور نکاح کی تیاری کیجئے۔"

رجب علی اور اعظم نے اسٹیج سے واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اس شادی میں شریک نہیں ہوں گے۔ ہم وصیت کے مطابق عدالت سے انصاف مانگیں گے۔"

حمید اللہ نے کہا۔ "ٹھہر جاؤ رجب علی! جانے سے پہلے یہ سن لو۔ مقدمہ ہم بھی لڑنا جانتے ہیں لیکن آج جب محبوب کی شادی شبانہ سے ہو جائے گی تو اس گھر کے تمام اخراجات شبانہ کے ہاتھ میں ہوں گے اور ہم پہلی فرصت میں عدالت سے یہ اجازت نامہ حاصل کریں گے کہ محبوب کی منکوحہ کو اس کے مرحوم سسر تراب علی کی کوٹھی میں رہنے کی اجازت ملنی چاہئے اور اس کے دشمنوں کو وہاں سے نکال دینا چاہئے۔ جب تک مقدمے کا فیصلہ نہ ہو تم لوگ اس کوٹھی میں قدم نہیں رکھ سکو گے۔"

دونوں باپ بیٹے پھر اسٹیج پر واپس آگئے۔ رجب علی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہر طرف قانون کے محافظ ہیں۔ دانشوروں نے کہا ہے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے ابھی ابھی یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ ہم تو غریب لوگ

ہیں۔ محبوب کے ملازم ہیں جو اس کے بچپن سے اب تک اس کی پرورش کرتے رہے بدنامیاں اٹھاتے رہے۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ ہم عدالت میں اس کیس کو جائیں اور یہ کیس طویل ہوتا جائے اور ہم مقدمہ ہارتے جائیں۔ یہ سب کھیل دولت ہے اور ہم آج یہیں پر شکست تسلیم کرتے ہیں۔ اگر اس لڑکی سے محبوب کی شادی ہ ہے تو ہم انکار نہیں کریں گے لیکن کسی ثبوت کے بغیر اسے شبانہ تسلیم نہیں کریں گے۔

کسی طرف سے آواز آئی۔ ”شبانہ کے عائد کردہ الزام سے بچنے کا یہی ایک طر ہے۔“

چوہدری نے کہا۔ ”رجب علی! تم نے اس شادی میں شریک ہونے کا دانشمند فیصلہ کیا ہے۔ شریک نہ ہوتے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تک شبانہ تمہاری ز سے دور رہی' اس وقت تک تم لوگوں نے اپنی من مانی کرلی۔ آج نکاح کے بعد سے دونوں کی بدبختی کا دور شروع ہوجائے گا۔“

واقعی ان کے لئے نہ جائے رفتن' نہ پائے ماندن والی بات تھی۔ وہ اسے شبانہ ت کرتے تو بہت سے الزامات کی تصدیق ہونے لگتی اور شبانہ تسلیم نہ کرنے سے نقصان تھا کہ وہ بہو بننے کے بعد کبھی اپنی بن کر نہ رہتی۔ جب اسے پرایا کہا گیا تھا تو پھر وہ پر بن کر ہی ان سے جو چاہتی سلوک کرتی۔

بہرحال نکاح پڑھا دیا گیا۔ رخصتی کے وقت دولہا' دلہن کو ایک الگ کار کی پچ سیٹ پر بٹھایا گیا۔ ان کے ساتھ دو لیڈی کانسٹیبل بیٹھ گئیں۔ اعظم کی بیوی کو بھی دو دلہن کے پاس بیٹھنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ اپنے شوہر اعظم اور سسر رجب علی کے ساتھ کر گھر تک گئی۔ راستے میں وہ تینوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے اور سمجھتے رہے کہ ا طرح اب ان کی نگرانی کی جارہی ہے۔ نکاح کے بعد دلہن کی کوئی رشتے کی لڑکی دلہن ساتھ سسرال آتی ہے مگر یہاں لیڈی کانسٹیبل ساتھ لگادی گئی تھی۔

کوٹھی پہنچتے ہی محبوب شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”میرے کمرے میں چلو۔ بہت کھلونے ہیں۔ بڑا مزا آئے گا۔ آؤ' میں تمہیں اچھے اچھے کھلونے دکھاتا ہوں۔“

شبانہ نے گھونگھٹ کو الٹ کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ تو زندگی بھر کھیلتی رہوں گ

پہلے اپنے بڑوں کے ساتھ کچھ کھیل ہوجائے۔“

اس نے ایک لیڈی کانسٹیبل سے کہا۔ ”باورچی خانے کی نگرانی تمہارے ذمے ہے۔ وہاں جاؤ اور کسی کو باورچی خانے میں داخل نہ ہونے دو۔ باورچی کو بھی وہاں سے نکال دو۔“

رجب علی نے کہا۔ ”بیٹی! یہ کیا کررہی ہو۔ پھر پکائے گا کون؟“

”آپ کے منہ سے بیٹی کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ میں اس گھر میں بہو بن کر آئی ہوں۔ مجھے بہو کے رشتے سے پکاریں۔ پکارنا نہ آئے تو شبانہ کہہ دیں۔ رہ گیا یہ کہ پکائے گا کون؟ تو ابھی شام سے پہلے میرے والدین کے گھر سے دو ملازمائیں آئیں گی اور ایک ملازم ہوگا۔ وہ تینوں اس گھر کو سنبھال لیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میں سے کوئی باورچی خانے میں جائے اور ہمارے کھانے کی چیزوں میں کوئی ایسی دوا ملائے جس سے میرا ذہن بھی محبوب کی طرح کمزور ہوجائے' اِز اِٹ کلیئر؟“

سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس بار اس نے محبوب کا ہاتھ پکڑا اور اسے آگے لے جاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں' تو تمہارا کمرہ کون سا ہے؟“

محبوب نے اپنے کمرے تک رہنمائی کی' پھر وہ دونوں دروازے کے پیچھے کمرے میں بند ہوگئے۔ ایک لیڈی کانسٹیبل باورچی خانے کی طرف گئی اور ایک وہاں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔

اعظم کی بیوی طنطناتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ اس کے پیچھے اعظم نے آکر کہا۔ ”غصہ دکھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بہت ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہوگا کہ اب ہم اپنا بچاؤ کیسے کرسکتے ہیں؟“

اس کی بیگم نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کردیا۔ پھر چابی نکالی اور آہنی الماری کھولنے لگی۔ الماری کے نچلے خانے میں ایک بڑا سا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کو نکال کر پلنگ پر رکھا۔ پھر اس الماری سے تمام زیورات سمیت کر اس سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

اعظم نے پوچھا۔ ”یہ کیا کررہی ہو؟“

"یہ حفاظتی تدبیر ہے۔ عورت خطرے کے وقت سب سے پہلے اپنے زیورات کو بچاتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ اس دلہن نے گھر میں قدم رکھتے ہی باورچی خانے پر پہرہ بٹھا دیا' اب وہ آہستہ آہستہ پورے گھر پر قبضہ کرلے گی۔ پھر اس الماری سے زیورات سمیٹ کر لے جائے گی۔ کیا تم یہ ثابت کرسکتے ہو کہ تم نے اپنی زندگی میں کبھی محنت مزدوری کی ہے اور اپنی کمائی سے یہ دولاکھ روپے کے زیورات بنوائے ہیں؟"

اعظم نے اپنا سر کھجاتے ہوئے' سوچنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا۔ آج تک ان زیورات کا حساب کسی نے نہیں کیا لیکن گھر کی بہو کر سکتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ میں نے اور ڈیڈی نے نہ کبھی ملازمت کی' نہ ہی کوئی کاروبار کیا' جو چھوٹا موٹا سا کاروبار کیا اس میں نقصان اٹھایا۔ یہ آنے والی ثابت کردے گی کہ یہ تمام زیورات اس کے سسر کی رقم سے بنائے گئے ہیں۔"

بیگم نے تمام زیورات سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھ لئے ایک دستاویز بھی رکھ لی۔

اعظم نے کہا۔ "وہ دوسری دستاویز بھی رکھ لو۔"

"وہ دوسری دستاویزات تمہارے اور تمہارے ڈیڈی کے نام سے ہیں' تم باپ بیٹے سوچو کہ ان دستاویزات کا حساب کیسے دو گے۔ کیسے ثابت کرو گے کہ جو پلاٹ خرید کر رکھے ہوئے ہیں وہ تمہارے اپنے ہیں اور اپنی رقم سے خریدے گئے ہیں۔ رہی یہ دستاویز تو میں ثابت کروں گی کہ اسے میرے ماں باپ نے میرے لئے خریدا تھا۔" پھر وہ ایک جھٹکے سے سوٹ کیس کو بند کرتے ہوئے بولی۔ "اب آپ کمرے سے باہر جاکر دیکھیں' وہ دونوں لیڈی کانسٹیبل اپنی اپنی جگہ ڈیوٹی پر ہیں یا نہیں؟ میں ادھر پچھلے دروازے سے چپ چاپ نکل جاؤں گی۔ یہ تمام مال اپنے میکے میں لے جاکر رکھوں گی۔ یہ منحوس دلہن وہاں آکر ان پر اپنا حق جتا نہیں سکے گی۔"

اعظم دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ اس کی بیگم نے دروازے کو پھر بند کردیا۔ ایک ذرا سا کھول کر آنکھ لگا کر باہر دیکھتی رہی۔ اعظم ادھر جارہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا پھر سوٹ کیس اٹھا کر پچھلے دروازے کو کھول کر پائیں باغ کی طرف نکل گئی۔

اعظم نے پہلے باورچی خانے کی طرف جاکر دیکھا۔ وہاں ایک لیڈی کانسٹیبل موجود

تھی۔ اس کانسٹیبل نے دور ہی سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ "یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر دولہا دلہن کے کمرے کی طرف گیا۔ وہاں دوسری کانسٹیبل کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر سے شبانہ اور محبوب کے ہنسنے' کھلکھلانے کی آوازیں آرہی تھیں' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کمرے کے اندر کبھی دوڑ رہے ہوں' کبھی اچھل رہے ہوں اور کبھی باتیں کر رہے ہوں' اور ہر بات پر قہقہے لگا رہے ہوں۔ دوسری لیڈی کانسٹیبل نے بھی ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ وہاں سے بھی پلٹ کر ڈرائنگ روم میں آیا وہاں اپنے ڈیڈی سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے رازداری سے کہا۔ "آپ کی بہو تمام زیورات لے کر میکے جارہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"وہ بہت اچھا کر رہی ہے۔ کچھ تو ہماری رقم کہیں محفوظ رہے گی۔ آؤ بہو سے باتیں کرتے ہیں۔ اسے اور بھی بہت کچھ سمجھانا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ زیورات یہاں سے لے جاتے وقت وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس کمرے میں پہنچے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے لاک نہیں تھا۔ اسے کھول کر وہ دونوں کمرے میں آئے تو بہو نہیں تھی۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رجب علی نے کہا۔ "یہ کہاں چلی گئی؟"

اعظم نے آگے بڑھ کر پچھلے دروازے سے نکل کر دور تک پائیں باغ میں دیکھا' وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے پلٹ کر واپس آتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے وہ جلدی میں نکل گئی ہے۔ میرا انتظار نہ کر سکی۔"

"چلو' کوئی بات نہیں۔ مگر تم پریشان کیوں نظر آرہے ہو؟"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی! عورت پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ تقریباً دولاکھ کے زیورات لے گئی ہے اور جو دستاویز اس کے پاس ہے اس کے مطابق وہ اس پلاٹ کی مالک ہے جس کی قیمت آج کل ایک لاکھ روپے تک پہنچی ہوئی ہے۔"

"بیٹے! ابھی حالات ایسے ہیں کہ تمہیں اپنی بیوی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ یہ جو آئی ہے' یہ تو ہمارے پاس ایک تنکا بھی نہیں رہنے دے گی۔ بہو سے تو امید ہے کہ وہ ہمارا منہ دیکھ

کر' ہمارے رشتے کا احترام کرکے کچھ تو ہم سے وفاداری کرے گی۔ کچھ نہ سہی' ہم نے اسے جو لاکھوں روپے کے زیورات خرید کر دیئے ہیں اور اسے لاکھ روپے کا پلاٹ دیا ہے تو یہ احسان ضرور مانے گی۔"

انہیں کمرے کے باہر محبوب کی آواز سنائی دی۔ وہ پکار رہا تھا۔ "چاچا جی آپ کہاں ہیں۔ بھائی جان کہاں ہیں؟"

وہ آوازیں دیتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "چاچا جی! وہ مجھ سے نہیں کھیلتی ہے۔ بہت ستاتی ہے' بہت پریشان کرتی ہے۔"

دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اعظم نے کہا۔ "تم جسے دلہن بنا کر لائے ہو' وہ بہت مکار اور دھوکے باز ہے۔ وہ تمہاری دوست بننے کے قابل نہیں ہے۔ وہ تمہیں اسی طرح ستائے گی اور پریشان کرے گی۔"

محبوب نے سینہ تان کر کہا۔ "خبردار بھائی جان! میری دلہن کو کچھ نہ کہنا۔ میری دلہن نے مجھے سکھا دیا ہے کہ کوئی اس کی برائی کرے گا تو مجھے غصہ آجانا چاہئے۔ اس لئے ابھی مجھے غصہ آرہا ہے۔"

رجب علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "نہیں بیٹے! کوئی تمہاری دلہن کی برائی نہیں کرے گا' جاؤ کھیلو۔"

"کیسے کھیلوں' وہ کہتی ہے پہلے گھر کی تمام چابیاں لے کر آؤ اور الماری کی بھی جس میں زیورات رکھے ہوئے ہیں۔ تب وہ مجھے کھیلنے کی اجازت دے گی۔"

اعظم نے پوچھا۔ "کیا تم بزدل ہو۔ اپنی دلہن سے ڈرتے ہو۔ وہاں جتنے کھلونے ہیں سب تمہارے ہیں۔ زبردستی اس سے چھین کر کھیل سکتے ہو۔"

"نہیں' وہ کہتی ہے کہ جو بھی کھیل ہوتا ہے' محبت سے ہوتا ہے۔ چھیننے جھپٹنے سے نہیں ہوتا۔ میں کیا کروں۔ وہ ایک ایک کھلونا دکھاتی ہے' پھر چھپا لیتی ہے۔ میں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ہاتھ لگانے نہیں دیتی۔ بولتی ہے پہلے چابیاں لے کر آؤ۔"

اعظم سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چابیاں دینے سے انکار کر سکتے تھے لیکن آج نہیں تو کل ساری چابیاں گھر کی بہو کے ہاتھ میں جانے والی تھیں۔ انکار کرنا فضول تھا۔ یوں بھی

جو اصل مال تھا وہ پار ہو چکا تھا اس نے کرسی سے اٹھ کر دو چابیوں سے وہ آہنی الماری کھولی جو اب تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ وہاں اب دستاویزات' کچھ اور ضروری سامان کے علاوہ شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک دراز کھول کر اس میں سے مکان کے مختلف کمروں کی چابیاں نکال کر تمام چابیاں محبوب کے ہاتھوں میں رکھ دیں۔ وہ خوش ہو کر چلا گیا۔

رجب علی نے کہا۔ "بیٹے! سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم حالات کو کیسے قابو میں کریں۔ شبانہ بہت بری طرح ہماری مخالفت کرے گی۔ دشمنوں سے بڑھ کر دشمن بنے گی۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"بگاڑنے کو تو میں بہت کچھ بگاڑ دوں مگر ابھی صبر کروں گا۔ کوشش کروں گا کہ اس لڑکی کا انجام فیروزہ اور نجمہ جیسا نہ ہو۔ کیونکہ تمام پولیس والے ہم پر ہی شبہ کریں گے۔ ڈیڈی! ہم صبر کریں گے۔ جس حد تک اس لڑکی کے سامنے جھک سکتے ہیں' جھکتے رہیں گے لیکن اس نے ہمیں گھر سے نکالا' ہمیں دربدر کا بنا دیا اور ہمیں پیسے پیسے کا محتاج کیا تو ایسی مفلسی اور ذلت کی زندگی گزارنے سے بہتر میں یہی سمجھوں گا کہ اسے قتل کر کے پھانسی پر چڑھ جاؤں۔"

رجب علی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آہ' یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم اپنے ہی خون کے دشمن بن رہے ہیں۔ دشمنی نہ کریں تو وہ ہم سے دشمنی کرے گی کیونکہ اس کی ابتدا بھی ہم نے ہی کی تھی۔"

"ڈیڈی! وہ ہماری کوئی نہیں ہے۔ آپ جیسے جیسے بوڑھے ہو رہے ہیں' آپ کا دل کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ آپ بیٹی کی محبت میں کسی کو بھی بیٹی بنا لیں تو یہ سراسر حماقت ہوگی۔ آپ کی پدرانہ محبت میرے لئے مصیبت بن جائے گی۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کی ساری محبت میرے لئے ہونی چاہئے۔ کسی ایسی لڑکی کے لئے نہیں جو خواہ مخواہ ہماری شبانہ بننے کی کوشش کرتی رہی۔ جب ہم نے ثبوت مانگا اور وہ ناکام ہوئی تو جبراً محبوب کی دلہن بن کر آگئی۔ آپ سازش کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ اعظم بوتل کھول کر پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ رجب

علی کبھی اپنے کمرے میں جا رہا تھا کبھی بیٹے کے کمرے میں آ رہا تھا' کبھی ڈرائنگ روم ی
جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے اندر بے چینی' جھنجھلاہٹ گھبراہٹ اور نہ جانے کیسی کیسی ہلچ
مچی ہوئی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد شبانہ اپنے شوہر کے کمرے سے نکلی تو اس کا لباس بدلا ہ
تھا۔ وہ بڑی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ رجب علی کو دیکھ کر بولی۔ "آپ کے صاحبزاد
کہاں ہیں؟"

رجب علی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آؤ بیٹی بیٹھ
چلو اپنے بھائی جان کے کمرے میں چلو۔"

شبانہ نے تیور بدل کر کہا۔ "دیکھئے بڑے میاں! میں پہلے بھی آپ کو سمجھا چکی ہوا
نہ میں آپ کی بیٹی ہوں' نہ اس ظالم سنگدل کی بہن ہوں۔ اگر ہوں تو چلیں قانون ک
محافظوں کے سامنے' مجھے اپنی بیٹی اور بہن تسلیم کر لیں۔"

رجب علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! کیا ضروری ہے کہ ساری دنیا کے سا
تسلیم کیا جائے۔ ہمارا رشتہ خون کا رشتہ ہے۔ ہم تمہیں دل سے اپنا تسلیم کرتے ہیں۔"

"بڑے میاں! میں محبوب نہیں ہوں کہ آپ مجھے لچھے دار باتوں سے بہلا دیں گے
چلئے ذرا اپنے بیٹے کے کمرے میں چلئے۔ میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ آگے آگے چلتا ہوا اعظم کے کمرے میں داخل ہوا۔ اعظم ایک کرسی پر بی
سامنے میز پر بوتل اور گلاس رکھے ہوئے پی رہا تھا۔ شبانہ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کر کھ
ہو گیا۔ شبانہ نے ناگواری سے شراب کی بوتل کو دیکھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس
خلاف توقع مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر اعظم! آپ روزانہ کتنی پی لیتے ہیں؟"

اعظم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آدھی بوتل۔"

"بس' صرف آدھی بوتل۔ اگر تم میرے سامنے یہ پوری بوتل پی جاؤ تو کل سے م
تمہارے لئے روز ایک بوتل کا کوٹہ مقرر کر دوں گی۔ تمہیں اپنی جیب سے بوتل نہی
خریدنی پڑے گی۔" اعظم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "مجھ پر یقین کرو۔ م
دشمنوں کی دشمن ہوں اور دوست بنانا بھی جانتی ہوں' اس لئے تمہارا کوئی نقصان نہی
کروں گی۔ پہلا فائدہ یہی پہنچا رہی ہوں۔ چلو' پی کر دکھاؤ۔"

اعظم نے بوتل اٹھائی اور گلاس کو پوری طرح بھر دیا۔ پھر اسے اٹھا کر' ٹھہر ٹھہر کر
پینے لگا۔

شبانہ نے رجب علی سے پوچھا۔ "بڑے میاں! کیا آپ شوق نہیں فرماتے ہیں؟"

وہ عاجزی سے بولا۔ "نن.......... نہیں بیٹی! میں کبھی نہیں پیتا۔"

"اچھا۔ صرف بیٹے کو پلاتے ہیں۔ چلئے یہ چابیاں لے کر اس الماری کو کھولئے۔"

رجب علی نے اس سے چابیاں لیں۔ پھر الماری کو کھول دیا۔ شبانہ نے آگے بڑھ کر
الماری کو پوری طرح کھولتے ہوئے دیکھا۔ پھر سر ہلا کر بولی۔ "اچھا' تو اسی لئے بیگم اعظم
نظر نہیں آ رہی ہیں۔ مال سمیٹ کر انہیں بھیج دیا گیا ہے۔"

"کیسا مال؟" رجب علی نے حیرانی کا اظہار کیا۔ اعظم بیٹھ کر پی رہا تھا۔ اس پر نشہ
طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے جھومتے ہوئے کہا۔ "الماری میں کوئی مال وال نہیں تھا۔ بس
جو سامنے ہے' وہی کچھ ہے۔ تم کو یقین نہیں ہے تو جاؤ' جو کرنا چاہتی ہو کر لو۔ ہم تم سے
ڈرتے نہیں ہیں۔"

شبانہ نے کہا۔ "شاباش' پینے کا ایک فائدہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی نشے میں دلیر ہو جاتا
ہے حالانکہ نشے سے پہلے تم مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھ سے ڈر رہے
تھے۔"

اعظم نے گلاس میں بچی ہوئی شراب کو ایک سانس میں حلق سے اتارا۔ پھر اس
گلاس کو میز پر زور سے پٹختے ہوئے کہا۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں دلیر ہوں۔"

"ہاں' نشہ میں آدمی دلیر بھی ہوتا ہے اور سچا بھی۔ کیا تم سچے ہو؟"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ہاں' میں سچا ہوں۔"

"تو پھر یہ بتاؤ' تم نے فیروزہ کو گلا گھونٹ کر کیوں ہلاک کیا تھا؟"

وہ اچانک لڑکھڑایا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم خود
کو بہت چالاک سمجھتی ہو۔ تم سمجھ رہی تھیں کہ میں نشے کی حالت میں شاید اقرار جرم کر
لوں گا مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ کسی کو ہلاک نہیں کیا ہے۔ تم ہم پر اور نئے
الزامات عائد کرنے کے لئے یہاں آئی ہو؟"

شبانہ نے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ تم شبہہ سے بالاتر ہو۔ ہم سب جانتے ہیں' لیڈ
ڈاکٹر نجمہ کو بھی تم باپ بیٹے میں سے کسی ایک نے قتل کیا ہے۔"

رجب علی نے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھو' میرے بوڑھے کانپتے ہوئے ہاتھو
کو دیکھو۔ یہ مضبوطی سے چاقو نہیں پکڑ سکتے۔ پھر یہ کسی کے سینے میں چاقو کیسے گھونپ
سکتے ہیں؟"

"مفت کی دولت پر عیش کرنے کے لئے بوڑھے ہاتھوں میں بھی توانائی آجاتی ہے۔"

اعظم نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ڈیڈی! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے بوڑھے
ہاتھوں نے قتل نہیں کیا ہے تو میرے جوان ہاتھوں نے کیا ہے۔ آپ صاف طور پر انکا
کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ یہ لڑکی بکواس کر رہی ہے۔"

"مسٹر اعظم! میرے متعلق گفتگو کرتے وقت' آداب اور تہذیب کا پوری طر
خیال رکھو' ورنہ اس کوٹھی سے باہر فٹ پاتھ پر نظر آؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی وہا
سے پلٹ گئی اور تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ ان کی نظروں سے اوجھ
ہوگئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ محبوب کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھی سے باہر جانے لگی۔

اعظم اور رجب علی نے ڈرائنگ روم میں آکر پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

ایک لیڈی کانسٹیبل نے کہا۔ "جہنم کے سوا اور ہر جگہ جا رہی ہیں۔ آپ لوگ فک
نہ کریں۔"

شبانہ کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس والی سیٹ پر محبوب بیٹھ گیا۔ پھ
گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ محبوب نے اس کی طرف بڑی چاہت سے دیکھتے ہو
کہا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ اس لباس میں اور بھی اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ منہ پھلا کر ذرا ناراضگی سے بولی۔ "اچھی لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارا وہ بھا
اعظم مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک دن مجھ
بھی نجمہ کی طرح مار ڈالے گا۔"

محبوب نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "میں بھائی جان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔ کو
تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ اسی لئے تو میں نے سوچا ہے کہ اب
میں دلہن بن کر ساری زندگی تمہارے پاس رہوں گی۔ تم بھی میرے پاس رہو گے نا؟"

اس نے کہا۔ "ہاں' میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتا۔" اس نے اپنا سر شبانہ کے
شانے پر رکھ لیا۔

"ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ اگر مجھ سے محبت ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ
میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں تو جو باتیں سکھایا کروں انہیں سیکھتے جاؤ اور جو باتیں تمہارے
چاچاجی اور بھائی جان سکھائیں ان پر توجہ مت دو۔ ان سے صاف کہہ دو کہ تم ان کی کوئی
بات نہیں مانو گے۔"

"ہاں' میں ان کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔"

"اور اگر مانو گے تو پھر میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی اور نہ ہی تمہیں کھیلنے
دوں گی۔"

محبوب' ونڈ اسکرین کے پار یوں دیکھنے لگا جیسے تصور میں رنگا رنگ کھیل تماشے دیکھ
رہا ہو۔ وہ بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ پھر شبانہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "دیکھو ہم اسی علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ اب بتاؤ' تمہاری بھابی کا
مکان کہاں ہے؟"

محبوب اس کی رہنمائی کرنے لگا۔ وہ اس کے مطابق کار ڈرائیو کرتے ہوئے ایک
مکان کے سامنے رک گئی۔ اعظم کی بیگم نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا تو پریشان
ہوگئی۔ وہ چاہتی تو چھپ سکتی تھی یا وہاں سے بھاگ سکتی تھی لیکن اس کا مطلب یہی ہوتا
کہ وہ تمام زیورات چرا کر فرار ہوگئی ہے۔ اس نے اپنے مکان کا دروازہ کھول دیا۔ شبانہ
نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "میں دشمن بن کر نہیں آئی ہوں۔ اگر دوست بن کر باتیں
کر سکتی ہو تو بہتر ہے' ورنہ میں دروازے سے لوٹ جاؤں گی۔ پھر مجھے جو قانونی کارروائی
کرنی ہوگی' میں کروں گی۔ یاد رکھو' میں تم پر چوری کا الزام عائد کرنے کے بعد مقدمہ ہار
بھی جاؤں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اس کیس کو اتنا طول دوں گی اور عدالت میں
ایسی پیشیاں بھگتاؤں گی کہ جتنے کے زیورات ہیں' اس سے زیادہ رقم تم صرف مقدمہ

لڑتے لڑتے ہار جاؤ گی۔"

بیگم کی ماں نے کہا۔ "بیٹی! ہم کسی سے دشمنی نہیں چاہتے۔ تم بھی میری بیٹی جیسی ہو۔ ابھی ہم نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ تم بتاؤ ہم سے کیا چاہتی ہو؟"

شبانہ نے پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کی بیٹی سے شادی کرنے سے پہلے اعظم کی بیوی کو کسی نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا؟"

"ہاں بیٹا! ہمیں معلوم تھا مگر اس کا تعلق اعظم سے نہیں ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ کیا اعظم اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا؟ آپ نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دیا؟"

بیگم نے کہا۔ "امی! آپ کچھ نہ بولیں' میں شبانہ سے باتیں کرتی ہوں۔ دیکھو شبانہ! سچ پوچھو تو میں اعظم سے کوئی دلی لگاؤ نہیں رکھتی۔ عورت ایسے مرد کو چاہتی ہے جو محبت کرتا ہے۔ اپنی کمائی لا کر عورت کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ شادی کو اتنے برس ہو گئے' میں اپنے شوہر کی کمائی کے لئے ترس گئی۔ ہم محبوب کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اعظم کے ساتھ اب زندگی نہیں گزاروں گی۔ اس سے طلاق لے لوں گی۔"

بیگم کی ماں نے کہا۔ "بیٹی! ایسی بات منہ سے نہ نکالو' شریف زادیوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔"

"کیا مردوں کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ دھوکہ دے کر ایک لڑکی کو بیاہ کر لے جائیں اور اسے دوسروں کا محتاج بنا کر رکھیں۔ یہ جتنے بھی زیورات ہیں' یہ ان کے نہیں ہیں' میرے میکے کے ہیں۔"

شبانہ نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس بارے میں تم سے بحث نہیں کروں گی کہ اس غریب محلے کے' ایک غریب گھر میں لاکھوں روپے کے زیورات کہاں سے آ گئے۔ میں جو چاہتی تھی' وہ بات تمہاری زبان سے نکل گئی ہے۔ اگر تم اعظم سے طلاق لے لو گی تو میں ان زیورات کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ تم سے میری دشمنی ختم ہو جائے گی۔"

بیگم نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

شبانہ نے محبوب کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ وہاں سے پلٹ کر دروازے پر گئی۔ پھر وہاں سے گھوم کر بولی۔ "بس میں ایک بات جانتی ہوں۔ تم اس سے طلاق لے لو۔ دو دن کے اندر طلاق کا نوٹس اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بعد میں کبھی تمہاری طرف رخ نہیں کروں گی۔"

وہ جانے لگی۔ بیگم نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ٹھہرو شبانہ! یہ بتاؤ تم لاکھوں روپے کے زیورات میرے پاس کیوں چھوڑ کر جا رہی ہو۔ کیا اتنی بڑی رقم کی تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں ہے؟"

"نہیں' اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور میرا یہ سہاگ سلامت رہے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ جب تک میں اپنے شوہر کی سلامتی کے تمام انتظامات نہ کر لوں' اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ میں یہ لاکھوں روپے کے زیورات اس لئے بھی دے رہی ہوں کہ اعظم نے تمہاری زندگی برباد کی ہے۔ تم ان روپوں سے اپنے مستقبل کو سنوار سکتی ہو۔ دوسری شادی کر سکتی ہو۔ بہرحال تم میرے ساتھ جو تعاون کرو گی' یہ اس کا انعام ہے۔"

بیگم کی ماں نے کہا۔ "بیٹی! ابھی تم نے کہا ہے کہ میرے داماد نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کیا تھا۔ کیا طلاق کا نوٹس پہنچے گا تو وہ انتقاماً میری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟ اتنی مالیت کے زیورات حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

شبانہ نے کہا۔ "دولت مفت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس کی حفاظت کے لئے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے۔ دشمنوں سے محتاط رہنا پڑتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے پہرے بٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ جو لاکھوں روپے کے زیورات ہیں' اس کی حفاظت آپ لوگ کس طرح کر سکتے ہیں' یہ آپ کا کام ہے۔ میں نہیں جانتی۔ جو جانتی ہوں' وہ میں نے کہہ دیا ہے۔ اس پر فوراً عمل کرو۔"

وہ محبوب کو لے کر وہاں سے چلی گئی۔

☆------☆------☆

دوسرے دن اعظم اپنے سسرال سے واپس آیا تو رجب علی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے' پریشان نظر آرہے ہو؟"

اس نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ کمبخت مجھ سے طلاق مانگ رہی ہے۔"

رجب علی نے چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا؟ کون طلاق مانگ رہی ہے؟"

"وہی بیگم' آپ کی بہو۔ اس نے ہمیں بہت زبردست دھوکا دیا ہے' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

رجب علی نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کرو۔ جو دشمن ہوتا ہے تم اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے۔ آخر کتنوں کو قتل کرو گے۔ بیگم کو سمجھایا تو جاسکتا ہے۔"

"کیا خاک سمجھایا جائے گا۔ وہاں اس نے اپنے دروازے پر محلے کے دو بدمعاشوں کو بٹھا رکھا ہے۔ انہوں نے مجھے گھر کے اندر جانے نہیں دیا۔ میں باہر کھڑا رہا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر بات کی اور دو ٹوک بات کی کہ وہ طلاق چاہتی ہے اگر نہیں دو گے تو کل یا پرسوں تک وکیل کی طرف سے نوٹس مل جائے گا' اور یہ بات عدالت تک جائے گی۔"

شبانہ اور محبوب اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ شبانہ نے محبوب سے پوچھا۔ "محبوب! میں تمہاری یادداشت کو آزمانا چاہتی ہوں۔ بتاؤ تو سہی کل رات ہم کار میں بیٹھ کر کہاں گئے تھے؟"

محبوب نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہم بیگم بھابی کے ہاں گئے تھے۔"

اعظم اور رجب علی چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

شبانہ مسکراتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر اس نے کہا۔ "بھئی یہ تو کچھ نہ ہوا۔ اور تمہیں کیا یاد ہے یہ بتاؤ' میں نے تمہاری بیگم بھابی کو کیا مشورہ دیا تھا؟"

اعظم نے غصے سے شبانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو یہ آگ تم نے لگائی ہے۔ تمہی نے جاکر بیگم کو بھڑکایا ہے۔"

شبانہ نے اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "میں نے تمہاری جان بچائی ہے۔ وہ ان زیورات کی خاطر تمہیں ہلاک کر دینا چاہتی تھی۔ تم مرجاتے تو کوئی اس سے زیورات کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا اتنا بڑا اور بھیانک جرم کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ جب پیچھا ہی چھڑانا ہے تو طلاق لے لو۔ نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری۔ سارے زیورات اس بے چاری کے ہو جائیں گے اور اب ہو ہی گئے سمجھو۔"

محبوب نے گھور کر اعظم سے کہا۔ "اے بھائی جان! آپ میری دلہن کو غصے سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ آپ نے مٹھیاں کیوں بھینچ لی ہیں؟ کیا ارادے ہیں' کیا گھونسہ ماریں گے؟"

شبانہ نے کہا۔ "محبوب! میرے اور ان کے درمیان آجاؤ! جب یہ مجھے سینگ مارنے آئیں تو انہیں روک لینا۔"

محبوب ان کے درمیان تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ سینہ چٹان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ بازو فولاد کی طرح مضبوط تھے۔ فکر اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ وہ کھاتا تھا' خوب اچھا پہنتا تھا' گھومتا تھا' کھیلتا تھا۔ پھر ایسے میں وہ صحت مند اور مضبوط کیوں نہ ہوتا۔

اس کے مقابلے میں اعظم شراب نوشی کا عادی تھا۔ قد ساڑھے پانچ فٹ تھا۔ محبوب کے مقابلے میں اس کی جسامت پہاڑ کے آگے اونٹ جیسی تھی' اس لئے اس نے اسی میں بہتری سمجھی کہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ جائے۔

وہ جھنجلا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "محبوب! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تم میری عزت کرتے تھے۔ میری ہر بات مانتے تھے۔"

رجب علی نے کہا۔ "بیٹے! میں تمہارا چاچا ہوں۔ تم تو مجھے باپ سے بھی زیادہ

چاہتے تھے۔"

"ہاں' اب نہیں چاہوں گا۔ مجھے میری دلہن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ دونوں بہت بڑے دھوکے باز ہیں اور یہ جو بھائی جان بنتے ہیں' انہوں نے ہی فیروزہ کا گلا گھونٹ کر مارا ہے اور مجھے اُلو بنایا ہے اور میری نجو کو بھی اسی بھائی جان نے ہلاک کیا ہے میں ابھی ان کا کچومر نکال سکتا ہوں' مگر میری دلہن نے منع کر دیا۔ یہ کہتی ہیں کہ بھائی جان بہت جلدی خود ہی اپنے ہاتھوں سے مریں گے۔ ہاں' وہ اپنے ہاتھوں سے مرنے کو کیا کہتے ہیں؟" اس نے اپنی دلہن کی طرف دیکھا۔

دلہن نے کہا۔ "خودکشی۔"

اعظم پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "تم اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے ہتھکنڈوں سے گھبرا کر خودکشی کرلوں گا۔ میں جانتا ہوں۔ تم مجھ پر جھوٹے الزامات لگا رہی ہو۔ تم نے اس بے وقوف کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

شبانہ نے کہا۔ "دیکھو محبوب! یہ تمہیں بیوقوف کہہ رہے ہیں۔ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟"

محبوب نے کہا۔ "ہاں' مجھے سب یاد ہے۔ تم نے سمجھایا تھا کہ یہ لوگ اپنی حماقتوں پر یا جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے بیوقوف یا بچہ سمجھتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"شاباش' تم بہت سمجھدار ہوتے جارہے ہو۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اعظم ادھر ٹیلیفون کی طرف جانے لگا' شبانہ نے کہا۔ "ٹھہریئے۔ جب تک ہم موجود رہیں' اس وقت تک ٹیلیفون کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔" اس نے محبوب سے کہا۔ "جاؤ! دیکھو' کس کا فون ہے۔ تمہیں اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہونا چاہئے کہ یہاں آنے والے فون پر گفتگو کرسکو اور اس کا خاطر خواہ جواب دے سکو۔"

محبوب نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا' پھر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو" پھر اس نے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد خوش ہو کر اپنی دلہن سے کہا۔ "وہ انکل چوہدری بات کر رہے ہیں۔ تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"

شبانہ نے کہا۔ "اچھا' حمید اللہ چوہدری صاحب ہیں۔ ان سے کہو شوہر کی موجودگی

میں بیویاں بات نہیں کرتیں' لٰہذا تم بات کر رہے ہو۔ وہ مجھ سے جو کہنا چاہیں گے' وہ تم مجھے بتاتے جاؤ گے۔ میں یہاں بیٹھی سن رہی ہوں۔"

پھر یہی ہوا۔ محبوب فون پر حمید اللہ کی باتیں سن رہا تھا اور شبانہ کو بتاتا جارہا تھا۔ اس نے بتایا۔ "چوہدری انکل کہہ رہے ہیں کہ ہماری مل میں جو بورڈ آف ڈائریکٹرز ہے' آپ کو بھی اس بورڈ کا ایک ڈائریکٹر مقرر کیا جارہا ہے۔"

شبانہ نے خوش ہو کر فخریہ انداز میں رجب علی اور اعظم کی طرف دیکھا' پھر محبوب سے کہا۔ "اپنے چوہدری انکل سے پوچھو' اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

وہ پوچھنے لگا۔ پھر اس نے کچھ سننے کے بعد کہا۔ "وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ آج شام تک یا کل کسی وقت وہاں مل کے دفتر میں آجائیں اور ضروری کاغذات پر دستخط کریں۔"

شبانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں آج شام ہی کو تمہارے ساتھ جاکر ان کاغذات پر دستخط کروں گی۔ کل ہم کوئی کام نہیں کریں گے۔ صبح یہاں سے پکنک کے لئے نکلیں گے اور شام تک خوب تفریح کریں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

اس نے خوش ہو کر چوہدری انکل کو شبانہ کا جواب سنایا۔ پھر ریسیور رکھ کر اس کے پاس آگیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "سچ' کل ہم پکنک کے لئے جائیں گے؟"

وہ اعظم اور رجب علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں' یہ جو ہر ماہ پندرہ ہزار روپے اخراجات کے لئے ملتے ہیں تو یہ ہماری تفریح میں خرچ ہوا کریں گے۔ جب میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی' ایک ڈائریکٹر بن جاؤں گی تو ان اخراجات میں بھی کمی کردوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے خرچ کے لئے صرف پانچ ہزار روپے کافی ہیں۔"

اعظم اور رجب علی اپنی جگہ گم صم بیٹھے ہوئے تھے وہ حرکت کرنا بھول گئے تھے۔ جیسے جسم سے جان نکل رہی ہو۔ جن کے اندر دولت کی ہوس ہوتی ہے ان کے اندر سے ساری دولت نکل جائے اور ہوس نہ نکلے تو یہی ہوس انہیں مار ڈالتی ہے۔

دوسرے دن محبوب نے پکنک کے لئے چلتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اپنا مووی کیمرہ ساتھ لے لوں؟"

شبانہ نے کہا۔ "لے لو۔ ویسے اس بار تم میری اور اپنی فلم تیار کرسکو گے۔ اب

ہمارے بھائی جان اس کیمرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔"

محبوب نے معصومیت سے پوچھا۔ "کیوں نہیں آئیں گے۔" پھر جلدی سے چونک کر بولا۔ "ہاں' ہاں یاد آگیا۔ وہ قاتل ہیں نا۔ تم نے کہا تھا قاتل بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اس لئے بھائی جان بھی چالاک ہیں۔"

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شبانہ نے کار کو اسٹارٹ کیا۔ پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے کوٹھی کے احاطے سے نکل گئی۔

محبوب نے پوچھا۔ "وہ جو لیڈی کانسٹیبل ہیں' تم نے انہیں ساتھ نہیں لیا؟"

"نہیں' ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو پھر وہ گھر میں کیوں رہتی ہیں؟"

"بس یونہی۔ تمہارے انکل نے احتیاطاً انہیں ہمارے ساتھ لگا دیا ہے حالانکہ یہ ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ دشمنوں کو جتنی جلدی فیصلہ کن مات دے دی جائے' اتنا ہی بہتر ہے۔"

دشمن ان کے تعاقب میں تھا۔ جب وہ تفریح کے لئے دریا کے کنارے پہنچے تو دس منٹ کے بعد وہ بھی پہنچ گیا اسے دیکھتے ہی شبانہ نے کہا۔ "میں جانتی تھی تم ہمارے پیچھے آؤ گے۔"

اعظم نے دانت پیس کر کہا۔ "تم نے مجھے آنے پر مجبور کر دیا۔ تم نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں ہم نہ جی سکتے ہیں نہ مرسکتے ہیں۔ جینا چاہیں تو تمہارا مرنا ضروری ہے۔ اگر میں تمہیں ماروں گا تو قانون کی گرفت میں آجاؤں گا۔ یقین کی حد تک مجھ پر شبہ کیا جائے گا کہ میں نے تمہیں راستے سے ہٹانے کے لئے ختم کردیا ہے۔ پہلے ہی مجھ پر شبہ کیا جارہا ہے۔"

"جب تم اتنے سمجھدار ہو تو ہمارے پیچھے کیوں آئے ہو؟"

"اس بار دوسرا منصوبہ ہے۔ میں محبوب ہی کو ختم کردوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا اور محبوب کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اگر میں اس کمبخت کو مار ڈالوں تو کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا' گائے جب

تک دودھ دیتی ہے' اسے کوئی ذبح نہیں کرتا۔ یہ ہمارا ان داتا ہے اور ان داتا کو کوئی نہیں مارتا۔ اس لئے مجھ پر اور میرے ڈیڈی پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔ اور کرے گا تو ہمیں قاتل ثابت نہیں کرسکے گا۔"

شبانہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے محبوب کے پیچھے چلی گئی۔ اس کی آڑ لے کر کہنے لگی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو۔ دیکھو' محبوب کو قتل نہ کرنا۔ مارنا ہے تو مجھے جان سے مار ڈالو۔"

اعظم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "واہ' کیا وفادار بیوی ہے۔ اس گدھے پر جان دینے کا دعویٰ بھی کر رہی ہو اور اس کے پیچھے چھپتی بھی جا رہی ہو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ٹھائیں سے گولی چلی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ شبانہ نے محبوب کی پناہ سے نکلتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے پرس سے پستول نکالنے کے لئے مجبوراً چھپنا پڑا' ورنہ تم مجھے اس کا موقع نہ دیتے۔ محبوب! دیکھو' ریوالور زمین پر پڑا ہوا ہے۔ قاتل کا وہ ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟"

اسی وقت اعظم کانپتے ہوئے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اب وہ بائیں ہاتھ سے ریوالور اٹھانا چاہتا تھا اسی وقت شبانہ نے پھر گولی چلائی۔ اعظم تڑپ کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی زخمی ہوگیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلائے تڑپ رہا تھا۔

محبوب نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بہت اچھا نشانہ لگاتی ہو۔ اچھا ہوا اسے مار ڈالا۔"

"محبوب! میں نے اسے نہیں مارا ہے۔ دیکھو' وہ زندہ ہے۔ میں تو اسے صرف تم سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ مجھے بیوہ بنانا چاہتا تھا۔ تم جانتے ہونا' بیوہ کسے کہتے ہیں؟"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' جانتا ہوں۔ وہ جب ایک آدمی مرجاتا ہے اور اس کی دلہن زندہ رہ جاتی ہے' اس کو بیوہ کہتے ہیں۔ اگر میں مرجاتا تو........"

"یہی تو میں چاہتی تھی۔ میں تمہیں مارنے والے کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم اب کیا کرو گے؟"

محبوب نے جواب نہیں دیا۔ دوڑتا ہوا اعظم کے پاس گیا اور اس پر چڑھ بیٹھا۔ پھر

دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ اعظم تڑپ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ زخمی تھے۔ وہ جب بھی اپنے بچاؤ کے لئے ان ہاتھوں کو اٹھانا چاہتا تھا۔ آگے بڑھا کر محبوب کو روکنا چاہتا تھا۔ اسی وقت تکلیف کی شدت سے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑتے تھے۔ وہ ہاتھ جو محبوب کی دولت سمیٹتے رہے تھے۔ اب اپنی زندگی کو بھی سمیٹنے کے قابل نہ رہے تھے۔

پتہ نہیں' وہ کب تک اس کا گلا گھونٹتا رہتا۔ شبانہ نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "بس اب یہاں سے اٹھ جاؤ۔ پیچھے ہٹو۔"

"نہیں' میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

"محبوب! یہ مرچکا ہے۔ میں جو کہتی ہوں اس پر عمل کرو۔ کیا مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟"

اس نے اعظم کی گردن سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی دلہن کو محبت سے دیکھا۔ پھر اس کے حکم کے مطابق وہاں سے ہٹ گیا۔ شبانہ نے اعظم کے ریوالور کو زمین سے اٹھایا پھر اسے اعظم کی جیب کے اندر ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ "یہ مرچکا ہے۔ اب اسے گھسیٹ کر یا اٹھا کر ادھر لے چلو اور دریا میں بہا دو۔"

"ہاں' میں نے دیکھا ہے۔ مرنے والے کو غسل کراتے ہیں۔ پھر اسے کفن پہناتے ہیں۔ کیا اسے بھی نہلانا ہوگا؟"

"اسے نہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اسے لے جاکر پانی میں چھوڑ دو۔ یہ خود ہی نہاتا چلا جائے گا۔"

محبوب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسے اٹھایا' اپنے شانے پر لاد کر' چلتا ہوا دریا کے کنارے آیا۔ شبانہ نے کہا۔ "بس اسے لئے ہوئے پانی میں چلے جاؤ' اور جب کمر تک پانی میں پہنچ جاؤ تو اسے چھوڑ دینا۔"

وہ اسے اٹھائے ہوئے پانی میں چلا گیا۔ کمر تک پانی میں ڈوب گیا تو شبانہ کی ہدایت کے مطابق اس نے اعظم کی لاش کو پانی میں چھوڑ دیا۔

شبانہ نے چیخ کر کہا۔ "بس' واپس آجاؤ۔"

وہ واپس آگیا۔ شبانہ نے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں اعظم کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا تھا وہاں خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اس نے وہاں کی مٹی کو سمیٹ کر اٹھایا اور اسے بھی پانی میں لے جاکر بہا دیا۔ وہاں کی زمین ہموار کر دی۔

محبوب نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"بس یونہی' یہ سایہ دار جگہ ہے۔ یہاں ہم چادر بچھا کر پکنک منائیں گے۔ اس لئے صفائی کر رہی ہوں۔"

پھر اس نے چادر بچھا دی۔ محبوب نے کہا۔ "اپنا لباس بدل لو۔ اس میں کہیں کہیں خون کے دھبے نظر آرہے ہیں۔"

اس نے دوسرا لباس نکال کر محبوب کو دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خون کے دھبوں والا لباس لے کر ساحل پر گئی۔ پھر اسے صابن سے اچھی طرح دھو ڈالا۔ اسے ایک جھاڑی پر پھیلا دیا۔ تاکہ وہ سوکھتا رہے۔ پھر وہ چادر پر آکر محبوب کے ساتھ لیٹ گئی۔ اوپر سایہ دار گھنا درخت تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی دریا گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بڑی ہی رومان پرور جگہ تھی۔ وہ محبوب کو بہلانے لگی' پھسلانے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اگر کوئی اعظم کے متعلق تم سے پوچھے تو کیا کہو گے۔"

محبوب نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے سچ کہنا چاہئے اور میں ہمیشہ سچ کہتا ہوں۔ جھوٹ کہتا ہوں تو پیٹ میں عجیب سا درد ہونے لگتا ہے پھر سچ بات منہ سے نکل جاتی ہے۔ مگر کیا کروں' اس بار سچ نہیں بول سکوں گا۔ جھوٹ بولوں گا۔"

"جھوٹ کیوں بولو گے؟"

"اس لئے کہ وہ تھانے والے اور وہ عدالت والے کہتے ہیں کہ اگر اب میں نے کسی کو قتل کرنے والی بات کہی تو وہ مجھے کوٹھی میں نظر بند کر دیں گے۔ بڑی سخت سزا دیں گے۔"

شبانہ نے کہا۔ "کوئی تمہیں سزا نہیں دے گا۔ جب بھی کوئی اعظم کے متعلق پوچھے تو اس سے صاف صاف کہہ دینا' ہم یہاں پکنک منانے آئے تھے۔ ہمارے پیچھے اعظم بھی آگیا پھر اس نے ریوالور نکالا۔ پھر میری دلہن نے بھی پستول نکال لیا' کیوں ایسے ہی ہوا

تھا نا؟"

محبوب نے کہا۔ "ہاں' بالکل ایسا ہوا تھا۔"

"وہ ریوالور اور میری دلہن کا پستول نقلی تھا۔ کیا کہو گے؟"

"وہ ریوالور اور میری دلہن کا پستول نقلی تھا مگر اس پستول کی گولی سے خون نکلا تھا۔"

"تو کیا ہوا؟ تم نے فلموں میں دیکھا ہے کہ گولی چلنے سے خون نکلتا ہے اور آدمی مرجاتے ہیں' مگر وہ خون نقلی ہوتا ہے نا؟"

"ہاں' نقلی ہوتا ہے۔"

"بس' اعظم کے جسم سے جو خون نکلا تھا' وہ بھی نقلی تھا۔ کیا کہو گے؟"

"سب سمجھ گیا۔ تم نے نقلی پستول سے گولی چلائی تو نقلی خون بہنے لگا۔"

"شاباش۔ پھر تم کہنا کہ یہ گولی چلانے والا کھیل کھیلنے کے لئے اعظم نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم چور ڈاکو کا کھیل کھیلیں گے۔ وہ ڈاکو بن کر آئے گا تو ہم اسے جھوٹ موٹ کا مار ڈالیں گے۔ پھر اس کی لاش کو پانی میں بہا دیں گے۔"

"ہاں' سمجھ گیا۔ پھر ہم نے اس کی لاش کو پانی میں بہا دیا۔"

"جب بھی کوئی پوچھے' یہی کہنا۔"

وہ اسے سمجھاتی رہی' سکھاتی رہی' پڑھاتی رہی' پھر اپنی محبت بھری آغوش میں تھپک تھپک کر اسے سلا دیا۔ جب چار گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ تھوڑی دیر تک چاروں شانے چت پڑا رہا۔ سایہ دار درخت کو دیکھتا رہا۔ چڑیوں کے چہچہانے اور شبانہ کے گنگنانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو شبانہ اس کے پاس ہی لیٹی ہوئی' کھلے آسمان کو دیکھتی ہوئی بہت مسرور نظر آ رہی تھی اور ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ محبوب کروٹ بدل کر پھر اس کے پیار کی پناہ میں چلا گیا۔ شبانہ نے اس کے سر کو ہولے ہولے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں' اب سناؤ۔ تمہیں کیا سکھایا تھا' کیا یاد رہا؟"

وہ تمام باتیں دہرانے لگا۔ شبانہ نے خوش ہو کر کہا۔ "شاباش' ایسا ہی بیان دینا اور آخر میں کہہ دینا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ کیا کہو گے؟"

"میں بیان دینے کے بعد آخر میں کہوں گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔"

شبانہ نے اسے مزید اچھی طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کبھی نہ کہنا کہ اعظم کے ساتھ چور ڈاکو کا کھیل کھیلنے کے بعد ہم سو گئے تھے۔ بس اتنا ہی کہہ دینا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ کیا کہو گے؟"

وہ اس کی باتوں کو دہرانے لگا۔ یاد کرنے لگا۔ شبانہ اس کی خوب تعریفیں کرتی رہی۔ اسے سیر و تفریح میں مصروف رکھتی رہی۔ جب وہ شام کو وہاں سے روانہ ہوئے اور اپنی کوٹھی میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ رجب علی ان کا انتظار کر رہا تھا۔

لیڈی کانسٹیبل نے پوچھا۔ "کیا آپ کے لئے کھانا لگایا جائے؟"

"نہیں' ہم ابھی آرام کریں گے۔ شاید ایک دو گھنٹے بعد کھائیں گے۔"

لیڈی کانسٹیبل چلی گئی۔ رجب علی صوفے پر بیٹھا ہوا کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ شبانہ نے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا محبوب کو زندہ سلامت دیکھ کر پریشانی ہو رہی ہے؟"

رجب علی نے گھبرا کر کہا۔ "نن.......... نہیں۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ محبوب مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم خواہ مخواہ شبہ کرتی رہتی ہو۔"

شبانہ نے ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "اب شبہ نہیں کروں گی کیونکہ میں نے دشمنی کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکا ہے۔ آپ کا بیٹا اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

رجب علی ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے پیروں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ بیٹے کی موت کی خبر سن کر کھڑا رہ سکے۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ واپس کیوں نہیں آسکے گا؟"

"آپ سمجھ چکے ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک کو ختم ہونا تھا۔ ہم زندہ ہیں' اس لئے دوسرا ختم ہو چکا ہے۔ آپ ابھی قریبی پولیس اسٹیشن میں جا کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دیں۔"

ایسا کرنا ہی تھا۔ رجب علی نے یہ رپورٹ درج کرا دی لیکن محبوب اور شبانہ پر شبہ ظاہر نہیں کیا۔ کیسے کرتا۔ محبوب ان داتا تھا اور شبانہ کے خلاف وہ کوئی ثبوت فراہم نہیں

کر سکتا تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کر سکتا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے تفتیش کا آغاز کیا۔ وہ گمشدہ اعظم کے عزیزوں' رشتہ داروں سے بیانات لینا چاہتا تھا۔ جب اس کوٹھی میں پہنچا تو محبوب کو دیکھتے ہی بھڑک گیا' کہنے لگا۔ "میں تو اس احمق کا بیان نہیں لوں گا۔ یہ فضول باتیں کرتا ہے۔"

شبانہ نے اپنا بیان دیا اور مختصر طور پر اتنا ہی بتایا۔ "میں صبح محبوب کے ساتھ پکنک کے لئے گئی تھی۔ اس سے پہلے اعظم کو نہیں دیکھا تھا۔ شام کو پکنک کے بعد واپس آئی' تب بھی اعظم کوٹھی میں دکھائی نہیں دیا۔ نہ وہ ہمیں کہیں بتا کر جاتا ہے اور نہ ہی ہم اس سے کچھ پوچھتے ہیں۔" اس کے بعد شبانہ نے مزید کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ کو محبوب کا بھی بیان لینا چاہئے کیونکہ یہ اس گھر کے اہم فرد ہیں۔"

انسپکٹر نے انکار کیا۔ شبانہ نے کہا۔ "یہ بات قانون کے خلاف ہوگی۔ آپ کو کسی احمق کی بات کا بھی خاص طور پر نوٹس لینا چاہئے اور اس پر غور کرنا چاہئے۔ انسپکٹر نے مجبور ہو کر محبوب کو ڈرائنگ روم میں بلایا پھر اس کا بیان لینے لگا۔ محبوب نے اپنا بیان دینے کے بعد آخر میں کہا۔ "اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔"

یہ سنتے ہی انسپکٹر بھڑک گیا۔ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "تم مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ کیا اب تک اپنا کوئی خواب سنا رہے تھے؟"

رجب علی نے کہا۔ "جناب! آپ ناراض نہ ہوں۔ یہ تو ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم' پچھلی رپورٹ اٹھا کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ میری پہلی بہو کا جو قتل ہوا تھا اس سلسلے میں محبوب کے الٹے سیدھے بیانات تھے لیکن یہ پتا چلتا تھا کہ محبوب ہمیشہ جائے واردات پر موجود رہا ہے' چاہے وہ فیروزہ کا کیس ہو یا لیڈی ڈاکٹر نجمہ کا۔ لہٰذا آپ اس کے اسی الٹے سیدھے بیان کے مطابق اگر اس دریا کے کنارے جا کر کچھ وقت ضائع کر دیں تو شاید میرے بیٹے کی لاش ہی مل جائے۔"

انسپکٹر نے رجب علی کی باتوں پر غور کیا۔ پھر اس کے مطابق وہ دریا کے کنارے گیا۔ وہاں وہ اپنے طور پر چھان بین کرتا رہا لیکن اسے کوئی سراغ نہیں ملا۔ دوسری بار وہ پھر غوطہ خوروں کی ٹیم لے کر وہاں پہنچا۔ غوطہ خور دریا میں غوطے لگاتے رہے۔ دور دور تک

تلاش کرتے رہے لیکن وہ گم ہونے والا نہ ملا۔

پھر یہ کیس عدالت تک پہنچ گیا۔ شبانہ کے وکیل نے فاضل جج سے درخواست کی کہ عدالت کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے محبوب کے سلسلے میں جو پہلی رپورٹ ہے اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ فیروزہ اور لیڈی ڈاکٹر نجمہ کے کیس کی فائلیں پیش کی گئیں۔ ان کا مطالعہ کیا گیا۔ پھر اگلی پیشی میں سرکاری وکیل نے محبوب سے سوالات کئے۔ محبوب نے وہی جوابات دیئے جو اسے یاد کرائے گئے تھے اور جنہیں وہ خود بھی سچ سمجھتا تھا اور وہ یقیناً سچ کہہ رہا تھا لیکن آخر میں یہ کہہ دیتا تھا کہ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

اور یہ ایسا جملہ تھا کہ اچھے اچھوں کو طیش دلا دیتا تھا سرکاری وکیل نے اسے دھمکی دی۔ جج نے بھی اسے سمجھایا کہ اس نے جاگتی آنکھوں سے جو دیکھا ہے وہی بیان کرے' اپنا خواب نہ سنائے۔

لیکن وہ وہی سناتا رہا۔ عدالت کا وقت قیمتی ہوتا ہے جو بھی فیصلہ کیا جاتا ہے وہ سابقہ رپورٹ' چشم دید گواہ اور ثبوت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ تمام ثبوت' تمام گواہیاں اور تمام رپورٹیں محبوب کے حق میں تھیں۔ اسے نیم پاگل یا ایسا احمق ثابت کر رہی تھیں جو جسمانی طور پر جوان تھا اور ذہنی طور پر بالکل ہی بچہ۔

اس بچے کو الزامات سے بری کر دیا گیا۔ تھانے سے لے کر عدالت تک یہی رائے قائم کی گئی کہ محبوب کی معصومیت یا حماقت کے پیچھے کوئی قاتل اپنا کام کر کے نکل جاتا ہے۔ اس قاتل کو تلاش کیا جائے۔ پہلے اعظم پر شبہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی فیروزہ اور ڈاکٹر نجمہ کو قتل کیا ہے لیکن اب وہ خود ہی کسی قاتل کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس قاتل کو تلاش کرنے کی پُرزور تاکید کی گئی۔

شبانہ رات کے ایک بجے تک محبوب کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اس کے سونے کے بعد وہ آہستگی سے اٹھی۔ ابھی ایک دشمن اور رہ گیا تھا۔ اس کانٹے کو بھی نکال کر پھینکنے کے بعد وہ آرام اور سکون سے ازدواجی زندگی گزار سکتی تھی اور محبوب کی طرف سے بھی ہمیشہ کے لئے مطمئن رہ سکتی تھی۔

اس نے آہنی الماری کو کھول کر اس میں سے دس ہزار روپے نکالے' انہیں ایک

کاغذ میں لپیٹ کر کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا پوری کوٹھی خاموش تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رجب علی کے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رجب علی ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

چند لمحوں تک وہ دونوں خاموش رہے۔ بیٹی باپ کو دیکھتی رہی۔ باپ بیٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی رجب علی نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ کہنے لگا۔ "میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ لوگ دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ میں دنیا میں خالی ہاتھ رہ گیا۔ آہ' بیٹی! جب تم گم ہوگئی تھیں تو میرے اندر دوغلے جذبات تھے۔ مجھے تمہاری گمشدگی کا صدمہ تھا مگر عجیب طرح کا اطمینان تھا جیسے میرے پاؤں سے کانٹا نکل گیا ہو۔ میں تمہارا مجرم ہوں مجھ پر تھوک دو۔"

شبانہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ چپ چاپ اپنے باپ کو دیکھتی رہی۔ باپ نے کہا۔ "میں نے دولت سمیٹنے کے لئے کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ کچھ کامیابی ہوئی مگر آخر میں سراسر ناکامی میرے حصے میں آئی۔ تمہاری ماں' تمہارا صدمہ سہتے سہتے مر گئی۔ میری بڑی بہو بہت اچھی تھی۔ اس میں بھی کچھ خودغرضی تھی لیکن خودغرضی کس میں نہیں ہوتی۔ وہ بھی ماری گئی۔ میرا بیٹا بھی ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگیا۔ وہ کہاں ہے کیا سچ مچ مارا گیا۔ اس بات کا یقین مجھے اب بھی نہیں آتا۔ محبوب کو ہم نے الٹی سیدھی باتیں سکھائی ہیں' آج وہ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے تو کبھی میرا بیٹا مجھے زندہ نظر آتا ہے اور کبھی مردہ۔ جو میں نے محبوب کو دیا' وہی محبوب سے پا رہا ہوں۔"

وہ روتا جارہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ بیٹی آخر بیٹی ہوتی ہے۔ باپ کے آنسو دیکھ کر اس کا دل نہیں مانتا۔ اندر سے تڑپ جاتی ہے۔ شبانہ کا جی چاہنے لگا کہ وہ دوڑ کر جائے اور اپنے باپ کے بوڑھے سر کو اپنے سینے سے لگالے۔ اپنے آنچل سے آنسو پونچھ لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی اپنے آپ سے لڑتی رہی' برداشت کرتی رہی۔ جو محبت دھوکا دیتی ہے' جو رشتے خون سفید کر لیتے ہیں' ان سے دور رہ کر' انہیں ہمیشہ عبرتناک سبق سکھاتے رہنا ہی دانشمندی ہے۔

تھوڑی دیر تک برداشت کرنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی' پھر آہستگی سے کہا۔ "بڑے میاں! اگر آپ کا دکھڑا ختم ہوگیا ہو تو میری بھی کچھ سن لیجئے۔"

رجب علی نے اپنے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کر آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ کہنے لگی۔ "قانون کے محافظ محبوب کی طرح بچگانہ ذہن نہیں رکھتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ محبوب۔ یا مجھ سے دشمنی کرنے والا یا تو اعظم ہو سکتا ہے' یا آپ۔"

رجب علی نے گڑگڑا کر کہا۔ "نہیں بیٹی! میں تم لوگوں سے اب دشمنی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"آپ کے اب سوچنے یا نہ سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری باتیں توجہ سے سن لیجئے۔ اعظم کے گمشدہ ہونے یا مرجانے کے بعد قانون کی نظریں آپ پر ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فیروزہ' لیڈی ڈاکٹر نجمہ اور آپ کے صاحبزادے کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اگر میں اپنے طور پر چال چلنا شروع کر دوں تو دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ یا تو میں آپ کو تینوں کا قاتل ثابت کر دوں گی یا پھر محبوب کو ایسی ہی الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر آپ کو بھی قتل کرا دوں گی اور یہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ تھانے سے لے کر عدالت تک سبھی محبوب کو معصوم اور احمق سمجھتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ اس گھر میں اب آئندہ سانسیں لوں گا تو موت مجھے اس کی مہلت نہیں دے گی۔ جس طرح اعظم مارا گیا۔ اس طرح میں بھی اس معصوم قاتل کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ میری تو یہی سزا ہے کہ میں اپنی بیٹی کے ہاتھوں سزا پاؤں۔"

شبانہ نے ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "بیٹیوں کا دل کیا ہوتا ہے' یہ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ لیجئے یہ دس ہزار روپے ہیں۔" اس نے نوٹوں کے اس بنڈل کو رجب علی کی گود میں پھینک دیا۔ پھر کہا۔ "بڑی حسرت تھی آپ کے گھر سے دلہن بن کر رخصت ہوتی۔ آپ جہیز میں مجھے کچھ دیتے مگر افسوس میں آپ کو رخصت کر رہی ہوں۔ جہیز میں دس ہزار روپے دے کر' یہ شاید آپ کی باقی زندگی کے لئے کافی ہوں۔ ناکافی ہوں تو مجھے اطلاع دیجئے گا' میں مزید رقم بھیج دوں گی لیکن آپ اس شہر سے بہت دور چلے جائیں۔ آپ کی بھلائی اسی میں ہے۔ اسی میں ایک بیٹی کی محبت کا بھرم ہے۔"

رجب علی نے سر جھکا لیا۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا پھر اپنے سینے کو سہلاتے ہوئے رونے لگا۔ شبانہ وہاں سے گھوم کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں سے کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں پہنچ گئی۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رجب علی سر جھکائے ایک چھوٹی سی اٹیچی اٹھائے باہر برآمدے میں آیا۔ اس نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی۔ پھر سر جھکا کر جانے لگا۔ وہ کھڑی رہی' اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ احاطے سے باہر چلا گیا' نظروں سے دور ہو گیا تو وہ تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے اندر آئی۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچی۔ وہاں اس کا شہزادہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہزادیوں اور پریوں کے قصے پڑھنے اور سننے والا' نیند کی حالت میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ بہت دیر سے برداشت کر رہی تھی۔ آخر لاوا ابل پڑا۔ اس نے دوپٹے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ محبت کا کانٹا ایسا ہی ہوتا ہے۔ نہ نکالو تو چبھتا رہتا ہے۔ نکال پھینکو تو آدمی آدھا مر جاتا ہے۔

اس لمحے وہ باپ کے لئے مر رہی تھی اور شوہر کے لئے جی رہی تھی۔

☆======☆======☆

دائمی سزا

قسمت مہربان ہو تو انسان فرش خاک سے مسند اقتدار پر پہنچ جاتا ہے اور پھر اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہی غلط فہمی اسے تباہی کے کنارے تک لے جاتی ہے۔

اس شخص کا قصہ جسے اپنی منصوبہ بندی پر ناز تھا۔

گلاب کے پھول گلدان میں سجیں یا کنول کیچڑ میں کھلے۔ حسن پھر حسن ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو اپنے دام میں بے دام لے آتا ہے۔

سرفراز نے جب شمائلہ کو دیکھا تو اس کے دل نے پکار کر کہا۔ "میں کب سے تمہارے لئے پر تول رہا ہوں۔"

یہ بات اس نے بلند آواز میں نہیں کہی۔ کہتا تو شاید شمائلہ پیپر ویٹ کھینچ کر اس کے منہ پر مارتی کیونکہ وہ ملازمت حاصل کرنے آئی تھی، عشق کرنے نہیں۔ اس نے پوچھا۔
"کیا واقعی تم غریب آباد میں رہتی ہو؟"

"کیا آپ کو یقین نہیں آرہا ہے؟"

"تمہاری صورت، تمہاری شخصیت اتنی پُرکشش ہے، میرا مطلب ہے کہ تمہارا قیمتی لباس، تمہارا یہ رکھ رکھاؤ.......... میرا مطلب ہے کہ.........."

شمائلہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں کہ اتنے قیمتی کپڑے، اتنا رکھ رکھاؤ رکھنے والی لڑکی ایک غریب محلے کی نہیں ہو سکتی۔"

"بالکل ٹھیک، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔"

"بات اصل میں یہ ہے کہ میرا یہ لباس، میری سہیلی نے پہننے کے لئے دیا ہے۔ یہ پرس بھی اسی کا ہے۔ میرے چہرے پر اس نے ہلکا سا میک اپ کر دیا تھا۔ کہتی تھی، یہ دنیا نمائش کی جگہ ہے اور کہتی تھی، تم انٹرویو لینے والے کی نظروں میں اچھی نہیں لگو گی تو وہ تم سے کوئی سوال نہیں کرے گا۔ دروازے سے ہی ٹرخا دے گا۔"

سرفراز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی تمہاری سہیلی بہت سمجھدار ہے۔"

"کیا میں نادان ہوں؟"

"اگر تم اپنی سہیلی کے مشوروں پر عمل نہ کرتیں تو شاید اس وقت یہاں بیٹھی ہوئی نظر نہ آتیں۔ انسان کو ایک دوسرے کی نظروں میں سمانے کے لئے ذرا بن سنور کر رہنا پڑتا ہے، خواہ عورت ہو یا مرد۔ کچھ حاصل کرنے کے لئے پہلے اپنے اندر دلکشی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی اداکار، بزنس مین اور لیڈر قسم کے لوگ اپنی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنائے رکھنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔"

"لیکن میرا تعلق بزنس سے نہیں ہے، نہ ہی میں کوئی فلمی اداکارہ ہوں۔ میں تو آپ کے ہاں گورنس کی ملازمت حاصل کرنے آئی ہوں۔"

"دنیا کی ہر عورت تھوڑی بہت اداکارہ ہوتی ہے۔ مرد بھی ہوتے ہیں اگر تم میں ذرا سی بھی اداکاری کی صلاحیت نہ ہوتی تو تم اپنی سہیلی کے مشورے کے مطابق یہ روپ بدل کر نہ آتیں۔ جیسی غریب ہو، جیسے غریب محلے میں رہتی ہو ویسے ہی حلیے میں چلی آتیں۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی ہاں، میں یہی چاہتی ہوں کہ انسان جو ہو وہی ظاہر کرے خواہ مخواہ کی نمائش مجھے اچھی نہیں لگتی لیکن میں بیروزگاری سے تنگ آگئی ہوں اگرچہ دنیا میں اکیلی ہوں لیکن میرے ساتھ بھی پیٹ ہے، میری بھی ضرورتیں ہیں، مجھے اپنے مستقبل کا خیال رکھنا پڑتا ہے اس لئے میں نے اپنی سہیلی کی بات مان لی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بہروپ میں آسکتی ہو، اپنی اصلیت بھی چھپا سکتی ہو؟"

"اس بار تو میں نے مجبوری سے ایسا کر لیا، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"اگر اچھا نہیں لگتا تو پھر تمہیں یہ ملازمت نہیں مل سکتی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ مجھے مایوس نہ کریں۔ میں بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں۔"

"مجھے تمہاری یہ خوبی پسند ہے کہ تم سچی اور سیدھی ہو۔ جیسی ہو ویسا ہی ظاہر کرنا چاہتی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں خود کو ذرا سا بدلنا ہو گا۔"

"ملازمت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے تو میں ایسا کرلوں گی۔"

"تم نے یہ کہہ کر مجھے خوش کر دیا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "لیکن خود کو بدلنے سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"یہی کہ کبھی ضرورت پڑے تو ضروری نہیں ہے کہ تم سچ بولو۔"

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا مجھے کبھی جھوٹ بھی بولنا ہو گا؟"

"ہاں' ایسے ہی جیسے سہیلی کے کہنے سے تم نے ملازمت کی اس درخواست میں اپنے غریب آباد کا پتہ نہیں لکھا بلکہ فیڈرل بی ایریا کا ایڈریس لکھا ہے۔"

"میری سہیلی کہتی تھی۔ سوسائٹی کی کسی کوٹھی میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے خود کو ذرا اسٹینڈرڈ والی ظاہر کرنا ہو گا اور کسی غریب محلے کی رہنے والی ایسی نہیں ہو سکتی اس لئے میری سہیلی نے اپنے گھر کا پتہ لکھ دیا تھا لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میں آپ سے جھوٹ نہ بول سکی۔ یہاں آ کر سچ کہہ دیا۔"

"مجھ سے سچ کہہ دیا' بہت اچھا کیا' لیکن جب میں تم سے تمہاری سہیلی کی طرح جھوٹ بولنے کے لئے کہوں تو جس سے جھوٹ بولو اس کے سامنے پھر سچ نہ اگلنا۔" وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ سرفراز نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم یہ ملازمت نہیں کر سکو گی۔"

وہ چونک کر بولی۔ "جی کروں گی۔ آ.......... آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گی۔"

"کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیا شادی کرنے والی ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں شادی کے لئے نہیں آئی ہوں' آپ ملازمت کے لئے انٹرویو لیں۔"

"کہتے ہیں کہ آگ لینے جاؤ تو پیغمبری مل جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم ملازمت حاصل کرنے آئی ہو تو شادی کا سلسلہ بھی ہو جائے اور تمہارا مستقبل سنور جائے۔"

اس نے حیرانی سے سرفراز کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"میں یہ ملازمت کسی ایسی سمجھدار لڑکی کو دوں گا جو مصلحت پسند ہو اور اپنا

مستقبل شاندار بنانے کے لئے حالات سے سمجھوتا کر سکتی ہو۔"

"جناب! میں بہت مجبور ہوں۔ بہت ضرورت مند ہوں۔ میں حالات سے سمجھوتا کر سکتی ہوں بشرطیکہ میری عزت پر حرف نہ آئے۔"

"اگر کوئی دولت مند تمہاری عزت کا محافظ بن جائے' تم سے شادی کر لے' تمہارے بہترین مستقبل کی ضمانت دے تو؟"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "آپ ایسے سوالات کر رہے ہیں جن کا جواب دینے سے پہلے بہت سوچ بچار کی ضرورت ہے۔"

"کبھی کبھی خوش نصیبی اچانک دروازے پر دستک دیتی ہے' تم دروازہ نہیں کھولو گی تو وہ دوسرے دروازے پر چلی جائے گی۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "پلیز مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع بھی دیں۔"

"آخر تم کس پہلو سے سوچنا چاہتی ہو؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"میری زندگی میں بیک وقت کبھی بہت ساری خوشیاں نہیں آئیں اور میں نے سنا ہے کہ بیک وقت کوئی دولت ملے یا کوئی راتوں رات امیر ہو جائے تو اس کی دولت اس کی امارت ناجائز ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ چور دروازے سے آتا ہے میں یہی سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ جن مسرتوں کا ذکر کر رہے ہیں اور بہترین مستقبل کی ضمانت دے رہے ہیں تو اس کے پیچھے کون سا چور دروازہ ہے۔"

"تم ایک دروازے کے متعلق سوچ رہی ہو' کئی چور دروازے ہو سکتے ہیں لیکن تمہیں صرف اپنے نفع' نقصان کے متعلق سوچنا چاہئے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے تو پھر سوچ بچار کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"میرے بہترین مستقبل کی ضمانت کیسے ہو گی؟"

"میں تم سے تحریری معاہدہ کروں گا۔ اس معاہدے کے مطابق جب تم میری شریکِ حیات بن جاؤ گی تو میں تمہیں ماہانہ پانچ ہزار روپے دیا کروں گا۔ کیا غریب آباد میں رہنے والی کوئی لڑکی ماہانہ پانچ ہزار روپے آمدن کا تصور بھی کر سکتی ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "آپ درست کہتے ہیں' یہ میرے لئے بہت بڑی

رقم ہے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں شادی کے چار یا چھ ماہ بعد تمہیں اپنی جائیداد کا مالک بھی بنا سکتا ہوں۔ میری دولت تمہاری بھی دولت ہوگی۔"

"لیکن آپ کی ایک بیوی اور بچی ہے۔ کیا آپ اپنی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت لیں گے؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری شادی چپ چاپ ہوگی اور تم وہاں گورنس بن کر رہو گی۔"

"پھر ایک گورنس آپ کی بیوی کی موجودگی میں کیسے اپنے حقوق کا دعویٰ کرے گی؟"

"میں رفتہ رفتہ تمہیں سمجھا دوں گا۔ میں راستہ بتاؤں گا' تم اس پر چلو گی۔ ایک وفادار بیوی کی طرح میرے حکم کی تعمیل کرتی رہو گی تو فائدے میں رہو گی ورنہ تمہارے مقدر میں وہی ماہانہ پانچ ہزار روپے لکھے رہیں گے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے پوچھا "اب کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں کل جواب دوں گی۔"

"کل کا مطلب یہ ہوا کہ تم یہاں سے جا کر اپنی سہیلی سے مشورہ لو گی اور میرا مشورہ یہ ہے کہ میری شریکِ حیات بننے کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی سے مشورہ نہ لو۔"

"میں غریب آباد میں اپنی خالہ کے ہاں رہتی ہوں۔ انہیں تو کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہماری شادی چپ چاپ ہوگی۔ جب وقت آئے گا تو سب پر ظاہر کر دیا جائے گا۔"

"کیا میری الگ رہائش کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"اگر تم اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر آنا پسند کرو تو ہماری کوٹھی کے سامنے والی انیکسی میں تمہاری رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔"

"میری خالہ وغیرہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں' میں انہیں چھوڑ کر آؤں گی تو ان کا بوجھ اتر جائے گا۔ میرے آنے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔"

"یعنی تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ اب سنو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کل چپ چاپ ہماری شادی ہو جائے گی' میں نکاح کے سارے انتظامات کرلوں گا۔ ہم میاں بیوی کی حیثیت سے ایک ہوٹل میں رہیں گے۔ اس دوران میں اپنی وائف رضیہ سے تمہارا ذکر کروں گا۔ وہ بہت کنجوس ہے۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ تم ایک غریب لڑکی ہو اور تمہارے والدین نہیں ہیں' اپنے رشتہ داروں پر بوجھ ہو' ہماری کوٹھی کی انیکسی میں آکر رہنا چاہتی ہو تو وہ تمہاری مجبوریوں کے پیشِ نظر ماہانہ ایک ہزار سے زیادہ نہیں دے گی۔ شاید تین وقت کی روٹی بھی منظور کرلے۔ بہرحال وہ جو بھی تم سے طے کرے اسے تسلیم کر لینا۔ میرے اور تمہارے درمیان جو طے شدہ رقم ہے وہ میں اپنی جیب سے تمہیں دیا کروں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ اپنی عادت کے مطابق سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ "شادی کے دن میں ہوٹل میں نہیں رہوں گی۔ جب مجھے نکاح نامہ مل جائے گا' ہمارے درمیان ہونے والے معاہدے کی اصل کاپی بھی مجھے مل جائے گی تو میں آپ کے حکم پر عمل کروں گی۔ آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی مجھے پائیں گے۔"

دونوں کے درمیان ضروری باتیں طے ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھ گئی۔ سرفراز نے دو ہزار روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں رکھ لو۔ اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لینا۔ شادی کے بعد جب تم میری ہو جاؤ گی تو کھل کر شاپنگ کراؤں گا۔"

وہ دو ہزار روپے پرس میں رکھ کر دفتر سے باہر آگئی۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملازمت کے لئے آئے گی اور اسے ایک دولت مند شوہر مل جائے گا۔ اس معاملے پر بہت زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ وہ ایک لائبریری میں آگئی۔ لائبریری ایک ایسی جگہ ہے جہاں خاموشی رہتی ہے۔ لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہاں ہر شخص اپنی کتابوں' رسالوں اور اخباروں کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔ وہ بھی ایک جگہ بیٹھ کر ایک کتاب کھول کر اپنے حالات پر غور کرنے لگی۔

اس نے سرفراز سے غلط کہا تھا کہ اس کے والدین نہیں ہیں۔ بے شک اس کی

والدہ اس دنیا میں نہیں رہی تھیں لیکن والد تھے اور نہ ہونے کے برابر تھے اس لئے وہ ان کے وجود سے انکار کرتی تھی۔ کسی کے سامنے ان کا نام نہیں لیتی تھی اور خود کو یتیم ظاہر کرتی تھی۔ اس نے باپ کا گھر چھوڑ دیا تھا اور خالہ کے ہاں اب تک رہتی آئی تھی۔

چھ برس پہلے اس کے والد نے دوسری شادی کی تھی‘ اس کی ماں پر ایک سوکن لے آئے تھے۔ دنیا میں سبھی رشتے آپس میں محبت بھی کرتے ہیں اور دشمنی بھی کرتے ہیں لیکن سوکنوں کا رشتہ ایسا ہے جو صرف دشمنی کرنا جانتا ہے۔ ان کے درمیان محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنے والی سوکن نے اس کی والدہ کے خلاف رفتہ رفتہ تباہی مچادی۔ اس کے والد کو اس کی والدہ سے چھین لیا۔ اس پر ایسے ایسے الزامات تراشے گئے کہ بیچاری صدمہ برداشت نہ کرسکی اور پچھلے سال اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ تب سے شمائلہ نے اپنے باپ کا گھر چھوڑ دیا۔ اپنی سوتیلی ماں کے زیرِسایہ رہنا گوارا نہ کیا اور اپنی خالہ کے پاس آگئی۔

تب سے اس کے دل میں سوکنوں کے لئے نفرت پیدا ہوگئی‘ کسی بھی ایسی عورت کو دیکھتی جو دوسری عورت پر سوکن ہوتو اس سے بے اختیار نفرت کرنے لگتی۔ کبھی دل میں یہ بات آتی کہ اس کی زندگی میں کوئی سوکن آئے یا وہ کسی پر سوکن ہوکر جائے تو اپنی ماں کا انتقام لے گی اور یہ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ یہ موقع فراہم ہورہا تھا۔

اس نے تقدیر کی اس پیشکش کو بڑی فراخدلی سے قبول کرلیا۔ اب وہ بیک وقت دو مسائل پر غور کررہی تھی۔ ایک تو یہ کہ اپنی سوکن سے اپنی ماں کا انتقام کس طرح لینا چاہئے؟ دوسرا یہ کہ جسے شوہر کی حیثیت سے قبول کررہی ہے‘ وہ اس کا ہم مزاج اور ہم نوا بن سکے گا یا نہیں؟ اور اسے پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے کے لئے کیسے جتن کرنے ہوں گے؟

بڑی دیر تک سوچنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ سرفراز نے اسے محض اس کے حسن و شباب کی وجہ سے پسند نہیں کیا ہے‘ کوئی اور بات بھی ہے۔ کوئی ایسا مقصد ہے جسے وہ دوسری شادی کے ذریعے پورا کرنا چاہتا ہے‘ اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ مقصد کیا ہے۔ اگر سرفراز اس کے ذریعے کچھ حاصل کرتا ہے تو یقیناً وہ بھی سرفراز کے ذریعے اپنی

سوکن سے بھرپور انتقام لے سکے گی۔

وہ اس رات سو نہ سکی۔ کروٹیں بدلتی رہی۔ کبھی ذرا دیر کے لئے آنکھ لگی تو اس نے بند آنکھوں کے پیچھے اپنی ماں کو دیکھا جو صدمات سہہ سہہ کر جان دے رہی تھی۔ اسی طرح اب اس کی ہونے والی سوکن بھی کرب میں مبتلا ہوکر مر رہی ہے اور سرفراز اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔

دوسرے دن سرفراز کے ایک دوست کے ہاں چپ چاپ شادی ہوگئی۔ وہ سادگی سے دلہن بنی ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی جب سرفراز اس کمرے میں آیا تو احساس ہوا کہ دلہن چاہے کتنی سادہ ہو لیکن جذبوں میں سادگی نہیں ہوتی۔ ان میں رنگینی اور لہو کی حرارت ہوتی ہے۔ پھر مزاج بدل جاتا ہے کنواری لڑکی نکاح کے بعد اپنے مرد کو ہی ساری دنیا‘ ساری دولت سمجھ لیتی ہے۔ یوں بھی سرفراز بڑی ہی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ سہاگ کے کمرے میں آیا تو شمائلہ نے اسے اپنے دل کے اندر آکر بیٹھتے ہوئے صاف محسوس کیا۔

اس نے کہا۔ ”شمائلہ! شادی کے بعد دل نہیں مانتا‘ جی چاہتا ہے میاں بیوی کے درمیان کوئی نہ ہو۔ کوئی رکاوٹ سامنے نہ آئے۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میری بیوی رضیہ ہمارے درمیان رکاوٹ بنی رہے گی۔ تم انیکسی میں رہو گی تو ہم آزادی سے مل نہیں سکیں گے۔“

شمائلہ خود یہی چاہتی تھی۔ ابھی زبان سے بول نہیں سکتی تھی‘ اس لئے اس کی سن رہی تھی۔

سرفراز نے کہا۔ ”میں نے ایک چھوٹا سا مکان تمہارے لئے کرائے پر حاصل کیا ہے۔ تم وہاں رہو گی اور گورنس کی حیثیت سے صبح ہماری کوٹھی میں آؤ گی۔ شام کو چلی جایا کرو گی۔“

یہ بات شمائلہ کو بری لگی۔ اب وہ اپنی سوکن اور اس کی بیٹی کے ہاں گورنس بن کر جایا کرے گی۔ اسے توہین کا احساس ہورہا تھا۔ اس وقت وہ دلہن بنی ہوئی تھی۔ شرم کا پہرہ تھا اس لئے کچھ بول نہ سکی۔

صبح نکاح پڑھایا گیا تھا۔ وہ دونوں شام تک اس مکان میں رہے۔ پھر رخصت ہو
کا وقت آگیا۔ سرفراز نے کہا۔ "رضیہ یہ سمجھتی ہوگی کہ میں کاروبار میں مصروف ہوں
شام تک میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔ اسے کسی طرح کا شبہ نہیں ہونا چاہئے۔"

شائلہ نے اس کے بازو کو تھام لیا۔ پھر بڑی محبت سے جذبوں میں ڈوب کر بولی
"میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ جائیں۔ یہ کیسی شادی ہے' میں کیسی دلہن ہوں' آپ ملے
ہی بچھڑنے لگے ہیں۔"

"یہ مجبوری ہے۔ کل ہم پھر ملیں گے اور جب بھی مجھے رات کو موقع ملا کرے گ
میں تمہارے پاس آجایا کروں گا۔ تم کل سے ڈیوٹی پر آجانا۔"

"میں نہیں آؤں گی۔"

سرفراز نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا ناراض ہو؟"

"کیا ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں آپ کی شریکِ حیات ہوں جتنا حق رضیہ کا ہے
اتنا ہی میرا بھی ہے۔ پھر میں اس کی ملازمہ بن کر اس کوٹھی میں کیوں جاؤں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آخر آگئیں نا اپنے عورت پن پر' بھئی میں تمہارے فائد
کے لئے تمہیں وہاں گورنس بنا رہا ہوں۔"

"ایسا فائدہ نہیں چاہئے کہ مجھے سوکن کے قدموں پر گرنا پڑے۔"

"اسے کیا معلوم ہے کہ تم سوکن ہو؟ میں نے بہت اچھا منصوبہ بنایا ہے اگر تم میر
ساتھ دو تو ہم رضیہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔"

شائلہ نے چونک کر سرفراز کو دیکھا اگرچہ وہ خود یہی چاہتی تھی لیکن شوہر کے م
سے یہ سن کر عجیب سا لگا۔

سرفراز نے پوچھا۔ "تم حیران کیوں ہو؟ کیا ایک سوکن کو برداشت کر سکتی ہو؟"

"کبھی نہیں لیکن ایک عورت اپنی سوکن کو جلا کر' کڑھا کر' آہستہ آہستہ صدمہ پ
کر خوش ہوتی ہے۔ جان سے مارنے کی بات ہو تو ڈر لگتا ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "ہم کوئی عادی مجرم نہیں ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے کسی کو قت
نہیں کریں گے۔ کسی کو مارنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اس انداز سے ہلاک ک

جا سکتا ہے کہ کسی کو ہم پر شبہ نہ ہو۔"

"کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی منصوبہ تیار کیا ہے؟"

"پہلے تم رضیہ کے متعلق تفصیل سے سن لو۔ وہ تقریباً اپاہج ہے۔ پہیوں دار کرسی پر
بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے گھٹنے بیکار ہوگئے ہیں۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔
ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا۔ اس کے لئے بہترین دوائیں اور انجکشن تجویز کئے لیکن
میں ایسی دوائیں اور انجکشن لاتا رہا جن کے استعمال کی تاریخ گزر جاتی تھی۔ طبی نقطہ نظر
سے ایسی دوائیں جن کے استعمال کی تاریخ گزر گئی ہو' سال دو سال بعد........... بالکل بے
اثر ہو جاتی ہیں یا پھر الٹا اثر کرتی ہیں۔ جو اسٹاکسٹ ایسی دواؤں کو چھپا کر رکھتے ہیں اور
انہیں بازار میں فروخت کرتے ہیں' میں نے ان سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔"

شائلہ نے پوچھا۔ "کیا ان دواؤں کا الٹا اثر ہوا؟"

"میرے اس طرز عمل سے رضیہ کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن صحیح دوائیں نہ
ملنے کے باعث وہ آج تک اپنے پیروں سے مجبور ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں
جا سکتی۔ کوٹھی کے اندر ایک ملازمہ پہئے دار کرسی کو اِدھر اُدھر دھکیل کر لے جاتی ہے یا
پھر وہ خود اس کرسی کو اپنے ہاتھ سے ہینڈل کرتی ہے۔"

"یعنی آپ نے اسے گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا ہے۔"

"ہاں' وہ میرے باہر کے معاملات کو سمجھ نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ٹیلیفون کے
ذریعے دفتر میں رابطہ قائم کرتی ہے اکثر اسے یہی جواب ملتا ہے کہ میں کاروبار کے سلسلے
میں باہر ہوں۔ بیچاری میرا پیچھا نہیں کر سکتی' میرے خفیہ معاملات تک نہیں پہنچ سکتی۔"

شائلہ خوشی سے کھل گئی۔ ایک عورت یہی چاہتی ہے کہ اس کے مرد کی نظروں
سے دوسری عورت گر جائے۔ اس نے کہا۔ "جب وہ بالکل مجبور اور بے بس ہے' اپنے
کمرے یا کوٹھی تک محدود رہتی ہے تو پھر اس سے پیچھا چھڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ
اسی طرح کنویں کے مینڈک کی طرح ایک محدود زندگی گزار کر مرجائے گی۔"

سرفراز نے انکار میں سرہلا کر کہا۔ "اس کے مرنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ وہ
بہت صحت مند ہے' بہت ہی زندہ دل ہے۔ اس سے پہلے کہ فکر اسے کھائے' وہ فکر کو کھا

جاتی ہے۔ ہمیشہ ہنستی بولتی رہتی ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک تمام حکماء اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے ہیں وہ اس دنیا میں طویل عمر گزار تے ہیں۔"

"میں سمجھ گئی۔ اسے فکر اور پریشانی میں مبتلا کرنا ہوگا تاکہ وہ اندر ہی اندر گھا رہے۔"

"ہاں' یہ ایک طریقہ ہوسکتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اور بات ہے۔ رضیہ ڈاکٹروں سے مایوس ہونے کے بعد ایک بہت ہی نامور اور تجربہ کار حکیم سے علاج کرا ر ہے۔ اس حکیم نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی تیار کردہ مالش کی دوا کو صبح و شام گھٹنوں لگایا جائے تو تیس دن کے اندر وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔"

شمائلہ نے کہا۔ "میں جب تک ہوں اسے کھڑے ہونے کے لئے پاؤں تلے زمین نہیں ملے گی۔"

"شاباش۔ میں چاہتا ہوں وہ مالش کی دوا اس کے گھٹنوں تک نہ پہنچے۔ تم وہاں ر گی تو اس دوا کو بدل دو گی۔ میں ایسی ہی دوسری دوا تیار کرا کے تمہیں دے دوں گا۔ ا کی شیشی وہی رہے گی' اندر کی چیز بدل جائے گی۔"

"یہ ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ محدود کارروائیاں ہیں یعنی ہم رضیہ کو صرف اپاہج بنا کر رکھ سکتے ہیں۔ ا کوٹھی تک محدود کر سکتے ہیں لیکن اسے اس کی آخری سانس تک نہیں پہنچا سکتے۔"

"اس کا بھی کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

"میں نے راستہ نکال لیا ہے۔ بہت بڑی قیمت دے کر ایسی دوا حاصل کی ہے' روزانہ ایک چٹکی دودھ میں گھول کر اسے پلایا جائے تو دو چار ماہ بعد وہ ختم ہو جائے گی کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ اسے سلو پوائزن دیا گیا ہے۔"

"کیا وہ رات کو سونے سے پہلے دودھ پیا کرتی ہے؟"

"میں نے کہا نا' وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہے۔ صبح اٹھ کر سیب کھاتی اور ایک گلاس دودھ پیتی ہے۔ رات کو بھی سونے سے پہلے دودھ پیا کرتی ہے۔"

"دودھ میں وہ چٹکی بھر دوا کون ملائے گا؟"

"تم' اور کون؟"

"میں تو شام کو چلی جایا کروں گی۔"

"کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ دو چار ماہ رات کے دس بجے تک وہاں رہا کرو۔ زیادہ ، زیادہ رضیہ کا اعتماد حاصل کرو۔ اسے دودھ پلا کر سلانے کے بعد جایا کرو۔ کیا ہرج ؟"

"کوئی ہرج تو نہیں ہے۔ کیا اس ملازمہ کو آپ اپنے اعتماد میں نہیں لے سکے؟ اسے دہ سے زیادہ رقم کا لالچ دیا جائے تو..........."

سرفراز نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں کسی پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ کوئی برا ت آیا تو ملازمہ کے منہ سے سچی بات نکل سکتی ہے۔"

"آپ نے مجھ پر کیسے بھروسہ کر لیا ہے؟"

وہ اٹھ کر ٹہلنے کے انداز میں دور گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ تماد کرنے کے لئے راستے ہموار کئے جاتے ہیں۔ آج صبح تک تم میرے لئے اجنبی ں۔ ناقابلِ اعتماد تھیں۔ شادی کے بعد تم میری ہو گئیں۔ تمہیں ایک بہترین مستقبل میری بھرپور محبت اور توجہ چاہئے۔ یہ ہر عورت چاہتی ہے۔ تم بھی چاہتی ہو۔"

"بے شک یہی چاہتی ہوں۔"

"یہی سوچ سمجھ کر میں نے تم سے شادی کی' تم میری رہو گی تو میرے اشارے پر گی۔ کسی برے وقت پر میرے خلاف اس لئے بیان نہیں دو گی کہ میں تمہارا سہاگ ں اور عورت اپنے ہاتھوں سے اپنا سہاگ نہیں اجاڑتی۔"

شمائلہ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ میں نے تمہارے حسن سے ، تمہاری ذات سے متاثر ہو کر تم سے شادی کی ہے تو وہ خوشی سے پھول جاتی۔ مرد خواہ پنے مطلب سے ہی شادی کرے لیکن بیوی کے سامنے جھوٹ ہی کہہ دے کہ اس نے س کی ذات سے متاثر ہو کر اسے شریکِ حیات بنایا ہے تو عورت کا غرور رہ جاتا ہے۔

وہ ذرا مایوس ہوئی پھر مصلحتاً مسکرانے لگی۔

رضیہ وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اجلی رنگت اور چہرے کے نقوش دیدہ زیب تھے۔ جسمانی طور پر اچھی صحت مند تھی۔ اس کی موجودگی میں صبروشکر سے رہنے والا کوئی مرد دوسری شادی نہیں کرسکتا تھا اس میں کوئی نقص نکالنے والی بات ہوتی تو صرف اتنا ہی کہا جاسکتا تھا کہ اس کی عمر کچھ زیادہ ہے۔ شاید وہ پینتیس یا چھتیس برس کی تھی اگر یہ کوئی نقص تھا تو سرفراز اس کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی عمر رسیدہ تھا۔

شائلہ گورنس کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے ایک امیدوار کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور رضیہ کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف رضیہ اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے رہی تھی۔ دو عورتیں جب ایک دوسرے کے مقابل آتی ہیں تو چپکے چپکے ایک دوسرے کو ناپتی تولتی ہیں اور اپنے دل کو اپنی برتری کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔ رضیہ نے اس کا نام اور پتہ معلوم کرنے کے بعد پوچھا۔ "کیا تم میرے میاں کو جانتی ہو؟"

"جی ہاں' اخبار میں اشتہار پڑھنے کے بعد میں ان کے دفتر گئی تھی۔ انہوں نے مجھے یہاں کا پتہ بتایا اور کہا کہ گھر کے معاملے میں ان کا عمل دخل نہیں ہے۔ گورنس کا انتخاب آپ کریں گی۔"

وہ ذرا خوش ہوئی' ذرا مسکرائی۔ پھر طنزیہ انداز میں بولی۔ "میں ہاتھی کا دانت ہوں صرف دکھانے کے لئے ہوں ورنہ ان کی ہی مرضی چلتی ہے۔ میں اگر تمہیں ناپسند کردوں تو وہ کسی دوسری عورت کو گورنس کی حیثیت سے یہاں آنے نہیں دیں گے' اسے اپنے دفتر ہی سے ٹال دیں گے۔"

"آپ چاہیں تو اشتہار میں اس کوٹھی کا پتہ دے کر امیدوار عورتوں کو یہاں بلاسکتی ہیں اور خود ہی گورنس کے لئے کسی کا انتخاب کرسکتی ہیں۔"

"میں نے اپنی مرضی سے ایک عورت کا انتخاب کیا تھا لیکن وہ کام کرنے آئی تو اس کے دو دن بعد میرے کمرے سے دو ہزار روپے نقد چوری ہوگئے۔ اب یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس نے چوری کی یا اس پر الزام عائد کیا گیا۔ بہرحال وہ نکال دی گئی۔" یہ کہہ کر

رضیہ نے شائلہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "اس سلسلے میں سرفراز کا ہی انتخاب چلے گا۔ میں اپاہج ہوں' خود مجبور ہوں۔ چپ چاپ تماشا دیکھتی رہوں گی۔"

شائلہ نے انکار میں سرہلا کر کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں ایسی ملازمت قبول نہیں کروں گی جس میں آپ کی مرضی شامل نہ ہو۔ میں آپ کے اور آپ کی بچی کے لئے آئی ہوں۔ اس لئے پسند آپ کی ہوگی ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

رضیہ اس کی بات پر خوش ہوگئی۔ اس نے ذرا اعتبار سے شائلہ کو دیکھا۔ پھر بے اعتباری سے پوچھا۔ "کیا تم انکار کرکے چلی جاؤ گی تو سرفراز کو افسوس نہیں ہوگا؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ بھلا انہیں میری کامیابی یا ناکامی سے کیا واسطہ؟ آپ یقیناً میرے متعلق کوئی غلط رائے قائم کر رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ میں اس ملازمت سے باز آجاؤں۔"

وہ جانے کے لئے دروازے کی طرف گھوم گئی۔ رضیہ نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ٹھہرو۔ میں جن حالات سے گزر رہی ہوں اس میں کسی پر شبہ کرنا ایک فطری امر ہے لیکن تمہاری باتوں سے مجھے اطمینان ہو رہا ہے۔"

شائلہ کو اپنی کامیابی پر خوشی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا۔ سنجیدگی سے رضیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "بیگم صاحبہ! اگر میاں بیوی کے درمیان اعتماد نہ ہو تو کوئی بھی ملازمہ آکر گھر کو اور زیادہ تباہ کرسکتی ہے۔"

رضیہ نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بہت سمجھدار ہو۔ مجھے یقین ہے' تم میرے میاں سے دور دور رہ کر میرے اعتماد کو بحال رکھو گی۔"

نوکری پکی ہوگئی۔ شائلہ تمام دن رضیہ کے ساتھ رہی۔ دوپہر کو کھانے سے پہلے ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کار کوٹھی کے پورچ میں آکر رکی۔ وہ کار سرفراز کی بیٹی مونا کے لئے مخصوص تھی۔ مونا سات برس کی ایک گڑیا جیسی خوبصورت سی لڑکی تھی۔ اسکول سے آئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں شائلہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ رضیہ نے کہا۔ "بیٹی یہ تمہاری نئی گورنس ہیں۔ انہیں سلام کرو اور انہیں آنٹی کہا کرو۔"

اس نے سلام کیا۔ پھر مصافحے کے لئے ننھا سا ہاتھ بڑھایا۔ شمائلہ نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پھر اس کو چوم کر کہا۔ ”تم تو بالکل گڑیا جیسی ہو۔“

وہ سوکن کی بچی تھی۔ دل نے کہا۔ ”اتنی سی چھوکری کے بڑے ٹھاٹ ہیں۔ اس کے لئے الگ کار خریدی گئی ہے۔ کیا میری کوئی اولاد ہوگی تو اس کے لئے بھی ایسا ہی رئیسانہ لاڈ پیار ہوگا؟ اس چھوکری سے کچھ بچے گا تو ہوگا ورنہ یہی سب کچھ سمیٹ رہی ہے۔ ساری دولت یہی لٹا دے گی۔“

وہ اپنے اسکول کا بستہ اٹھائے ڈرائنگ روم کے زینے سے چڑھتے ہوئے اوپری کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ زینہ کافی اونچائی تک تھا۔ معاً خیال پیدا ہوا مونا دھان پان سی لڑکی ہے، کچھ بیمار سی نظر آتی ہے۔ ماں کی طرح صحت مند نہیں ہے۔ اگر زینے کی بلندی سے کسی طرح گر پڑے تو لڑھک کر نیچے آنے تک اس کا دم نکل جائے گا۔

رضیہ نے ملازمہ سے کہا۔ ”شبو! کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔ بچی کا بستہ لے کر اس کے کمرے میں جاؤ۔“ پھر اس نے شمائلہ سے کہا۔ ”میری مونا اتنی سی عمر میں سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے اوپر کمرے میں تنہا رہتی ہے۔ لباس خود بدلتی ہے۔ میں نے اسے اپنا کام خود کرنے کا عادی بنایا ہے۔ ایک گلاس پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ خود اٹھ کر پیتی ہے۔“

شمائلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اگر آپ ٹانگوں سے مجبور نہ ہوتیں تو اپنی بیٹی کی طرح خود کسی کی محتاج نہ رہتیں مگر افسوس۔“

شبو، زینے پر چڑھتی جا رہی تھی۔ شمائلہ نے کہا۔ ”شبو! تم بیگم صاحبہ کے پاس رہو۔ میں مونا کے ساتھ تھوڑا وقت گزاروں گی، ہم دوستی کریں گے۔“

وہ رضیہ سے اجازت لے کر تیزی سے چلتے ہوئے، زینے چڑھتے ہوئے اوپر مونا کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اسے گود میں اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ رضیہ بڑی محبت سے، بڑی ممتا سے کبھی مونا اور کبھی شمائلہ کو دیکھ رہی تھی۔

دل جیتنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور شمائلہ ان اصولوں کو جانتی تھی اور انہیں برتنا بھی آتا تھا۔ شام تک رضیہ نے قائل ہو کر کہا۔ ”تم واقعی اپنے فرائض ادا کرنا جانتی ہو۔

میں تم سے بہت خوش ہوں۔“

رات کے کھانے کے وقت سرفراز بھی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”رضیہ! کیا مس شمائلہ رات کو بھی رہا کریں گی؟“

رضیہ نے کہا۔ ”میں تو کہہ رہی تھی، یہ شام کو چلی جایا کرے۔“

”میں بیگم صاحبہ کے سونے کے بعد چلی جاؤں گی۔ پھر صبح سات بجے سے پہلے آجایا کروں گی تاکہ مونا کو اسکول کے لئے تیار کر سکوں۔“ شمائلہ نے کہا۔

رضیہ نے مسکراتے ہوئے سرفراز کو دیکھا۔ سرفراز نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی مبارک ہو۔ تم جیسی گورنس چاہتی تھیں ویسی مل گئی۔ اب میری بہت سی فکریں دور ہو جائیں گی۔ میں دفتر جاتا تھا تو تمہارا ہی خیال پریشان کرتا رہتا تھا۔“

شمائلہ اور سرفراز خوب اداکاری دکھا رہے تھے۔ رضیہ ساڑھے نو بجے بستر پر پہنچ جاتی تھی۔ شبو، کچن میں اس کے لئے دودھ گرم کر رہی تھی۔ شمائلہ نے کہا۔ ”آج سے میں دودھ گرم کروں گی اور بیگم صاحبہ کو پلایا کروں گی۔ تم دوسرا کام کرو۔“

وہ چلی گئی۔ کچن کی ایک کھڑکی باہر پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے سرفراز کی سرگوشی سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر کھڑکی کے پاس آ کر بولی۔ ”آپ یہاں کیوں آئے ہیں اگر شبو نے دیکھ لیا تو؟“

”میں ہر طرح سے مطمئن ہو کر آیا ہوں۔ وہ دوا کہاں ہے جو میں نے تمہیں دی تھی؟“

شمائلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر میں پرس لے کر کچن میں آتی تو شبو یہ بات رضیہ سے ضرور کہتی۔ بھلا کچن میں پرس کی کیا ضرورت ہے؟“

سرفراز نے تیور بدل کر ناگواری سے پوچھا۔ ”کیا تم آج کا دن ضائع کر دو گی؟“

شمائلہ کوئی جواب دیئے بغیر دودھ کے گلاس کے پاس گئی پھر اس گلاس کو اٹھا کر کھڑکی کے پاس آگئی۔ سرفراز نے کہا۔ ”ایک ایک دن قیمتی ہے۔ یہ سلو پوائزن دیر سے اثر کرتا ہے۔ پتہ نہیں ہمیں کتنے ماہ تک اس کے نتیجے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھئے۔“ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی دو

انگلیاں دودھ میں ڈبو دیں۔

سرفراز نے پوچھا۔ "یہ کیا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "عورتیں ناخن بڑھا کر رکھتی ہیں۔ ان ناخنوں کا کوئی تو استعمال ہونا چاہئے۔ ہم جو دوا رضیہ کو استعمال کرا رہے ہیں وہ ایک رقیق لیس دار مادہ ہے۔ اس دوا کو شیشی سے باہر نکال کر تھوڑی دیر رکھا جائے تو وہ جم جاتی ہے۔ وہ تھوڑی سی دوا میرے دونوں ناخنوں کے اندر جم گئی ہے اور اب یہ دودھ میں گھل رہی ہے۔"

وہ خوشی سے جھوم کر بولا۔ "بھئی کمال کر دیا تم تو میری توقع سے زیادہ چالاک نکلیں۔"

"عورت کے پاس بھی عقل ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرد تسلیم نہیں کرتے۔"

"کیسے تسلیم کریں۔ عورت کے پاس جو عقل ہوتی ہے اس کے گھمنڈ میں وہ حماقتیں کر بیٹھتی ہے۔ کہیں تم ایسا نہ کرنا۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" اس نے مسکرا کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر دودھ کا گلاس لے کر کچن سے چلی گئی۔

دو دن بعد سرفراز کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر چلا گیا۔ وہ ایک رات گزار کر وہاں سے واپس آنے والا تھا۔ رضیہ نے کہا۔ "آج میں اکیلی ہوں۔ تم گھر نہ جاؤ' آج رات میرے پاس رہ جاؤ۔"

شمائلہ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ مجھے بہنوں کی طرح چاہنے لگی ہیں۔ ہمیشہ مجھے اپنے قریب رکھنا چاہتی ہیں۔"

"جانے کیوں تم سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ تم مجھے اپنوں جیسی لگتی ہو اور دیکھو تم مجھے بیگم صاحبہ نہیں' باجی کہا کرو۔"

وہ رضیہ کو باجی کہنے لگی۔ اس رات وہ دونوں خوب گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ اس رات شمائلہ کو دو ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا ذکر سرفراز نے اس سے نہیں کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ رضیہ ایک مالدار بیوہ تھی اور سرفراز اس کے سابق شوہر کا دوست بھی تھا اور اس کے ہاں منیجر بھی۔ رضیہ نے کہا۔ "مونا کی پیدائش سے چند روز پہلے میرے شوہر کا

انتقال ہو گیا۔ میں دو برس تک بیوہ کی حیثیت سے زندگی گزارتی رہی۔ سرفراز میری دلجوئی کرتے تھے۔ انہوں نے میرے کاروبار کو سنبھال لیا۔ وہ میرے دل سے شوہر کی موت کا صدمہ بھلانے کے لئے مختلف تفریحات میں مصروف رکھتے تھے۔ کبھی پہاڑی علاقوں کی سیر کراتے' کبھی ملک سے باہر لے جاتے۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ میں اب سے متاثر ہوتی جا رہی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال بعد میں نے ان سے شادی کر لی۔"

شمائلہ نے پوچھا۔ "تو یہ کوٹھی یہ دولت' یہ جائیداد اور یہ سارا کاروبار سب آپ کا ہے؟"

"ہاں' ابھی تو میرا ہے' میرے مرنے کے بعد آدھا مونا کا اور آدھا سرفراز کا ہو گا۔"

"آپ کے یہ دونوں گھٹنے بیکار کیسے ہو گئے۔"

"نصیب کی خرابی ہے۔ اب سے چار سال پہلے کی بات ہے' ہماری کار میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ سرفراز اس کا بونٹ اٹھا کر اسے درست کر رہے تھے۔ پھر وہ کار میں آکر بیٹھ گئے' اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں پیچھے کھڑی ہوں۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ آگے ایک آیا' مونا کو گود میں لئے کھڑی تھی۔ شاید اسی لئے انہوں نے گاڑی کو بیک کیا۔ پھر میری چیخ سنتے ہی فوراً اسے روک دیا اور گاڑی سے اتر کر دوڑتے ہوئے آئے۔ اس وقت تک میں زمین پر گر پڑی تھی گاڑی اچانک ہی میرے دونوں گھٹنوں سے ٹکرائی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے جسم کے باقی حصے کو ٹکرانے سے بچا لیا تھا۔ اس دن سے میری یہی حالت ہے۔ میں نے کتنے ہی ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن فائدہ نہیں ہوا۔"

"باجی! آپ نے جس مالش کی دوا کا ذکر کیا ہے' میں اسے صبح و شام آپ کے گھٹنوں پر لگایا کروں گی۔ آپ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائیں گی۔"

وہ مایوس ہو کر بولی۔ "چار سال گزر گئے ہیں' ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے پاؤں پر کبھی کھڑی نہیں ہو سکوں گی۔ اسی لئے میں نے مایوس ہو کر انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دی ہے۔"

شمائلہ نے چونک کر رضیہ کو دیکھا پھر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"جب میں نے محسوس کیا کہ میں ان کے ساتھ سماجی زندگی نہیں گزار سکتی اور ا اپنے ساتھ ایک عورت کی کمی محسوس کرتے ہیں تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ س لڑکیوں سے دوستی نہ کریں، گناہ کی دلدل میں پھنسنے سے بہتر ہے دوسری شادی کرلیں۔"

"آپ نے انہیں شادی کی اجازت کب دی؟"

"اب سے تقریباً دو ماہ پہلے۔ وہ آج کی طرح کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر گ تھے۔ اسی شام منیجر کسی ضرورت سے کوٹھی میں آیا۔ میرے سوالات کرنے پر پہلے تو بدحواس سا ہوگیا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ یہ سچ بولنے کا انعام رکھو جھوٹ بولو گے تو ملازمت سے نکال دوں گی۔ تب اس نے بتایا کہ صاحب شہر سے باہ نہیں گئے ہیں بلکہ اسی شہر میں کہیں، کسی کے ساتھ رات گزار رہے ہیں۔"

یہ سن کر شمائلہ کے دماغ میں بھی آندھیاں سی چلنے لگیں آخر وہ بھی بیوی تھی۔ و کیسے برداشت کرتی کہ اس کا شوہر دوسرے شہر جانے کے بہانے اسی شہر میں کہیں رنگ رلیاں مناتا رہے۔ اس نے پوچھا۔ "باجی! کیا صاحب آج بھی شہر سے باہر نہیں گئے ہو گے؟"

"یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ میں اس دن کی بات کہہ رہی ہوں جب مجھے منیجر کی زبا سے یہ حقیقت معلوم ہوئی تو میں رات بھر سو نہ سکی۔ پیچ و تاب کھاتی رہی۔ آدھی را کے بعد میرا دماغ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو سرفراز مجھے بے قصور نظ آئے۔ لہٰذا دوسرے دن وہ آئے تو میں نے ان سے قسم کھا کر کہا۔ میں دوسری شادی ک اجازت دیتی ہوں لیکن خدا کے لئے گنہگار نہ بنیں۔"

شمائلہ نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیا انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے؟"

"میں یہ بھی نہیں جانتی۔ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہو ہے۔ میں نے ایک پکے کاغذ پر لکھ دیا تھا کہ میں راضی خوشی اپنے شوہر سرفراز احم دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں۔ اس گھر میں میری سوکن آئے گی، میں اس خندہ پیشانی سے قبول کروں گی۔"

شمائلہ یہ باتیں سن رہی تھی اور اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھی۔ غصے کی با

ہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، اس کو اپنے بس میں رکھنے کے لئے، اس کی ہر بات پر عمل کر رہی تھی۔ اس کی سازش میں شریک تھی۔ وہ کبھی ایک چیونٹی کو بھی ہلاک نہیں کر سکتی تھی لیکن شوہر کے کہنے سے سوکن کو سلو پوائزن دے رہی تھی اور اس کا نتیجہ یہ مل رہا تھا کہ وہ اس سے بہت سی باتیں چھپا رہا تھا اور اسے قابل اعتبار نہیں سمجھ رہا تھا۔

سرفراز دوسرے دن واپس آگیا۔ شمائلہ سے ملنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ رات کو رضیہ جب اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی تو اسے اطمینان ہوتا تھا۔ وہ اوپری منزل میں آکر اس کی خواب گاہ پر دستک دینے کے قابل نہیں تھی اور اس نے ملازموں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ جب وہ خواب گاہ میں جاکر سوجایا کرے تو کوئی دروازے پر دستک نہ دے۔ سرفراز کے کمرے کے پچھلے دروازے سے ایک زینہ پائیں باغ کی طرف جاتا تھا۔ وہ اس زینے سے اتر کر چپ چاپ کوٹھی کے باہر آتا تھا۔ چوکیدار اپنا آدمی تھا۔ رشوت سے کام چل جاتا تھا۔ شمائلہ کی رہائش گاہ اس کوٹھی سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہ پیدل چلتا ہوا وہاں پہنچ جاتا تھا۔

دوسری رات جب وہ شمائلہ کے کاٹیج میں آیا تو وہ غصے میں تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "کل رات کہاں گئے تھے؟"

"کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی رضیہ سے آپ نے یہی بہانہ کیا تھا لیکن آپ کی چوری پکڑی گئی تھی۔ آپ کس کے ساتھ رات گزار کر آئے ہیں۔"

"اچھا تو رضیہ نے تمہیں یہ بھی بتا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں میں بڑی بے تکلفی ہوگئی ہے۔"

"میں کسی کو بھی دوست بنانے کا فن جانتی ہوں۔ افسوس کہ آپ کو اپنا بنانے میں ناکام ہو رہی ہوں۔ مجھ میں کیا کمی ہے کہ آپ جھوٹ بول کر دوسری جگہ جاتے ہیں۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ رضیہ نے جو کچھ کہا، وہ درست ہے۔ اس وقت میں بھٹکا ہوا تھا لیکن اب تمہاری جیسی حسین بیوی مل گئی ہے۔ میں واقعی کاروبار کے سلسلے

میں گیا تھا۔"

وہ ذرا نرم پڑ گئی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ وہ دوبارہ غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ "آپ نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا کہ رضیہ باجی نے آپ کو دوسری شادی کی اجازت دے رکھی ہے؟"

سرفراز نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "تم رضیہ کو باجی کہہ رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"یہ ان کا حکم ہے کہ میں انہیں باجی کہا کروں۔"

"پھر تو واقعی تم نے اس عورت کا دل جیت لیا ہے لیکن اسے یہ معلوم ہو جائے کہ تم اس کی سوکن ہو تو؟"

"جب معلوم ہو جائے گا تب دیکھا جائے گا۔ آپ میرے سوال کو ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر میں تمہیں یہ بتا دیتا کہ رضیہ تمہیں سوکن کی حیثیت سے قبول کر سکتی ہے تو تم گورنس بن کر وہاں کبھی نہ جاتیں۔"

"میرا گورنس بن کر جانا کیا ضروری تھا؟"

"اگر تم سوکن بن کر جاتیں تو شاید وہ اپنے وعدے کے مطابق خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی لیکن تمہارے ہاتھ سے دودھ کا ایک گلاس تو کیا' پانی بھی نہ پیتی۔ پھر ہمارا منصوبہ دھرا کا دھرا ہی رہ جاتا۔"

"میں جانتی ہوں' آپ خوب سوچ سمجھ کر اپنے منصوبے پر عمل کر رہے ہیں لیکن آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟"

"تمہیں پہلے بتا دیتا تو تم یہاں سوکن بن کر آنے کی ضد کرتیں عورت کو جب دوسری عورت کے برابر کا درجہ ملتا ہے تو وہ اس سے نیچے جانا پسند نہیں کرتی۔ تم بھی گورنس بننے کے لئے راضی نہ ہوتیں۔ مجھے تمہارے پیچھے سر کھپانا پڑتا' تمہیں سمجھانا پڑتا یا پھر یہی ہوتا کہ میں تم سے شادی نہ کرتا۔ اس طرح میرا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ میں نے جو کیا ہے' سوچ سمجھ کر کیا ہے اگر میں نے سوکن کے سلسلے میں رضیہ کی رضامندی

ہیں نہیں بتائی ہے تو کون سی قیامت آ گئی ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں ہیں کسی معاملے میں دھوکا دے رہا ہوں یا تم پر اعتماد نہیں کرتا ہوں۔ بھئی عورت کی ئل پر جس حد تک بھروسہ کرنا چاہئے' میں اسی حد تک کر رہا ہوں۔ میرا ساتھ دینا ہے تو ورنہ یونہی میری بیوی بن کر رہو جو تمہارے نصیب میں ہوگا' تمہیں ملتا رہے گا مگر زین مستقبل کے خواب نہ دیکھنا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ سے سر تھام لیا پھر اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سر اٹھا کر چھا۔ "آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ رضیہ ایک مالدار بیوہ تھی اور آپ کے پاس جو ھ بھی ہے سب اس کا دیا ہوا ہے۔"

"یہ بتانا کیا ضروری تھا؟"

"اور اگر بتا دیتے تو آپ کا کیا نقصان ہوتا؟"

"میں تم پر رفتہ رفتہ بھروسہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں اگر یہ بتا دیتا کہ رے پاس میری بیوی کی دی ہوئی دولت ہے تو تم میرے منصوبے میں شریک نہ ہوتیں' یں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا کہ ناکامی کی صورت میں مجھے دولت نہیں ملے گی۔ مجھے ل ملے گی تو تمہیں بھی نہیں ملے گی۔"

"ہماری شادی کو آج ساتواں دن ہے' اتنے دنوں میں آپ بتا سکتے تھے۔"

"میں تو بتانے ہی والا تھا۔ تم نے پہلے ہی یہ بات چھیڑ دی' میں کیا کروں۔"

شائلہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ پھر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "مرد سے جیتنا بہت مشکل ہے۔"

سرفراز فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

☆======☆======☆

ایک ماہ گزر گیا۔ نتیجہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ پہلے رضیہ نے کمزوری کی شکایت کی۔ ؟
دوسرے تیسرے دن اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ سرف
نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بلا کر دکھایا۔ ان کا بھرپور معائنہ کرایا۔ ڈاکٹروں نے اپنی دانس
میں بہترین دوائیں دیں۔ اسے تسلیاں بھی دیں۔ اس طرح ایک ماہ گزر گیا مگر اس
بیماری بڑھتی گئی۔

بیماری کیا تھی' بس کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کو پریشانی تھی کہ اس
مرض کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بس وہ اندر ہی اندر کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک ماہ
اس پر دورہ پڑنے لگا۔ دورے کی حالت میں اس پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر پریش
ہو جاتے تھے وہ اپنے سے اونچے اور زیادہ تجربہ کار ڈاکٹروں کے نام تجویز کرتے تھے۔
بڑے سے بڑے تجربہ کار ڈاکٹروں کو بھی بلایا گیا۔ اس طرح دوسرا مہینہ بھی گزرنے لگا۔

شمائلہ نے مسکرا کر سرفراز سے کہا۔ "واقعی آپ نے اس دوا کے جو نتائج بتا
تھے' وہی ظاہر ہو رہے ہیں۔ ویسے ہی اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' ویسے ہی اس کا
ڈوبنے لگتا ہے' یہ کمزور ہو گئی ہیں۔ بظاہر تو صحت مند نظر آتی ہیں مگر اندر سے کھو
ہو چکی ہیں۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے سنگھار میز کے آئینے کے سامنے گئی' اپنے پرس کو کھول
موتیوں کا ایک ہار نکالا اور اسے پہننے لگی۔ سرفراز نے چونک کر پوچھا۔ "یہ ہار تم کہاں
لائی ہو؟"

وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "باجی نے دیا ہے۔ کیسی

ہی ہوں؟"

"یہ سچے موتی ہیں۔ بہت قیمتی ہیں۔ رضیہ نے تمہیں کیسے دے دیا؟"

"میری خدمات سے خوش ہو کر۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے آئینے کے پاس سے ہٹ کر
ی۔ "عورت فیاضی پر اتر آئے تو اپنی ملازمہ کو سچے موتیوں کا ہار دے دیتی ہے لیکن وہ
نی بھی فیاض ہو جائے اپنی سوکن کو ایک کنکر بھی نہیں دیتی۔"

سرفراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیچاری سے انعام بھی لیا ہے اور اس کی ہنسی بھی
ڑا رہی ہو۔"

"میں نے سوکنوں کا روپ دیکھا ہے۔ میری ماں کو بھی اسی طرح تڑپا تڑپا کر مارا گیا
ہے۔ میری ماں کی سوکن کے پاس سست اثر زہر نہیں تھا لیکن اس کے رویے نے آہستہ
آہستہ میری امی کو اذیتوں میں مبتلا کر کے مار ڈالا تھا۔ میں اسے بھول نہیں سکتی۔"

"بھولنا بھی نہیں چاہئے۔ اسی طرح تم میرے منصوبے کی تکمیل کرو گی۔"

پھر وہ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک موتیوں کے ہار
و اپنے گلے میں دیکھتی رہی پھر اس نے اسے اتار دیا۔ آہنی الماری کے پاس گئی۔ اسے
ھول کر اس کی ایک دراز میں رکھ دیا۔ سرفراز خاموشی سے شمائلہ کو دیکھ رہا تھا اور کچھ
وچ رہا تھا۔

تیسرے مہینے رضیہ کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ پہلے وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر اپنی
وٹھی کے اندر گھوم پھر لیتی تھی۔ اب وہ بستر تک محدود ہو گئی۔ وہیں سوتی تھی' وہیں
ہتی تھی' وہیں بیٹھ کر کھاتی تھی۔ اس کی گوری رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد
لقے گہرے ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اب تب کی مہمان ہو۔

ڈاکٹر بخاری نے سرفراز سے کہا۔ "پتہ نہیں آپ لوگوں نے پہلے کن ڈاکٹروں سے
لاج کرایا ہے۔ انہوں نے جو خون وغیرہ کی رپورٹ دی ہے' اس سے میں مطمئن نہیں
ہوں۔ لہٰذا میں خون کی رپورٹ حاصل کروں گا۔"

یہ بات سرفراز کو کھٹکنے لگی۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ خون میں زہریلے جراثیم یا
کوئی زہریلا پن پایا جائے گا تو بات کھل جائے گی اور بات کھلنے سے پہلے ہی اس خونی

ڈرامے کا اختتام ہو جانا چاہئے۔

سردی کی رات تھی۔ آٹھ بجے تھے۔ رضیہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شائلہ کھانے کی ٹرے لاکر اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ رضیہ نے کہا۔ "میری مونا کو بلالو۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔"

شبو نے ڈرائنگ روم میں جاکر وہاں سے مونا کو آواز دی۔ اوپر سے مونا نے کہا "میں ابھی آرہی ہوں۔" ملازمہ وہاں سے رضیہ کی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی مونا اپنے کمرے سے نکلی۔ ڈرائنگ روم میں ہلکی سی روشنی تھی' اوپر برآمدے کے دو دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک دروازے کے پیچھے کوئی چھپا ہوا تھا۔ اوور کوٹ اور فیلٹ ہیٹ نظر آرہا تھا۔ مونا نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زینے کے اوپری حصے میں پہنچی پھر جیسے ہی اس نے ایک زینے کے پائیدان سے دوسرے پائیدان پر قدم رکھا' اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ پھر وہ لڑھکتے ہوئے نیچے کی طرف جانے لگی۔

چیخ کی آواز خواب گاہ تک پہنچی تھی۔ رضیہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ بیٹی کی چیخ سن کر ممتا تڑپ گئی۔ اس نے کھانے کی ٹرے کو ایک طرف پھینکا۔ مونا کو پکارتی ہوئی' چیختی ہوئی بستر سے اٹھ کر بھاگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ شائلہ اس کے ساتھ بھاگی آئی تھی اس وقت تک مونا زینے سے نیچے آکر فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد شائلہ اپنے کاٹیج میں آئی۔ سرفراز وہاں موجود تھا۔ اس نے صبح رضیہ سے کہہ دیا تھا کہ آج شہر سے باہر جارہا ہے اس لئے رات کو نہیں آئے گا۔ دوسری طرف شائلہ سے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات اس کے ساتھ آزادی سے گزارنا چاہتا ہے اس لئے رضیہ سے بہانہ کیا جارہا ہے۔

شائلہ نے اسے دیکھتے ہی غصے سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھے قانون کے شکنجے میں پھانسنا چاہتے ہیں؟"

اس نے بے تابی سے کہا۔ "پہلے مونا کے متعلق بتاؤ۔ کیا وہ زندہ ہے؟"

"جی ہاں' وہ صرف بے ہوش ہوگئی تھی۔"

سرفراز جھنجلا گیا۔ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بڑی گڑبڑ ہوگئی۔" پھر اس نے شائلہ کو دیکھ کر پوچھا۔ "رضیہ کو شاک پہنچا ہوگا۔ بیٹی زینے پر سے گری ہے' اسے صدمہ پہنچنا چاہئے۔"

"آپ نے تو یہی سوچا تھا۔ رضیہ باجی موت کے دہانے پر ہیں۔ اب تب میں دم نکلنے والا ہے۔ بیٹی کے حادثے کے متعلق سنیں گی تو ان کا دم نکل جائے گا۔"

"ہاں' تو کیا ہوا؟ کچھ بولو تو سہی؟"

"بندہ سوچتا کچھ ہے' خدا کرتا کچھ ہے۔ بیٹی کی چیخ سن کر وہ بے اختیار مشینی انداز میں بستر سے اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹی کے پاس پہنچ گئیں۔"

سرفراز نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جو چار برس سے اپنے ایک پاؤں پر بھی کھڑی نہ رہ سکی' وہ دونوں پاؤں سے دوڑنے لگی؟"

"بے شک' میں آنکھوں دیکھی بات کر رہی ہوں۔"

"میں یقین نہیں کرسکتا۔"

"آپ کے یقین نہ کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔"

اس نے پھر بے یقینی سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو آپ سن رہے ہیں۔ آپ میری بات کا جواب دیں۔ مجھے قانون کے شکنجے میں کیوں پھانسنا چاہتے ہیں۔ پولیس انسپکٹر کہہ رہا تھا کہ میں نے مونا کو زینے پر سے گرایا ہے۔"

"یقیناً انسپکٹر کسی ثبوت کے بغیر تم پر الزام عائد نہیں کرسکتا۔"

"ہاں' ثبوت آپ نے فراہم کیا ہے۔ آپ نے میری الماری سے موتیوں کا ہار نکال لیا۔ اس ہار کو توڑ کر زینے کی بلندی پر بکھیر دیا۔ بے چاری مونا وہاں سے اترنے لگی تو اس کے پاؤں کے نیچے موتی آئے اور وہ رپٹ گئی۔"

"اسے بلندی سے گرانے کے لئے موتیوں کو وہاں بکھیرنا ضروری تھا۔"

"کیوں ضروری تھا؟ آپ وہاں کیلے کے چھلکے پھینک سکتے تھے۔ آپ نقاب میں

چھپ کر اسے دھکا دے سکتے تھے لیکن وہ موتی میری ملکیت تھے۔ اس کی گواہی رضیہ باجی بھی دے سکتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ ہار مجھے انعام کے طور پر دیا تھا للذا یہی ثابت ہورہا ہے کہ موتیوں کو بکھیرنے والی میں ہوں۔ آپ نے میرے خلاف خوب جال بچھایا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ یہ بتاؤ جب تمہارے خلاف ثبوت مل چکا ہے تو انسپکٹر نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا؟"

"میں نے بیان دیا ہے کہ وہ ہار پچھلی رات گم ہوگیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتی رہ گئی۔ چوری کی رپورٹ درج نہ کرا سکی۔ انسپکٹر میری بات کا یقین نہیں کرسکتا تھا لیکن باجی نے یقین کرلیا ہے۔ میں ان کی ہی ضمانت پر آزاد ہوں۔"

"رضیہ کی حالت تشویش ناک ہے یا نہیں؟"

"بے شک تشویشناک ہے۔ بیٹی کے حادثے پر وہ جوش و جنون میں دوڑ گئیں۔ بعد میں گر پڑیں۔ اب وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہیں' سانس اکھڑ اکھڑ کر آرہی تھی۔ ڈاکٹر کی دوا سے کچھ آرام آگیا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "مجھے یقین ہے وہ صبح تک ختم ہوجائے گی۔"

"کل تک باجی کے خون کی رپورٹ مل جائے گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر رپورٹ کے ذریعے بھید کھل جائے کہ انہیں آہستہ آہستہ زہر دیا گیا ہے تو؟"

"تو میں کیا کروں؟ زہر تم نے دیا ہے۔ تم ہر رات دودھ کا گلاس لے جایا کرتی تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے اسے پلایا کرتی تھیں۔"

شمائلہ نے غصے سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھے دریا میں گرا کر ساحل پر کھڑے تماشا دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں لیکن اپنا بھی دشمن نہیں ہوں۔ پہلے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہوں۔ پھر دوسروں کے متعلق سوچتا ہوں۔ رضیہ کے سامنے خون کی رپورٹ آئے گی تو وہ بیان دے گی' گھر میں جو کھانا پکتا تھا اسے سب مل کر کھاتے تھے۔ صرف دودھ ایک ایسی چیز ہے جسے تم لاکر اسے پلایا کرتی تھیں۔"

"میں بیان دے سکتی ہوں کہ یہ سب آپ کی سازش رہی ہے۔"

"یہ صرف تمہارا بیان ہوگا۔ کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ صرف یہی نہیں' تم تو خود کو میری شریکِ حیات بھی ثابت نہیں کرسکتیں۔ تمہارے پاس اس الماری میں نکاح نامے کی دوسری کاپی رکھی ہوئی تھی' اسے میں نے ضائع کردیا ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ اس نے کہا۔ "تم یہ بھی ثابت نہیں کرسکتیں کہ میں شوہر کی حیثیت سے یہاں آیا کرتا تھا۔ میں رات کو آتا تھا اور صبح منہ اندھیرے چلا جایا کرتا تھا۔ کسی نے مجھے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کال بل کی آواز سنائی دی۔ شمائلہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جائیے۔ دروازہ کھولئے۔ آپ کے باراتی آپ کو لینے آئے ہیں۔"

اس نے تیور بدل کر پوچھا۔ "کیسے باراتی؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"ایک مجرم کے باراتی' پولیس والے ہی ہوسکتے ہیں۔ ذرا جاکر دروازہ تو کھولئے۔"

"ضرور کھولوں گا اگر تم نے اپنی عقل کے مطابق کوئی چال چلی ہے تو منہ کی کھاؤ گی۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا۔ پھر بیرونی دروازے کو کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر انسپکٹر کے ساتھ رضیہ کھڑی ہوئی تھی۔ مونا کے ہاتھ اور پاؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے سرفراز کو دیکھتے ہی کہا۔ "ابو!"

رضیہ نے پچکارتے ہوئے کہا۔ "بیٹی تم معصوم ہو۔ دوست اور دشمن کو نہیں سمجھتی ہو۔ آؤ' آنٹی کے پاس چلیں۔"

وہ سرفراز سے کتراتے ہوئے مونا کو لے کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے رضیہ کے پیروں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ یہ بالکل صحت مند ہے۔ اپنے پیروں سے چل رہی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟

انسپکٹر نے کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ "مسٹر سرفراز! یہ آپ کی گورنس کا کاٹیج ہے۔ بائی دی وے' آپ اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

وہ اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ بھلا کیا جواب دیتا کہ اتنی رات کو ایک گورنس کے کاٹیج میں کس رشتے سے آیا ہے۔ پھر یہ کہ رضیہ اس کے سامنے اپنے پیروں سے چل

کر گئی تھی۔ اس بات نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ انسپکٹر کے سوالا
کے جواب کیا دیئے جائیں۔ انسپکٹر کا منہ رشوت سے بند کیا جاسکتا تھا لیکن وہ رضیہ
دونوں پاؤں.........؟ وہ پریشان ہو کر تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں پہلے شا
کے ساتھ تھا۔ وہ شائلہ کے برابر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مونا اس وقت شائلہ کی گ
میں تھی۔

سرفراز نے کہا۔ "مونا' ابو کہہ کر میرے پاس آنا چاہتی تھی' تم نے اسے نہیں آ
دیا۔ کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اور مونا کو دل
جان سے نہیں چاہتا ہوں؟ رضیہ کسی غلط فہمی کا شکار ہونے سے پہلے میری محبتوں کو ا
کرو۔ میرا اس دنیا میں تم دونوں کے سوا اور کون ہے؟"

"سرفراز! محبتوں کے مکالمے سنتے سنتے عورت صدیوں سے بیوقوف بنتی آئی ہے
تمہارا یہ ناٹک ہمارے سامنے نہیں چلے گا۔"

شائلہ مسکرا رہی تھی۔ سرفراز نے اسے غصے سے دیکھا۔ پھر رضیہ سے کہا۔ "یقی
اس گورنس نے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"اس کی بات چھوڑو۔ یہ سوچو کہ تمہاری سازش کے باوجود میں ٹانگوں سے مفلو
کیوں نہیں ہوں۔ تمہاری پلاننگ کے مطابق مجھے اب تک مر جانا چاہئے تھا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو اب تک تم کرتے آئے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جب
میرے خون کی رپورٹ آئے گی تو اس میں کچھ نہیں ہوگا۔ میں بالکل نارمل کہلاؤں گی
تم نے اس سلو پوائزن کے جو اثرات شائلہ کے سامنے بیان کئے تھے' میں نے ان
اثرات کے مطابق ایکٹنگ کی۔ ڈاکٹروں کو بھی پریشان کیا۔ بے چارے تنگ آگئے۔ ان ک
سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بیماری کیا ہے۔ کوئی بیماری ہوتی تو ان کی سمجھ میں آتی۔"

اس بار سرفراز نے شائلہ کو حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظر
پوچھ رہی تھیں۔ "کیا تم ہر رات رضیہ کو مصفا دودھ پلایا کرتی تھیں؟ کیا اس کے گھٹنوں
صحیح دوا کی مالش کیا کرتی تھیں؟"

شائلہ نے مونا کو رضیہ کی گود میں دے کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سرفراز!
عورت اپنی سوکن کو مار ڈالنے کی حد تک سوچتی ہے لیکن مرد اس کی سوکن کو مارنے کی
بات کرے تو وہ چونک جاتی ہے۔ میں بھی آپ کی زبان سے رضیہ باجی کی ہلاکت کا سن کر
چونک گئی تھی۔ فوراً ہی دماغ میں یہ بات آئی' جب آپ باجی کی برسوں کی رفاقت کو بھول
سکتے ہیں اور ان کی محبت اور وفا کے بدلے انہیں مار سکتے ہیں تو کسی دن مجھے بھی دودھ کی
مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتے ہیں۔"

"تم کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"چپ چاپ سنتے جاؤ۔ ایک رات باجی نے مجھے بتایا کہ وہ دولت مند بیوہ تھیں۔
مونا تمہاری نہیں' ان کے سابق شوہر کی اولاد ہے۔ تب یہ خیال اور بھی شدت سے
ستانے لگا کہ اگر میں تمہارے بچے کی ماں بنوں اور کوئی سوکن آکر میرے بچے کو اسی طرح
ہلاک کرنے کی سازش کرے تو مجھ پر کیا گزرے گی؟ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری ماں
بھی ایک سوکن کی ماری تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سوکن کا ظلم دیکھا ہے۔ میری
ماں دن رات جلتے کڑھتے موت کے منہ میں گئی تھی۔ اتنی عبرت ناک زندگی گزارنے کے
بعد بھلا میں اپنی سوکن سے کیسے انتقام لے سکتی تھی؟ میرے ضمیر نے مجھے جھنجوڑا اور میں
نے رضیہ باجی کے سامنے سب کچھ اگل دیا۔ اس رات سے یہ مجھے اپنی سوکن کی حیثیت
سے جانتی ہیں اور انہوں نے مجھے سوکن کی حیثیت سے قبول کیا ہوا ہے۔"

"تم جھوٹ کہتی ہو۔ میں نے تم سے شادی نہیں کی ہے۔ تم رضیہ کو میرے خلاف
بھڑکا رہی ہو۔"

رضیہ نے کہا۔ "میں تم سے زیادہ شائلہ پر بھروسہ کرتی ہوں۔ تم نے یقیناً اس کا
نکاح نامہ ضائع کر دیا ہوگا۔ یہ مجھے بتا رہی تھی کہ الماری سے نکاح نامے کی ایک کاپی گم
ہوگئی ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم اسے بیوی تسلیم کرو یا نہ کرو' میں اپنی سوکن
تسلیم کرتی ہوں۔"

انسپکٹر دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم یہاں راتوں کو آیا کرتے تھے۔ تم
نے اب تک شائلہ سے جتنی باتیں کی ہیں۔ بیگم رضیہ کے خلاف جو سازشیں کی ہیں' وہ

ساری باتیں شمائلہ ایک پاکٹ کیسٹ ریکارڈر میں ریکارڈ کرتی رہی ہے۔"

سرفراز نے چونک کر شمائلہ کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں، جب تم اس بستر پر آکر لیٹ جاتے تھے، اس سے پہلے ہی میں ایک کیسٹ ریکارڈر آن کر کے سرہانے رکھ دیتی تھی۔ وہ تمام کیسٹ، رضیہ باجی نے اپنے بنک کے لاکر میں رکھوا دیئے ہیں۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "مسٹر سرفراز! کیا خیال ہے؟ آپ کو پہلے حوالات میں اور پھر جیل میں پہنچایا جائے۔ آپ کے خلاف مقدمہ درج ہونا چاہئے کہ آپ نے اپنی بیٹی کو اور اپنی بیوی کو ہلاک کرنے کی سازشیں کیں، اس کے لئے کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے، کیسٹ میں آپ کی آواز خود آپ کی سازشوں کا انکشاف کرے گی۔"

وہ اب زرد پڑ گیا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ رضیہ نے کہا۔ "آج تمہارے دونوں گھٹنے بے کار ہو رہے ہیں۔ اب فیصلہ تم پر نہیں، مجھ پر اور شمائلہ پر ہے۔"

انسپکٹر! میں جانتی ہوں، آپ انہیں سزا دلا سکتے ہیں اور کوئی بھی عورت جو موت کے منہ سے بچ کر نکلی ہو اور اپنی بیٹی کو بھی زندہ سلامت دیکھ رہی ہو وہ انتقاماً ضرور ایسے مرد کو عبرتناک سزا دلائے گی۔"

"تو پھر چلئے مسٹر سرفراز!"

"ٹھہریئے انسپکٹر! کیا یہ ضروری ہے کہ مجرم کو صرف قانون کے ہاتھوں سے سزا ملے اگر دوسرے ہاتھ ایسی سزا دینا چاہیں جو دوسروں کے لئے مثال قائم کرے تو آپ اعتراض کریں گے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھا۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"میں کہنا چاہتی ہوں کہ جانے ایسے کتنے مجرم سزا سے بچ نکلتے ہیں اور اپنی دو دو، چار چار بیویوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں یا ایک سوکن کے ذریعے دوسری سوکن کو آہستہ آہستہ موت کے منہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ انہیں کوئی سزا نہیں دے سکتا مگر میں نے اور شمائلہ نے اس کے لئے بہت اچھی سزا تجویز کی ہے۔"

"جب آپ لوگوں نے پہلے ہی اس کے لئے کچھ سوچ رکھا تھا تو مجھے کیوں بلایا گیا

ہے؟"

"اس لئے کہ آپ کے تعاون سے ہم انہیں کچھ سبق سکھا سکیں، انہیں بتا سکیں کہ ہم آپ کے ذریعے انہیں عدالت تک پہنچا سکتے ہیں اور ہم نہ چاہیں تو ان کا فیصلہ گھر کی عدالت میں کر سکتے ہیں۔"

"آپ کیا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں؟"

"ان کے خلاف تمام ثبوت میرے بنک کے لاکر میں محفوظ ہیں۔ یہ آئندہ ہمارے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکیں گے۔ کرنا چاہیں گے تو وہ کیسٹ عدالت میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ کیوں سرفراز؟"

سرفراز گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ رضیہ اور شمائلہ، مونا کو لے کر انسپکٹر کے ساتھ دوسرے کمرے میں گئیں۔ وہاں آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر رخصت ہو گیا۔ دونوں پھر اس کمرے میں آئیں۔ اپنی اپنی جگہ کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ رضیہ نے کہا۔ "دراصل ہم عورتیں نادان ہیں اور نادان ہیں اسی لئے ایک دوسرے کی سوکن بننے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ آپس کے جھگڑے میں اپنے مرد کو ڈھیل دے دیتی ہیں۔"

شمائلہ نے مسکرا کر کہا۔ "عورتوں میں ذرا بھی عقل ہو تو دو چار سوکنیں مل کر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنے مرد کو جائز پابندیوں میں رکھ سکتی ہیں۔ جیسا کہ اب ہم رکھا کریں گے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ رضیہ نے مونا سے کہا۔ "جاؤ بیٹی! یہ تمہارے ابو ہیں، یہ تمہیں پیار کریں گے۔"

مونا آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سرفراز کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ندامت سے چُور تھا۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے مونا کو اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔ اس کے آگے فرش پر بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے دونوں ننھے ننھے پاؤں کو لے کر دیکھا۔ اس کے ضمیر نے کہا۔ "بے شک اس کی ماں دونوں گھٹنوں سے معذور تھی مگر اس معصوم بچی نے کیا کیا تھا کہ میں نے اس کے قدموں تلے موتی بچھا دیئے۔ یہ بھول گیا تھا

کہ ان قیمتی موتیوں پر میرا ضمیر پھسلتا جارہا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے' دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے ننھے ننھے پاؤں کو دیکھا۔ پھران پاؤں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

☆======☆=======☆

لہو کا حساب

انتقام کی آگ میں سلگتے نوجوان کا قصہ،
اس کے باپ کا لہو اس پر قرض تھا۔
انسان مرجاتا ہے،لہو کبھی نہیں مرتا۔
اس نوجوان کی کہانی جو تبدیلی جنس کے مرحلے سے گزرتے ہوئے کچھ حادثات کا شکار ہو گیا تھا۔

مجاہد خان پہلی ملاقات میں سمجھ نہیں پایا کہ جانی کیا بلا ہے۔ اس نے مصافحے کے لئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو یوں لگا جیسے وہ جانی نہیں جانم ہے۔ حسین چھوکرا نہیں چھوکری ہے۔ چہرے پر خاصی چکناہٹ تھی۔ ہاتھ ایسا نازک اور ملائم تھا جیسے مکھن کی ٹکیا سے مصافحہ کر رہا ہو۔

مجاہد خان بدذوق نہیں تھا۔ اسے خوبصورت لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مصافحے کے لئے آئے ہوئے ہاتھ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ چند لمحوں میں اسے سمجھ لینا چاہئے تھا جبکہ آدمی' آدمی کو تمام عمر سمجھ نہیں پاتا۔ اس نے کہا۔ "یار جانی! تم تو جان کھینچ رہے ہو۔"

جانی نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر پوچھا۔ "کک.........کیا مطلب؟"

"تمہارا ہاتھ تو لڑکیوں کی طرح نازک ہے اور یہ تم نظریں کیوں چرا رہے ہو۔ خدا کی قسم' ان بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل پڑ جائے تو دیکھنے والوں کے دل دھڑکنے لگیں گے۔"

جانی نے کہا۔ "مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے۔ میں نے یہ سوچ کر ہاتھ ملایا تھا کہ تم پڑوسی ہو۔ آپس میں جان پہچان ہونی چاہئے مگر تم تو چھچھورا مذاق کر رہے ہو۔"

"میں نادم ہوں۔ یقین کرو' میں نے مذاق نہیں اڑایا ہے' یہ محض میری زندہ دلی تھی۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔ یہ ہمارے پڑوس کا بنگلہ کئی ماہ سے خالی تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں نے ایک خاتون کو یہاں دیکھا ہے۔ وہ تمہاری والدہ ہیں یا بڑی بہن؟"

"میری والدہ ہیں۔"

"اور والد؟"

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری ایک جڑواں بہن ہے' وہ ماموں کے پاس لاہور میں رہتی ہے۔"

"اپنی امی کے ساتھ ہمارے ہاں شام کی چائے پینا پسند کرو گے؟"

"سوری' امی بیمار رہتی ہیں' کہیں جانا پسند نہیں کرتیں۔"

"میں نے تمہاری امی کو کئی بار دیکھا ہے۔ وہ تو خاصی صحت مند ہیں۔"

"کیا صحت مند نظر آنے والے اندر سے بیمار نہیں ہوتے؟"

"ہاں ہوتے ہیں۔ چلو کوئی بات نہیں' تم تو آ سکتے ہو۔"

"میں امی کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا۔"

"یعنی ایک پڑوسی سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے؟"

"ہم نے چند ماہ کے لئے یہ بنگلہ کرائے پر لیا ہے۔ امی کا علاج ہو جائے گا تو ہم چلے جائیں گے۔ ہمارا پڑوسی ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

"بھئی اتنی دیر سے نظریں چرا رہے ہو' آنکھیں ملا کر بات کیوں نہیں کرتے؟ کیا میری صورت بری ہے جو تم دیکھنا گوارا نہیں کرتے؟"

اسی وقت ایک کار گیٹ کے سامنے آئی۔ جانی گیٹ کے پیچھے تھا۔ مجاہد کا خیال تھا' وہ گیٹ کھول کر باہر آئے گا یا اسے اخلاقاً اندر بلائے گا مگر وہ ٹالنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کار کو دیکھتے ہی گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔ خدا حافظ۔"

مجاہد کو غصہ آ گیا۔ "میں تمہارے دروازے پر آیا ہوں اور تم بھگانے کے لئے خدا حافظ کہہ رہے ہو۔ تم دونوں ماں بیٹے آدم بیزار ہو۔ یہ مت بھولو کہ انسان کو انسان سے کام پڑتا ہے۔ تم پردیس میں ہو۔ کبھی ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

کار پورچ میں جا کر رک گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کار سے باہر آ کر آواز دی۔ "جانی! کم آن۔"

وہ گیٹ بند کر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا چور نظروں سے مجاہد کو دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر بظاہر انجان بن رہا تھا مگر دھیان جانی کی طرف تھا۔ جب وہ ڈاکٹر کے قریب پہنچا تو ڈاکٹر نے بڑی رازدارانہ سرگوشی سے پوچھا۔ "ہیلو جینا! کیسی ہو؟"

جانی نے ایک دم سے گھبرا کر دوسرے بنگلے کے احاطے میں دیکھا اسے یوں لگا جیسے ڈاکٹر کی یہ بات مجاہد کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور چشم زدن میں بھید کھل رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اور قریب آکر آہستگی سے کہا۔ "تم خواہ مخواہ گھبراتی ہو۔ آخر کب تک حقیقت سے انکار کرو گی کہ تم لڑکا نہیں رہیں۔ تمہاری تبدیلی آخری مرحلے پر ہے۔ ایک فائنل آپریشن کے بعد مکمل لڑکی بن جاؤ گی۔"

"پلیز ڈاکٹر انکل! آپ اندر چلیں۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ چلتا ہوا بنگلے کے دروازے تک آیا۔ ڈاکٹر اندر گیا۔ مگر جانی کے قدم اکھڑ گئے۔ اس نے سر گھما کر پڑوسی کو دیکھا اور اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر گھبرا گیا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر وہ جلدی سے منہ پھیر کر بنگلے کے اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر اس کی امی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ مرحلہ ایسا ہے کہ تبدیل ہونے والے اپنی نئی حیثیت کو یا نئی شخصیت کو آئینے میں دیکھتے ہیں' اسے تسلیم کرتے ہیں' پھر آئینے سے منہ پھیر کر سوچتے ہیں' نہیں یہ سب ایک خواب ہے' خیال ہے۔ ان میں تبدیلی برائے نام آئی ہے' وہ پھر پہلے جیسے ہو جائیں گے۔ جینا کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ پہلے جیسی نہیں ہوگی۔ پہلے والا جانی ختم ہو چکا ہے۔ جانی کی لاش سے جینا جنم لے چکی ہے۔"

جانی سوچتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آیا۔ وہ تذبذب میں تھا۔ قدرتی حالات کے مطابق اسے لڑکی بن جانے کی خوشی تھی۔ کیونکہ بچپن ہی سے اس میں مردانگی والی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی لڑکی بنتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ پہلی بار مجاہد نے مصافحے کے لئے اس کا ہاتھ اپنے پتھر جیسے ہاتھ میں دبایا تو دل بے تحاشا دھڑکنے لگا تھا اور دماغ چیخ چیخ کر ہاتھ میں لے کر کہہ رہا تھا' اسے مکمل لڑکی بنانے والا آگیا ہے۔

اس کی امی نے خواب گاہ میں آکر کہا۔ "چلو' یہ جیکٹ اور لڑکوں والے کپڑے اتارو۔ کیا روز میں ہی اتارا کروں؟ ڈاکٹر انکل سے شرماؤ گی تو علاج کیسے ہوگا۔"

اس نے ایک ایک کر کے لباس اتارا۔ بدن پر صرف ایک نیکر اور ایک بنیان رہ گئی۔ پھر اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ عجیب مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر سے بھی شرم آتی تھی۔ اگر ماں موجود نہ ہوتی تو وہ بھی علاج نہ کراتا۔ چونکہ انکار اور فرار کا راستہ

نہیں تھا' اس لئے وہ آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

آج بند آنکھوں کے پیچھے مجاہد خان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجاہد سے بچنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مجاہد نے خیالی سرگوشی میں کہا۔ "پیدا ہونے سے انکار نہ کرو۔ تم میرے لئے پیدا ہو رہی ہو۔ آج سے اپنے بدن کے تمام نئے خزانوں کو میرے لئے سنبھال کر رکھنا۔ میں آؤں گا' جب بلاؤ گی تب چلا آؤں گا۔"

تب اس نے لیٹے ہی لیٹے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ پھر ایک ہائے کے ساتھ بولی۔ "ہائے میں جینا ہوں' اور جیتا رہوں گی۔"

☆======☆======☆

ڈاکٹر ڈرائنگ روم میں بیٹھا سوچ میں گم تھا۔ فرزانہ بیگم نے پوچھا۔ "کیا کوئی تشویش کی بات ہے؟"

"آں؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا' تم جینا کو لے کر میری کوٹھی میں آجاتیں۔ خواہ مخواہ یہ بنگلہ کرائے پر لینے کا تکلف کیا ہے۔"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ جب تک جینا مکمل نہیں ہوگی' میں اس کی تبدیلی راز میں رکھوں گی۔ میں نہیں چاہتی لوگ اسے تماشا بنا دیں۔"

"آخر کب تک چھپاؤ گی' سب جانتے ہیں' تمہارا ایک بیٹا تھا۔ سوال پیدا ہوگا' بیٹی کہاں سے آگئی؟"

"میری ایک بیٹی تھی' اسے میرے سگے بھائی نے گود لیا تھا اور اسے لے کر ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ ہمارے رشتے داروں نے اس بچی کو بارہ برس پہلے دیکھا تھا۔ جینا کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ یہ جوان ہو کر ڈھاکہ سے آئی ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "اور ڈھاکہ والی بیٹی؟"

میں نے بھائی کو تفصیلی خط لکھا تھا۔ اس نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جوابی خط لکھا ہے کہ میری بیٹی جینا کو پاکستان بھیج رہا ہے تاکہ اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دی جائے۔"

"ہاں اس طرح یہ بات بن جائے گی لیکن رشتے دار تمہارے بیٹے جانی کو پوچھیں

گے۔"

"جانی اپنی بہن جینا کو ڈھاکہ سے لانے گیا تھا۔ وہیں ایک حادثے میں اس کی موت ہوگئی۔ جینا کا علاج مکمل ہونے کے بعد میں ڈھاکہ دو چار روز کے لئے جاؤں گی' اس طرح پاسپورٹ سے ثابت ہوجائے گا کہ میں جانی کی آخری رسومات ادا کرکے آئی ہوں۔"

"تم نے پلاننگ تو بہت اچھی کی ہے۔ اس طرح جاہل رشتے دار جینا کی تبدیلی جنس کا مذاق نہیں اڑائیں گے اور میں بھی وعدے کا پابند ہوں' یہ بات تمہارے کسی اپنے یا پرائے کو نہیں بتاؤں گا' لیکن تم میری کوٹھی میں آکر کیوں نہیں رہنا چاہتیں؟"

"اب میں کسی بیٹے کی نہیں بیٹی کی ماں ہوں' میری ایک ذرا سی غلطی بیٹی کو بدنام کر دے گی۔ آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ آپ تنہا رہتے ہیں۔ ہم ماں بیٹی کا وہاں جاکر رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"بے شک میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔ اچھی بات ہے' چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔"

فرزانہ بیگم اسے خداحافظ کہنے بنگلے کے باہر آئی۔ اس کے لئے مین گیٹ کو کھولا۔ جب وہ کار لے کر گزر گیا تو وہ گیٹ کو بند کرکے واپس آنے لگی۔ تب اس نے محسوس کیا آج بھی وہ بڈھا اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

اس نے نظریں اٹھا کر پڑوس کے بنگلے میں دیکھا۔ بوڑھا اپنے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر احاطے کی دیوار کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "میرا نام عابد علی خان ہے' میں مجاہد کا باپ ہوں۔ میرے بیٹے نے تمہارے بیٹے کو چائے پر بلایا تھا۔ انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔"

فرزانہ بیگم نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے آپ کے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے اور میں کسی غیر مرد کے ہاں جاتی ہوں' نہ اپنے بیٹے کو جانے کی اجازت دیتی ہوں۔"

"آپ دنیا والوں سے ڈرتی ہیں۔ میں ریٹائرڈ ایس پی ہوں' کوئی آپ کی طرف انگلی اٹھائے گا تو اسے شوٹ کر دوں گا۔"

وہ بولی۔ "میں بھی ریوالور رکھتی ہوں۔ آپ میری خاطر کسی کو شوٹ کریں گے تو

میں بدنام ہوجاؤں گی لیکن میرے ریوالور سے چلنے والی گولی مجھے غیرت مند ثابت کرے گی۔"

وہ بنگلے کے اندر جانا چاہتی تھی' عابد علی خان نے کہا۔ "پلیز ایک منٹ۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔"

"آپ کام آنا چاہتے ہیں تو میری ایک خواہش پوری کر دیجئے۔"

"ضرور کروں گا۔ جان دے کر بھی آپ کی خواہش پوری کروں گا۔ آپ تو میرے دل کی بات کہہ رہی ہیں۔ کیا خواہش ہے؟"

"دارالامان میں بہت سی بے سہارا عورتیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا سہارا بن جائیں۔ نیکی بھی ملے گی' عورت بھی ملے گی۔"

یہ کہتے ہی وہ بنگلے کے اندر چلی گئی۔ عابد علی خان اسے پھر بھی دیکھتا رہا۔ وہ ایسی صحت مند اور تگڑی تھی کہ نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی خیالوں میں تگڑے گناہوں کے جلوے دکھاتی تھی۔ جب سے مجاہد کی ماں کا انتقال ہوا تھا' تب سے عابد علی خان کو ہر عورت مجاہد کی ماں دکھائی دیتی تھی۔ بے چارہ اپنے بیٹے کی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اور کسی نہ کسی ہتھکنڈے سے محبت کو ضرور زندہ رکھتا تھا۔

اس نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "قصائی ہوں قصائی' تجھے اپنے چھرے تلے نہ لایا تو ریٹائرڈ پولیس افسر نہیں۔"

وہ احاطے کی دیوار کے پاس سے پلٹ کر برآمدے میں آیا' دروازے پر مجاہد کھڑا ہوا تھا۔ باپ کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ باپ نے پوچھا۔ "کیا ہے بے؟ اپنے باپ کو پولیس والے کی طرح کیوں گھور رہا ہے؟"

"ابا! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اس عورت نے جو منہ توڑ جواب دیا ہے' وہ میں نے سنا ہے۔ شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہے۔"

"شرم آرہی ہے تو ڈوب مر۔ مجھے ڈوبنے کا مشورہ کیوں دیتا ہے۔ ارے بے وقوف کے بچے! میں پولیس والا ہوں۔ اس سے عشق نہیں کر رہا تھا۔ اس کی حقیقت معلوم کر رہا تھا۔ وہ ماں بیٹے مشکوک ہیں' نہ ماں بیمار ہے نہ بیٹا' پھر وہ ڈاکٹر روز کیوں آتا ہے؟"

مجاہد نے سر گھما کر پڑوس کے بنگلے کو دیکھا۔ یہ بات وہ بھی سمجھ رہا تھا۔ ماں صحت مند تھی' بیٹا بھی بیمار نہیں لگتا تھا۔ دونوں پردیس میں تھے۔ یہاں کوئی رشتے دار' دوست یا لمحے بھر کا بھی شناسا نہیں تھا۔ پھر ڈاکٹر سے کیا تعلق تھا؟ جبکہ وہ پڑوسی سے بھی ایک پیالی چائے کی قربت پسند نہیں کرتے تھے۔

مجاہد نے سوچا۔ "ضرور کوئی بات ہے۔ یہ کسی خاص وجہ سے کتراتے ہیں' کسی کو اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دیتے۔ مبادا کوئی بھید کھل جائے۔ آخر کیا بھید ہو سکتا ہے؟"

وہ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتا تھا۔ ایک تو ان کی بے رخی نے دل جلا دیا تھا' دوسرے ایک طرح کا اندیشہ تھا کہ ایک حسین لڑکے کی نزاکت اپنی طرف کھینچنا چاہتی تھی۔ بار بار جانی یاد آتا تھا اور وہ اپنے دماغ سے اسے دھتکار دیتا تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی کمسن لڑکے سے دوستی نہیں کی تھی۔ اونچے طبقے کے کتنے ہی حسین' دبلے پتلے' نازک سے لڑکے پاپ میوزک دھن پر مٹکتے پھرتے تھے۔ اسے بہت برے لگتے تھے۔ وہ ایک بار انہیں دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا لیکن جانی سے ملنے کے بعد وہ کئی بار اس کے بنگلے کی طرف بے اختیار دیکھ چکا تھا۔ اس میں دلچسپی نہ لینے کا عہد کرنے کے باوجود اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ "میں معلوم کروں گا۔ پڑوس میں کوئی پُراسرار زندگی گزارنے آئے تو برداشت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی تجسّس میں مبتلا کرے تو اسرار کا پردہ چاک کرنا ہمارا فرض ہے۔ کسی پڑوسی کو ہماری نیند اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

باپ بیٹے دونوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ باپ کوٹھی کے نچلے حصے میں رہتا تھا۔ بیٹا اوپری منزل کے بیڈ روم میں سوتا تھا مگر سونا بھول گیا تھا۔ اوپری منزل کی تمام بتیاں بجھا کر بالکونی میں آتا تھا۔ چھپ چھپ کر پڑوس کے بنگلے میں دور تک نظریں دوڑاتا تھا۔ کسی کھڑکی یا دروازے کا پردہ ہوا سے لہراتا تو کمرے کا اندرونی حصہ نظر آجاتا تھا۔ اس نے دو دن میں دوبار جانی کی جھلک دیکھی تھی۔ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم" والی بات تھی' دوبار کی جھلک نے پیاس اور بڑھا دی تھی۔

ٹھیک اسی طرح باپ بھی نچلے حصے کی تمام بتیاں بجھا دیتا تھا ایک کھڑکی کھول کر کھڑا ہو جاتا تھا مگر احاطے کی دیوار آڑے آتی تھی اس پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی باتیں کرنے کی آواز آجاتی تھی اور وہ صرف آواز ہوتی تھی' الفاظ واضح نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کسی کے گنگنانے کی رس بھری آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ عابد علی خان تڑپ کر سوچتا تھا۔ "بیوہ بلبل ہے۔ آواز میں بیوگی کا درد ہے' میں اس درد کا علاج کروں گا۔"

وہ فرزانہ بیگم کے بھرے بھرے بدن کا تصور کر کے اس کی عمر کا اندازہ کرتا تھا۔ اس کے مطابق جانی سولہ یا سترہ برس کا ہو گا۔ اگر یہ ایک ہی بیٹا ہے تو فرزانہ کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہوئی ہو گی۔ شادی کے ایک برس بعد یا دو برس بعد جانی پیدا ہوا ہو گا یعنی اٹھارہ برس اُدھر اور اِدھر جانی کے سولہ برس ملا کر کل چونتیس برس ہوئے۔ اگر وہ دو چار برس پہلے بیوہ ہو گئی تھی تو اس کا مطلب ہے بے چاری پر بھری جوانی میں قیامت آئی تھی۔ نہ جانے کتنی راتیں تنہا بستر پر کروٹیں بدل بدل کر آہیں بھرتی رہی ہو گی۔ عابد علی خان ریٹائرڈ ایس پی کا خیال تھا کہ اب میں آگیا ہوں اسے ایک ہی کروٹ سلایا کروں گا۔

یوں ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز مجاہد جنرل اسٹور میں شیونگ کا سامان خرید رہا تھا' اچانک جانی پر نظر پڑی۔ وہ دوسرے کاؤنٹر پر پرفیوم کا انتخاب کر رہا تھا۔ مجاہد اس کے پاس آیا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ بدن چرا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیا خوب ادا تھی مگر ایک لڑکے کی ادا تھی۔

مجاہد نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا۔ "یہ حسن' یہ نزاکت اور یہ ادائیں میرا ذوق بدل رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے تمہیں بھگا کر لے جاؤں۔"

گو جینا کو یہ بات بری لگی تاہم اسے ایک نئی مسرت کا احساس ہوا۔ نئی زندگی کے پہلے قدم پر ہی ایک گبرو جوان اس کی آرزو کر رہا تھا اور اسے حاصل کرنے کے جنون میں بھگا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجاہد کو بظاہر نظر انداز کیا۔ دکان دار سے پوچھا۔ "اس پرفیوم کی کیا قیمت ہے؟"

دکاندار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مجاہد نے کہا۔ "ارے' یہ پرفیوم تو عورتیں لگاتی ہیں۔ کمال ہے' پسند بھی لڑکیوں جیسی ہے۔ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول

کرو۔"

اس نے قیمت ادا کی پھر پرفیوم کی شیشی اٹھا کر اسے پیش کی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "نن.......... نہیں' میں کسی اجنبی کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا۔"

"اجنبی کیوں سمجھتے ہو' دوست سمجھو۔"

"میں دوستی نہیں کر.........."

وہ کہنے والی تھی۔ "نہیں کر سکتی۔" مگر عین وقت پر سنبھل گئی۔ مجاہد نے پوچھا۔ "دوستی کیوں نہیں کر سکتے؟ تم مرد بچے ہو' ایک مرد سے دوستی کرنے میں شرم اور جھجک کیسی؟"

"وہ.......... وہ امی منع کرتی ہیں۔"

"کمال ہے' تم جوان ہو رہے ہو۔ تمہیں مردوں کی صحبت میں رہ کر دنیا کے نشیب فراز کو سمجھنا چاہئے۔ کیا تمہاری امی تمہیں چوڑیاں پہنا کر بٹھانا چاہتی ہیں؟"

فرزانہ بیگم اس کے پیچھے آکر باتیں سن رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ "مسٹر! اگر میں اپنے بیٹے کو سچ مچ چوڑیاں پہناؤں تب بھی تم اعتراض نہیں کر سکو گے۔ پڑوس میں موقع نہیں ملا تو یہاں آکر اسے میرے خلاف بہکا رہے ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تم باپ بیٹے سے چاہتے کیا ہو؟"

وہ بولا۔ "محترم خاتون! یہاں میرے باپ کا ذکر کیوں آرہا ہے؟"

"اس لئے کہ تم دونوں ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہو۔ ہر رات اوپری بالکونی سے تاک جھانک کرتے ہو۔ نیچے والی ایک کھڑکی سے تمہارا باپ ہمارے بنگلے کی طرف دیکھا رہتا ہے۔ آدھی رات کے بعد احاطے کی دیوار پر چڑھ کر نہ جانے کیا دیکھنا چاہتا ہے' یہ ہی بتا سکتے ہو کہ ہمارے خلاف کس قسم کی جاسوسی ہو رہی ہے۔"

"اگر میرا باپ ایسا کرتا ہے تو مجھے شرمندگی ہے' میں اسے ایسی حرکت سے باز رکھوں گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں جانی کو پسند کرتا ہوں' اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔"

فرزانہ بیگم نے کن انکھیوں سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے شرما رہی تھی۔

جھکی جھکی نظروں سے مجاہد کے قدموں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "مجاہد! تم باتوں سے بھلے آدمی لگتے ہو۔ مجھے دوستی پر اعتراض نہیں ہے مگر میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہم ماں بیٹے کچھ عرصہ تنہا رہنے پر مجبور ہیں۔"

"ایسی کیا مجبوریاں ہیں۔ کیا میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا؟"

"مجھے افسوس ہے' فی الحال کسی کی ہمدردی یا مہربانی ہمیں نقصان پہنچائے گی۔ میں جانتی ہوں' تم تجسّس میں گرفتار رہو گے لیکن میں مجبور ہوں' کچھ گھریلو باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کو بتائی نہیں جاتیں۔"

وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر جانا چاہتی تھی' مجاہد نے راستہ روک کر کہا۔ "اگر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے تو میں یہ تحفہ جانی کو دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ' آپ انکار نہ کریں۔"

فرزانہ بیگم نے سوچتی ہوئی نظروں سے پرفیوم کی شیشی کو اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ "مجھے اعتراض نہیں ہے۔" پھر اس نے بیٹی سے کہا۔ "لے لو۔"

وہ شرما رہی تھی' ہاتھ نہیں بڑھا رہی تھی۔ مجاہد نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر شیشی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ فرزانہ بیگم نے کہا۔ "شکریہ ادا کرو۔"

"شش۔ شکریہ۔" وہ بڑی مشکل سے بول پائی۔ پھر بدن چراتی ہوئی' اس سے کتراتی ہوئی ماں کے ساتھ دکان سے باہر آگئی۔ انہوں نے آمدورفت کے لئے ایک کرائے کی کار لے رکھی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ کار کے عقب نما آئینے میں مجاہد نظر آرہا تھا۔ وہ دکان سے باہر آکر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ بیگم نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ نظر آنے والا عقب نما آئینے سے اوجھل ہو گیا۔

ماں تھوڑی دیر تک خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی اور کن انکھیوں سے بیٹی کو دیکھتی رہی۔ جینا کہیں دور پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خواب کا دھندلکا تھا۔ رخساروں پر حیا کی سرخی تھی۔ اسے جسمانی طور پر تبدیل ہونے کے لئے ایک آپریشن سے گزرنا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ ذہنی طور پر حیا والی بن چکی تھی۔ کسی کے خیالوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

ماں نے کہا۔ "لڑکا اچھا ہے۔"

وہ چونک کر بولی۔ "آں؟ آپ نے کچھ کہا؟"

"مجاہد کی بات کر رہی ہوں۔ وہ تم پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ میں برا نہیں سمجھتی۔ اس طرح تم تیزی سے ذہنی طور پر تبدیل ہوتی رہو گی مگر سوال پیدا ہوتا ہے' ہم اس پر کس حد تک بھروسہ کرسکتے ہیں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے اس کی حمایت میں بولی۔ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہوسکتا ہے' وہ میری تبدیلی کو قبول کرلے۔"

"قبول تو کرے گا۔ ہر مرد پہلے دل و جان سے قبول کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ عورت سے بیزار ہونے لگتا ہے۔ کوئی رائی برابر کمزوری ملے تو اسے پہاڑ بنا دیتا ہے۔ جب تم سے دل بھر جائے گا تو لڑکے سے لڑکی بننے کی بات توہین آمیز انداز میں کرے گا۔ دنیا کی کتنی ہی عورتوں میں کوئی نہ کوئی جسمانی خرابی ہوتی ہے' اس کے باوجود کامیاب ازدواجی زندگی گزارتی ہیں۔ آپریشن کے بعد خدانخواستہ تمہارے اندر کوئی خرابی یا کمی رہ گئی تو وہ سرے سے تمہیں عورت تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ اسی لئے میں چاہتی ہوں' تمہاری شادی جس سے بھی ہو اسے کبھی تمہاری تبدیلی جنس کا پتہ نہ چلے' یہی یقین ہو کہ تم میری ڈھاکہ سے آنے والی بیٹی ہو۔"

وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہی تھی۔ "میں امی کے اندیشوں کو اور تجربات کو جھٹلا نہیں سکتی اور اس بات سے انکار نہیں کرسکتی کہ چند دنوں میں وہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا ہے۔ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی اسے اپنے اندر سے نکال نہیں سکوں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہونے والا ہے۔"

اسی شام مجاہد نے باپ سے کہا۔ "تمہاری حرکتوں سے میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ پڑوس والی خاتون تمہیں ایک نہایت ہی گرا ہوا انسان سمجھتی ہے۔"

"میں نہ تو گرا ہوا ہوں اور نہ اس خاتون کے سمجھنے سے گر جاؤں گا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ میں پولیس والا ہوں' کسی وقت بھی اس کی پُراسرار زندگی کی تہہ تک پہنچ سکتا ہوں۔ اسی لئے وہ میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے اور تم بے وقوف شرمندہ ہوجاتے ہو۔"

"ابا! تم راتوں کو احاطے کی دیوار کے پاس کیا کرتے ہو؟"

"دیوار سے سر پھوڑتا ہوں کہ تمہارے جیسی اولاد کیوں پیدا ہوئی۔ تمہیں پتا ہے' وہ خاتون مجھے دھمکی دے رہی تھی کہ اس کے پاس ریوالور ہے۔ یعنی میرے جیسا فرض شناس ریٹائرڈ ایس پی اس کا کوئی جرم یا گناہ دیکھ لے تو ریوالور کے ڈر سے خاموش رہ جائے۔ یہ اچھی طرح سن لو بیٹے صاحب' اگر کبھی اس عورت سے جرم یا گناہ سرزد ہوتے دیکھوں گا تو اس کے گھر میں گھس کر رنگے ہاتھوں اسے پکڑوں گا۔ چاہے میری جان ہی چلی جائے۔"

"تم میرے باپ ہو۔ بیٹے ہوتے تو نصیحتیں کرتا' بہرحال میں حیدر آباد جا رہا ہوں۔ کل شام تک واپس آؤں گا۔"

عابد علی خان خوش ہوگیا۔ راستے کی ایک دیوار ہٹ رہی تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے سوچ رہا تھا' اگر جوان بیٹا نہ ہوتا تو میں اس بیوہ کے گھر میں گھس جاتا۔ میں پولیس والا ہوں' جانتا ہوں ایسے وقت کیا ہوتا ہے۔ رات کی تنہائی میں عورت اور وہ بھی بیوہ جو خود ہی جذبات سے مغلوب ہوتی ہے' گھر میں گھس آنے والے کو قبول کرلیتی ہے۔ اس کے برعکس وہ شور مچانا چاہے تو ریوالور دکھا کر چپ کرایا جاسکتا ہے پھر بھی چپ نہ ہونا چاہے تو اس کی اولاد کو گولی مارنے کی دھمکی دی جاسکتی ہے۔ ایک عورت کو قابو میں کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

مجاہد رات کا کھانا کھا کر نو بجے گھر سے چلا گیا۔ اس کا ارادہ بھی کچھ یہی تھا۔ وہ پہلے چھپ کر باپ کی حرکتیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جب اسے یقین ہوجاتا کہ باپ اس کی حرکتیں نہیں دیکھے گا تو وہ چوری چھپے جانی (جینا) کے پاس پہنچ جاتا۔ پچھلی کئی راتیں جاگ کر اس نے یقین کرلیا تھا کہ جانی اوپری منزل کے ایک کمرے میں سوتا ہے۔

وہ دو چار گھنٹے گزارنے کے لئے ایک دوست کے ہاں آیا۔ دوست ایک فلیٹ میں تنہا رہتا تھا۔ راتوں کو شراب اور شباب سے دل بہلاتا تھا۔ اس نے مجاہد کو دیکھ کر کہا۔ "آؤ یار' کیا موقع پر آئے ہو۔ آج اسکاچ وہسکی کے ساتھ نئی لڑکی ہے۔ دونوں بھائی مل کر عیش کریں گے۔ اپنے لئے گلاس لے آؤ۔"

مجاہد نے کہا۔ "سوری انور! میں نہیں پیوں گا۔ آج کسی سے ملاقات کی امید ہے۔ میں ہوش میں رہنا چاہتا ہوں۔"

اس کی باتوں کے دوران ایک حسینہ باتھ روم سے نکل کر آئی۔ انور نے کہا۔ "یہ ڈولی ہے۔ تم جس سے ملنے جارہے ہو' وہ اسکاچ سے زیادہ نشیلی اور ڈولی سے زیادہ حسین نہیں ہوگی۔"

"وہ لڑکی نہیں' لڑکا ہے۔"

انور اور ڈولی ہنسنے لگے۔ پھر انور نے کہا۔ "کمال کرتے ہو' لڑکے سے ملنے کے لئے ڈولی کو چھوڑ کر جاؤ گے۔ نہیں' کبھی نہیں۔ ڈولی' میرے یار کے لئے پیگ بناؤ۔"

ڈولی نے ایک گلاس میں تھوڑی وہسکی لی' تھوڑا پانی ملایا' پھر مجاہد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "خود نوش کرو گے یا میں پلاؤں؟"

اس نے عاجزی سے انکار کیا۔ ڈولی نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ انور نے اپنا جام اٹھا کر کہا۔ "اگر تم نے ڈولی کا دل توڑا تو میں اپنا جام توڑ دوں گا۔"

مجاہد نے مجبور ہو کر ساقی کے ہاتھوں سے پیا اور گلاس خالی کر دیا۔ "لو ڈولی کا دل رکھ لیا۔ تمہارا جام بھی سلامت رہ گیا۔"

انور نے دوسرا گلاس بنا کر دیتے ہوئے کہا۔ "میں ڈولی کی طرح حسین نہیں ہوں مگر دیکھنا چاہتا ہوں' دوست کے ہاتھ قبول کئے جاتے ہیں یا نہیں؟"

مجاہد کو پھر مجبور ہو کر دوسرا گلاس قبول کرنا پڑا۔ ڈولی ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر آرکسٹرا دھن پر رقص کرنے لگی۔ مجاہد کو ڈولی جیسی حسین لڑکی پھیکی نظر آرہی تھی اور جانی جیسا لڑکا حور پریوں سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا اور ایک لڑکی کے روپ میں اسے بلا رہا تھا۔

☆=======☆======☆

آدھی رات گزر گئی۔ باپ بیٹے کا مزاج تقریباً ایک جیسا تھا۔ عابد علی خان بھی اپنے کمرے میں بیٹھ کر پی رہا تھا' جب اچھی طرح چڑھ گئی تو وہ ریوالور جیب میں رکھ کر احاطے کی دیوار کے پاس آیا۔ تصور میں فرزانہ بیگم مسکرا رہی تھی اور ہاتھ ہلا کر اسے بلا رہی

تھی۔ وہ احاطے کی دیوار پر بڑی مشکل سے چڑھنے کے بعد دوسری طرف سلامتی سے اتر نہ سکا' زمین پر گر کر چاروں شانے چت ہوگیا۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا پھر دونوں ہاتھ پاؤں کے زور پر کسی طرح اٹھ کر کھڑا ہوا' کمرے کے اندر روشنی تھی' جیسے بیوہ اسے جوانی کا میوہ پیش کرنے کے لئے جاگ رہی ہو۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے' سنبھلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک آیا۔ اس کے ہینڈل کو گھما کر دیکھا۔ وہ اندر سے مقفل تھا۔

اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر سائیلنسر نکالا تو نشے کی زیادتی سے گرتے گرتے دیوار کے سہارے رک گیا۔ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر سائیلنسر کو ریوالور کے ساتھ منسلک کیا پھر سنبھل کر دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ لاک کا نشانہ لینے لگا۔ نشے میں وہ ہل رہا تھا۔ فائر کرنے سے گولی لاک پر نہیں لگی۔ کھچاک کی دھیمی آواز کے ساتھ لکڑی کے دروازے میں سوراخ ہوگیا۔

اس نے ریوالور کو گالی دی۔ دوسرا فائر کیا۔ پھر ہلتے ہوئے بولا۔ "یہ سالا دروازہ ہلتا ہے۔ ایک جگہ نہیں رہتا۔ یہ اُلو کا پٹھا کیسے ایک جگہ نہیں رہے گا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے دروازے کو پکڑ لیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے فائر کیا۔ اس بار لاک ٹوٹ گیا۔ اس نے ہینڈل کو گھمایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑاتا ہوا اندر جا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ ریوالور بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فرزانہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ "اٹھو میرے ہمسائے! تم میرے دروازے پر چاند ماری کر کے گولیاں چلا رہے تھے۔ شراب کی بو یہاں تک آرہی ہے۔ میرا خیال ہے' پولیس والے اپنے ریٹائرڈ ایس پی کو اٹھا کر لے جانے میں بڑی خوشی محسوس کریں گے۔"

اس نے سر اٹھا کر فرزانہ بیگم کو دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی نشے میں سوئی ہوئی جوانی جاگ گئی۔ وہ گرتے پڑتے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم آج سے بیوہ نہیں' سہاگن ہو۔ میں تمہاری پیاس.......... ہاں........"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فرزانہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر ہولے سے دھکا دیا۔ وہ پیچھے جاکر گر پڑا۔ بیگم نے اپنا ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ ”قریب آؤ گے تو گولی مار دوں گی۔“

وہ بڑا ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ سینہ ٹھونک کر کہہ رہا تھا۔ ”مار دو گولی۔ میں مرجاؤں گا مگر مرتے مرتے بھی تمہاری جوانی سے کھیل جاؤں گا۔“

وہ آگے بڑھا‘ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”دیکھو‘ میں قتل نہیں کرنا چاہتی۔ یہ ریوالور میں نے اپنی حفاظت کے لئے رکھا ہے۔ مجبور کرو گے تو گولی چلا دوں گی۔“

وہ کسی اسٹیج ڈرامے کا شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھا ؂

ہم نہیں تیر اور تلوار سے ڈرنے والے
قتل کرنا ہے تو اک ترچھی نظر کافی ہے

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”تم باز نہیں آؤ گے تو..........“

وہ ڈگمگا گئی۔ پیچھے صوفہ تھا‘ سنبھلتے سنبھلتے بھی گر پڑی۔ عابد علی خان لپک کر آیا پھر اس پر چھا گیا۔ وہ صوفے سے اٹھنے اور اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنے لگی۔ ”چھوڑ۔ مجھے چھوڑ دے‘ بدذات کمینے! میں نے غلطی کی جو تجھے پہلے ہی گولی نہیں ماری۔“

اب وہ گولی نہیں مار سکتی تھی۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے کے قریب ہی فرش پر گر پڑا تھا۔ وہ ریوالور تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہی تھی اور وہ اسے گرفت سے نکلنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر پکارنے لگی۔ ”جانی۔ جینا۔ جینا۔ جانی۔ جانی..........!“

جینا اوپری منزل سے جواباً بولتی ہوئی آئی۔ ”کیا ہوا امی؟ جسٹ کمنگ..........“

وہ زینے سے اترتے وقت ٹھٹک گئی۔ پڑوسی اس کی امی سے زیادتی کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے آئی۔ ”اسے چھوڑ دے‘ میری امی کو چھوڑ دے۔ بدمعاش! تو ہمارے گھر میں آکر بدمعاشی کر رہا ہے۔“

اس نے پیچھے سے عابد علی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچا۔ عابد علی خان نے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ مار کھا کر چیختی ہوئی فرش پر جا کر گری۔ وہاں ریوالور پڑا ہوا تھا۔ اس

نے ریوالور اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ وہ عیاش درندے کے چنگل میں تھی۔ کاش‘ وہ لڑکا ہی ہوتی‘ جسمانی قوت پہلے جیسی ہوتی۔ لڑکی کا وجود لے کر ماں کی عزت نہیں بچا سکتی تھی۔ نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے ٹھائیں سے گولی چلا دی۔

عابد علی خان کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ صوفے کے پاس سے اچھلا پھر پیچھے کی طرف الٹ کر فرش پر تڑپنے لگا۔ دیدے پھیلا کر جینا کو تکنے لگا۔ وہ دوسری گولی بھی چلانا چاہتی تھی۔ ماں نے جلدی سے آکر ریوالور چھین لیا۔ پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ تُو نے کیا کیا؟“

”وہی کیا جو ایک درندے کے ساتھ کرنا چاہئے۔“

وہ بیٹی کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے کے باہر برآمدے میں آئی‘ آہستگی سے بولی۔ ”یہ قتل تُو نے نہیں‘ میں نے کیا ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”جو کہہ رہی ہوں‘ وہی تم پولیس کے سامنے کہو گی۔“

”نہیں امی! میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ماں کی عزت بچانا جرم ہے تو میں بڑے فخر سے سزا پاؤں گی۔“

”نادان بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ تمہارے سامنے ایک لمبی زندگی پڑی ہے۔ ایک نئی زندگی بسر کرنے کے لئے تمہیں دو دن بعد ایک آپریشن سے گزرنا ہے۔ اگر تم عدالتوں کے چکر میں پڑو گی تو تمہاری تبدیلی مکمل نہیں ہوگی۔ تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔“

”آپ میری جگہ جیل جانا چاہتی ہیں؟“

”یہ بحث کا وقت نہیں ہے۔ ہم فوراً ڈاکٹر ذاکر کے پاس جا کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کریں گے۔ وہ ہمیں معقول مشورے دے گا۔“

وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی‘ کار میں آئی‘ اسے اسٹارٹ کر کے گیٹ کے پاس پہنچی۔ بیٹی نے کار سے اتر کر گیٹ کو کھولا پھر کار میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ جلدی جلدی میں گیٹ بند کرنا بھی بھول گئی۔ اس بنگلے میں فون ہوتا تو اتنی رات کو کہیں جانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ حالات اچانک سنگین ہوگئے تھے۔ فرزانہ بیگم آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کرتی ہوئی ڈاکٹر ذاکر کی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اس نے ڈاکٹر کے دروازے کے سامنے کار روکی۔ زور زور سے ہارن بجایا۔ پھر کار سے نکل کر دروازے کے پاس آکر کال بیل کے بٹن کو دباتی چلی گئی۔ ایک قریبی کھڑکی سے ڈاکٹر کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں فرزانہ بیگم۔ اپنی بیٹی جینا کے ساتھ آئی ہوں۔"

دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "رات کے دو بجے آئی ہو' خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے' اسی لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔ ایک بدمعاش پڑوسی بنگلے میں گھس آیا تھا۔ وہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے گولی ماردی' اسے قتل کر دیا۔"

جینا نے کہا۔ "قتل میں نے کیا ہے۔ امی آپ جھوٹ نہ بولیں۔"

ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش رہو۔ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟ کیا تم ماں کی بات نہیں مانو گی؟"

ڈاکٹر ذاکر کبھی ماں کو اور کبھی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "آخر معاملہ کیا ہے؟ قتل جیسا سنگین جرم سرزد ہوچکا ہے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ سچ سچ بتاؤ۔ قتل کس نے کیا ہے؟"

فرزانہ بیگم نے کہا۔ "میں نے۔"

جینا نے کہا۔ "میں نے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "چلو کسی نے بھی کیا ہے۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

فرزانہ بیگم نے کہا۔ "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اس قتل کی وجہ سے جینا کا آپریشن نہ رکے۔ تبدیلی کے ٹائم ٹیبل کے مطابق اس کا علاج جاری رہے۔"

"اسی لئے تم قتل کا الزام اپنے سر لے رہی ہو؟"

"جی ہاں۔ جی نہیں۔ الزام کی کیا بات ہے۔ قتل میں نے ہی کیا ہے۔ مجھے جیل جانا چاہئے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ یہ ماں کا جرم اپنے سر لے کر جیل جائے گی تو آپریشن کیسے ہوگا۔"

"میں آپریشن نہیں کراؤں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "جینا! احمقانہ فیصلہ نہ کرو۔ دو دن بعد تمہارا آپریشن نہ ہوا تو تم اِدھر کی رہو گی' نہ اُدھر کی۔ لڑکے یا لڑکی کی حیثیت سے تمہاری مکمل تشخیص نہیں ہوسکے گی۔ اس دوغلی کیفیت میں تم دماغی مریضہ بن جاؤ گی۔ اپنی امی کو بھی ممتا کے عذاب میں مبتلا کر دو گی۔"

"آپ چاہتے ہیں' میں امی کو جیل جانے دوں۔"

"ہم مقدمہ لڑیں گے۔ مجھے یقین ہے تمہاری امی کو معمولی سزا ملے گی کیونکہ بدمعاش عزت کا دشمن بن کر تمہارے گھر آیا تھا۔ کیا اس کے پاس بھی ہتھیار تھا؟"

"ہاں' اس نے ریوالور سے ہمارے دروازے کا لاک توڑا تھا۔"

"یہ ساری باتیں مقتول بدمعاش کے خلاف جاتی ہیں۔ فرزانہ بیگم اپنا لباس ذرا اِدھر اُدھر سے پھاڑ ڈالو' زلفیں بکھیر لو پھر میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو۔"

فرزانہ بیگم نے لباس کو کہیں کہیں سے پھاڑتے ہوئے کہا۔ "وہ کمبخت شراب پی کر آیا تھا۔"

"یہ بھی ایک اہم پوائنٹ ہے۔ ایک تجربے کار وکیل' اسے عیاش اور قتل کی نیت سے آنے والا شرابی اور تمہیں ایک تنہا مظلوم عورت ثابت کردے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ ماں بیٹی اس کے ساتھ باہر آکر کار میں بیٹھ گئیں۔

☆======☆======☆

مجاہد کو شراب کے جام سے اس وقت نجات ملی جب انور نے ڈولی کو دوسرے کمرے میں لے جاکر دروازہ بند کرلیا۔ ان دونوں نے اپنی محفل کو گرمانے کے لئے جب تک اس کی ضرورت سمجھی' اسے ساتھ رکھا۔ اسے پیتے رہنے پر مجبور کرتے رہے پھر اپنا الو سیدھا کرنے چلے گئے۔ اس نے مدہوشی سے جھومتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ پھر چونک گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا فلیٹ سے باہر آیا۔ پھر انور کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ اپنی کوٹھی کے ساتھ والے بنگلے میں خاموشی اور

ویرانی تھی۔ سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ بنگلے کے اندر پہنچانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

وہ سوچتا ہوا آیا تھا کہ پائپ کے ذریعے اوپری منزل پر جانی کے پاس جائے گا لیکن وہ کھلا ہوا گیٹ کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس گیٹ سے یقیناً اس کا باپ اندر گیا ہے۔ وہ ناگواری سے احاطے میں آیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر آیا۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ نظر آیا اسے آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا۔

ڈرائنگ روم کی تیز روشنی میں اس کا باپ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے سینے سے لہو بہہ رہا تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔ دروازے پر بیٹے کو دیکھتے ہی جیسے زندگی کا بجھتا ہوا چراغ پھر بھڑک گیا۔ وہ اٹک اٹک کر سانس لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجاہد دوڑتا ہوا بولا۔ ”ابو! یہ.......... یہ کیا ہوگیا؟ وہ ماں بیٹے کہاں ہیں۔ تجھے کس نے گولی ماری ہے؟“

”جا.......... جا.......... جانی نے اپنی ماں کے ریوالور سے مم.......... مجھے مارا ہے۔“

”ابا! تُو یہاں کیوں آیا تھا۔ اس نے تجھے گولی کیوں ماری ہے؟“

”مم.......... ماں بیٹے گنہگار ہیں۔ ڈاکٹر اور فرزانہ کو میں نے.......... میں نے رر.......... رنگے ہاتھوں پکڑا۔ جانی نے ماں کو بدنامی سے بچانے کے لئے مجھے.......... مجھے..........“

اس کی سانس اٹک گئی۔ مجاہد نے اسے بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ابا! حوصلہ کر‘ ابھی تجھے طبی امداد پہنچاؤں گا۔ تجھے نئی زندگی ملے گی۔“

اسی لمحے اس کا سر ڈھلک گیا۔ مجاہد نے اسے دوبارہ فرش پر لٹا دیا۔ جھنجھوڑ کر آوازیں دیں مگر بڑی دیر تک موت سے لڑنے والا زندگی کو ہار چکا تھا۔ وہ غم اور غصے سے کانپنے لگا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا‘ سوچ رہا تھا۔ آخر میں اس چھوکرے میں دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔ اسے نرم و نازک لڑکی نما لڑکا سمجھ رہا تھا۔ اس نے میرے ہی باپ کو قتل کر دیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اس نے دل ہی دل میں قسم کھائی۔ ”میں اپنے باپ کی لاش کے سرہانے قسم کھاتا ہوں‘ اس چھوکرے کو چیونٹی کی طرح مسل کر اس کی ماں کے سامنے پھینک دوں گا۔“

اسی وقت باہر گاڑیوں کے آنے پھر رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پہلے ماں بیٹے نظر آئے۔ وہ برآمدے سے چلتے ہوئے اندر آرہے تھے۔ وہ جوشِ انتقام سے اچھل کر کھڑا ہوگیا‘ گرجتے ہوئے بولا۔ ”جانی! میرے باپ کے قاتل‘ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ذرا دور فرش پر اس کے باپ کا ریوالور پڑا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر اسے اٹھایا پھر جانی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ جینا اس سے پہلے ہی دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ دوسری بار فائر کرنا چاہتا تھا لیکن انسپکٹر کے ریوالور کی گولی اس کے ہاتھ پر لگی۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ جھک کر دوسرے ہاتھ سے اسے اٹھانا چاہتا تھا‘ انسپکٹر نے تیزی سے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! ذرا بھی حرکت کرو گے تو دوسری گولی سینے میں اتر جائے گی۔“

وہ جینا کو دیکھتے ہی جنون میں مبتلا ہوگیا تھا۔ چیخ کر بولا۔ ”مجھے گولی مار دو مگر میں اس چھوکرے کو کتے کی موت مار دوں گا۔“

وہ پھر ریوالور کو اٹھانا چاہتا تھا۔ انسپکٹر کی ٹھوکر سے ریوالور دور چلا گیا۔ ایک سپاہی نے اسے اٹھا لیا۔ دو سپاہیوں نے مجاہد کو دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ وہ ان کی گرفت میں مچلتے ہوئے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے جینا کو بڑے غیظ و غضب سے دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”انسپکٹر! قاتل کو پکڑو‘ مجھے کیوں پکڑتے ہو۔ یہ تمہارے سامنے میرے باپ کی لاش پڑی ہے۔ میرے بوڑھے باپ نے میرے بازوؤں میں دم توڑتے ہوئے بتایا تھا کہ جانی قاتل ہے۔ اسی نے میرے باپ پر گولی چلائی تھی۔ یہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔ میں نے قسم کھائی ہے‘ یہ میرے ہاتھوں سے مرے گا۔ یہ میرے ہاتھوں سے مرے گا۔“

وہ سپاہیوں کی گرفت سے تڑپ تڑپ کر نکلنا اور جینا پر قاتلانہ حملہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ حیران تھی‘ پریشان تھی۔ جس کے لئے دل محبت سے دھڑکتا تھا۔ وہ جان کا دشمن بن گیا تھا۔ اسے ایسی جنونی حالت میں دیکھ کر یاد آیا کہ جسے قتل کیا ہے‘ وہ مجاہد کا باپ تھا۔ ماں کی عزت بچانے کی دھن میں یا عجلت میں مجاہد کا خیال نہیں آیا تھا۔ ایسے وقت کچھ سجھائی

نہیں دیتا' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جان کا دشمن یا عزت کا دشمن صرف دشمن ہی ہوتا ہے' کسی کا باپ یا رشتہ دار نہیں ہوتا بلکہ انسان ہی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ذاکر نے مجاہد کے سامنے آکر کہا۔ "مسٹر! ہوش میں آؤ۔ تمہارے باپ کو کسی کی عزت لوٹنے کا ٹھیکہ نہیں دیا گیا تھا۔ یہ یہاں فرزانہ بیگم کی عزت سے کھیلنے آیا تھا۔ فرزانہ بیگم نے اسے گولی مار دی۔ جانی نے گولی نہیں چلائی تھی۔"

مجاہد نے گرج کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میرے باپ نے مرتے دم جانی کو قاتل کہا ہے۔ مرنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔ قاتل جانی ہے' جانی۔"

ڈاکٹر نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہا۔ "انسپکٹر! مسٹر مجاہد نے شراب پی رکھی ہے' آپ اپنی رپورٹ میں یہ ضرور لکھیں کہ یہ نشے کی حالت میں بے قصور جانی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔"

مجاہد نے کہا۔ "ہاں' میں نشے میں ہوں۔ ہوش میں رہوں گا' تب بھی اس ذلیل چھوکرے کو قتل کروں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے میرے ہاتھوں سے نہیں بچا سکے گی اور تم! ڈاکٹر تم اس کی ماں کے ساتھ ہو۔ میرے باپ نے تمہیں گناہ کی حالت میں پکڑا تھا۔ جانی نہیں چاہتا کہ میرا باپ دنیا والوں کے سامنے اس کی ماں کو بدنام کرے۔ لہٰذا ماں کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس نے........"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرزانہ بیگم نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا پھر کہا۔ "میں تجھے اپنا بیٹا سمجھنے لگی تھی اور تو اپنے عیاش باپ کی حمایت میں مجھ پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔ تیرے چیخنے چلانے سے میں بدنام نہیں ہوں گی۔ میری پاک دامنی کا یہ ثبوت ہے کہ عزت پر آنچ آنے سے پہلے میں نے تیرے باپ کو گولی مار دی۔ میں انسپکٹر کے سامنے اپنے قاتل ہونے کا اقرار کر چکی ہوں۔"

انسپکٹر نے مجاہد کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ "قتل کس نے کیا ہے اس کا فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا' یہاں فرش پر اکڑوں بیٹھو۔ اٹھنا' بھاگنا یا کسی پر حملہ کرنا چاہو گے تو سپاہی تمہیں گولی مار دیں گے۔"

پھر اس نے فرزانہ بیگم' ڈاکٹر اور جانی سے کہا۔ "دوسرے کمرے میں چلیں' وہاں بیانات قلم بند کیے جائیں گے۔"

وہ سب ایک بیڈ روم میں آئے۔ انسپکٹر نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ! اگر میں تم ماں بیٹے کو قتل کے الزام سے بچالوں تو میرا کیا بھلا ہوگا؟"

بیگم نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟ ہم پر قتل کا الزام نہیں آئے گا؟"

"پولیس والے ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ تم میرا خیال کرو گی تو قتل کے اس کیس سے مکھن کے بال کی طرح تمہیں نکال لوں گا۔"

"آپ فرمائیں' کیا چاہتے ہیں؟"

"ایک لاکھ نقد۔"

ڈاکٹر ذاکر نے کہا۔ "یہ بہت ہے۔ میں بتا چکا ہوں' یہ پردیس میں بیٹے کے علاج کے لئے آئی ہیں۔"

"پاکستان کے ایک شہری کے لئے دوسرا شہر پردیس نہیں ہوتا۔ یہ لاہور سے آئی ہیں' وہاں میرے بیوی بچے ہیں۔ یہ آدھی رقم یہاں دے سکتی ہیں' باقی رقم کا چیک میری بیوی کے نام لکھ سکتی ہیں۔"

"میں بیوہ ہوں۔ قرضوں میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ میرے لئے دس پندرہ ہزار کی ادائیگی بھی پہاڑ ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب سے اور دوسرے جاننے والوں سے قرض لے کر دس ہزار دے سکوں گی۔"

"میں بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔ جان بچانے کا حق مانگ رہا ہوں۔ فیصلہ فوراً کرو۔ دیر ہوگی تو معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔"

معاملہ طے ہونے میں خاصی دیر لگی۔ پچیس ہزار میں بات مک گئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ فرزانہ بیگم کو کس طرح بچائیں گے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ مجاہد نے شراب پی رکھی ہے' اس کا مقتول باپ بھی شراب پی کر آیا تھا۔ باپ بیٹا نشے کی زیادتی میں لڑ پڑے۔ باپ نے ریوالور نکالا۔ بیٹے نے فرزانہ بیگم کا پرس چھین کر اس میں سے ریوالور نکال کر باپ کو گولی مار دی۔ ابھی میں دوسرے کمرے میں مجاہد کو بیان دینے کے لئے بلاؤں گا تو فرزانہ بیگم کا ریوالور اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا' اس طرح ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشان پڑ جائیں گے۔"

جینا نے تڑپ کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے' فراڈ ہے۔ ایک بے گناہ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی سازش ہو رہی ہے۔ کیا آپ لوگوں کے پاس دین۔ ایمان نہیں ہے' خدا کا بھی خوف نہیں ہے؟"

انسپکٹر نے تعجب سے کہا۔ "جانی! اس نے تم پر گولی چلائی' وہ تمہیں جان سے مار ڈالنے کی قسم کھا رہا ہے اور تم اس کی حمایت کر رہے ہو۔"

"وہ غصے اور جنون میں ایسا کر رہا ہے مگر اس نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے اس پر الزام نہیں آئے گا۔ اگر ایسا ہوا تو عدالت میں میرا حلفیہ بیان ہوگا کہ قتل میں نے کیا ہے۔ سزا مجھے ملنی چاہئے۔"

"مسٹر جانی! تمہاری ماں سے معاملہ طے ہوگیا ہے۔ تم میرے پچیس ہزار پر لات مارو گے تو میں تمہارے بیان کے مطابق تمہیں سزائے موت تک پہنچادوں گا۔"

فرزانہ بیگم نے گھبرا کر کہا۔ "نن.......... نہیں انسپکٹر صاحب! یہ نادان ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔ آپ کے پچیس ہزار پکے ہیں۔"

وہ جینا کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں آئی پھر بولی۔ "جینا! عقل سے کام لے' آنکھیں کھول کر چل۔ مجاہد کو رہائی ملے گی تو وہ تجھے ڈھونڈ کر قتل کر دے گا۔ اسے قاتل کی حیثیت سے جیل میں زندگی گزارنے دے۔"

"مجھے اس کے ہاتھوں قتل ہونا منظور ہے لیکن اس پر جھوٹا الزام منظور نہیں ہے۔ پلیز! آپ مجھے بے ایمانی نہ سکھائیں۔"

فرزانہ بیگم نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ صاف ظاہر تھا' وہ مجاہد پر مرمٹی ہے۔ اس کے خلاف کوئی سازش برداشت نہیں کرے گی۔ اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "اچھی بات ہے۔ اس کے خلاف سازش نہیں ہوگی۔ میں قتل کے الزام میں پہلے جاؤں گی تو گھر واپس نہیں آسکوں گی۔ مجھے حوالات میں رکھا جائے گا۔ میں تمہیں مجاہد کے رحم وکرم پر یہاں تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ تم ڈاکٹر ذاکر کے پاس رہو گے۔ دو روز بعد آپریشن ہے۔ تمہیں اسی کے پاس رہنا چاہئے۔"

"امی! یہ سوچ کر ضمیر ملامت کرتا ہے کہ آپ میری خاطر سزا پانے والی ہیں۔ مجھ

سے جھوٹ برداشت نہیں ہوگا تو میں عدالت میں اپنے جرم کا اعتراف کرلوں گی۔"

"تم ایسا کرو گی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ ایک عیاش کے مرنے سے ہم دونوں کی جانیں جائیں گی۔ مجھے سزائے موت یا عمر قید ہونے تک زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو اپنے جرم کا اقرار کبھی نہ کرنا۔ اس کمرے میں خاموشی سے بیٹھو۔ میں انسپکٹر کو سمجھاتی ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ تمہیں بھی جیل پہنچانے کا چکر چلا دے گا۔"

فرزانہ بیگم اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر آئی' دروازے کو دوسری طرف سے بند کردیا۔ پھر انسپکٹر کے پاس آکر بولی۔ "میں کل شام تک آپ کو پوری رقم پہنچا دوں گی لیکن آپ میرے بیٹے کو یہی تاثر دیں کہ قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کیا جا رہا ہے اور مجاہد کے خلاف کوئی سازش نہیں ہو رہی ہے۔"

"ہم جانی سے کب تک یہ بات چھپائیں گے؟"

"صرف تھانے پہنچنے تک۔ اس کے بعد میرا بیٹا ڈاکٹر ذاکر کے ساتھ چلا جائے گا پھر کل اسپتال میں چلا جائے گا۔ آپریشن کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب مزید علاج کے بہانے اسے اپنے ہاں رکھیں گے۔ کل اسے بتایا جائے گا کہ مجھے جیل بھیج دیا گیا ہے اور عدالت میں پیشی سے پہلے کسی کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "تم جیسا چاہتی ہو' ویسا ہی ہوگا۔ میں مجاہد کو قانونی ہتھکنڈوں میں پھانسنے کے لئے کسی دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔"

انسپکٹر وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر نے فرزانہ بیگم سے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا' بیٹی کے ساتھ میرے ہاں چلی آؤ۔ میری بات مان لیتیں تو یہ مصیبت نہ آتی بہرحال مجھے خوشی ہے کہ بیٹی کے معاملے میں مجھ پر بھروسا کر رہی ہو۔ تم جہاں بھی رہو' اطمینان سے رہو۔ میں جی جان سے اس کا علاج کروں گا۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں بیٹی سے دور رہوں گی۔"

"وہ تو رہنا ہوگا۔ اس پر ظاہر کرنا ہوگا کہ تم جیل میں ہو۔"

"ظاہر یہی ہوگا لیکن میں چوری چھپے بیٹی کے زیادہ سے زیادہ قریب رہوں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو اچھی بات ہے بھئی' تمہاری ممتا کا تقاضا ہے' تم فاصلہ رکھ کر

بھی قریب رہوں گی۔"

اس بنگلے کے تین کمروں میں تین طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ انسپکٹر بڑی چال بازی سے مجاہد کو پھانسنا چاہتا تھا۔ دوسرے کمرے میں ڈاکٹر ذاکر فرزانہ بیگم سے باتیں کر رہا تھا مگر شیطان کی آنکھ سے جینا کی حسین تبدیلیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا ڈاکٹر تھا اس سے کوئی پردہ نہیں تھا اور وہ بے پردگی ہر روز اس بوڑھے ڈاکٹر کو جوان بناتی رہتی تھی۔ قسمت مہربان تھی۔ صبح ہونے سے پہلے جینا اس کے پاس آ کر ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ بڑھاپے میں جوانی کے سنہری مواقع حاصل ہونے والے تھے۔

تیسرے کمرے میں جینا سوچ رہی تھی۔ "میں امی کو بھی جیل جانے نہیں دوں گی اور مجاہد پر بھی آنچ آنے نہیں دوں گی۔ میں اس بوڑھے ڈاکٹر کی نیت کو بھی خوب سمجھتی ہوں۔ اس کمبخت کو ڈاکٹر انکل کہتی ہوں اور وہ معائنے کے وقت مجھے ایسے دیکھتا ہے جیسے کوئی ہوس پرست قصائی نظروں کی چھریوں سے جسم کی بوٹی بوٹی کر رہا ہو۔"

وہ سوچتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولنا چاہا تو معلوم ہوا ماں نے دوسری طرف سے بند کر دیا ہے۔ اس حرکت سے پتا چل رہا تھا کہ مجاہد کے خلاف سازش جاری ہے۔ اس نے زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ وہ فوراً ہی کھل گیا۔ ماں نے پوچھا

"دروازہ اس طرح کیوں پیٹ رہی ہو؟"

وہ اس کمرے میں آ کر بولی۔ "انسپکٹر کہاں ہے؟"

"وہ مجاہد کا بیان لے رہا ہے۔"

"وہ بیان میں بھی سنوں گی۔"

"کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنے جرم کا اعتراف نہ کروں اور باقاعدہ اپنا علاج کراتی رہوں تو آپ کو اور ڈاکٹر انکل کو میری تجویز پر عمل کرنا ہو گا۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں ابھی یہاں سے بھاگ کر آپ کے گھر میں چھپنا چاہتی ہوں۔ امی کا بیان ہو گا

اس کے بیٹے جانی نے قتل کیا ہے اور سزا کے خوف سے فرار ہو گیا۔ یہ مجاہد کا بھی یہی بیان رہے گا۔ انسپکٹر ہم سب کے بیانات کے پیش نظر کوئی نئی چال نہیں چل سکے گا۔"

ماں نے کہا۔ "تم مجاہد کو بچانے کے لئے ایسا منصوبہ پیش کر رہی ہو۔"

"میں آپ کو بھی بچا رہی ہوں خود بھی قانون کی گرفت سے نکل رہی ہوں۔ ذرا سوچئے، سال دو سال کے اندر میں مکمل لڑکی بن جاؤں گی تو جانی کے خلاف قتل کا کیس دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ میری تبدیلی کا راز صرف ڈاکٹر انکل کو معلوم ہے، پولیس کبھی یہ ثابت نہیں کر سکے گی کہ میں کبھی جانی نام کا لڑکا تھی۔"

اس کا منصوبہ ایسا ٹھوس اور جامع تھا کہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ وہ بولی۔ "آپ لوگوں کو اس منصوبے پر عمل کرنا ہی ہو گا ورنہ میں عدالت میں پہنچ جاؤں گی۔ کوئی مجھے اقبال جرم سے روک نہیں سکے گا۔"

وہ راضی ہو گئے۔ ڈاکٹر ذاکر نے جیب سے چند چابیاں نکال کر جینا کو دیتے ہوئے کہا۔ "میری کوٹھی میں فی الحال تمہارا رہنا مناسب نہیں ہو گا۔ یہ میرے ایک پرائیویٹ بنگلے کی چابیاں ہیں، تم وہاں طویل عرصے تک روپوش رہ سکتی ہو۔ تمہاری امی وہاں آ کر تم سے مل سکتی ہیں۔ میں وہاں کا پتہ لکھ کر دیتا ہوں۔"

اس نے ایک کاغذ پر پتا لکھ دیا۔ جینا وہ کاغذ لے کر پچھلے دروازے سے باہر آئی۔

ماں نے کہا۔ "اکیلی جا رہی ہو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ میں قریب ہی کہیں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اس بنگلے میں فون ہے، تم وہاں پہنچتے ہی اس کا پلگ نکال دینا۔ فی الحال تمہیں فون پر بھی کسی سے رابطہ قائم نہیں کرنا چاہئے۔ ہم تم سے ملنے کا پروگرام بعد میں بتائیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ فرزانہ، ڈاکٹر کے ساتھ اسی کمرے میں واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر نے انہیں ڈرائنگ روم میں بلایا۔ وہاں ایک اور پولیس آفیسر بھی آ گیا تھا۔ مجاہد ہتھکڑی پہنے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور غصے سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے میرے ہی باپ کے قتل

کے الزام میں پھنسایا جارہا ہے۔ مجھے باتوں میں الجھا کر فرزانہ بیگم کا ریوالور میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ میں انسپکٹر کی مکاری سمجھ نہیں پایا تھا۔ اب یہ کہہ رہا ہے' ریوالور پر میری انگلیوں کے نشان ہیں۔ یہ ظلم ہے۔ یہ قانون کا محافظ نہیں شیطان ہے۔"

انسپکٹر اٹھ کر اسے لات مارنا چاہتا تھا۔ سینئر آفیسر نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہالٹ! کیا تم لات جوتوں سے اس کا بیان بدلنا چاہتے ہو۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "سر فرزانہ بیگم اور ان کا بیٹا جانی چشم دید گواہ ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ شراب کے نشے میں ہے' اس نے فرزانہ بیگم کا پرس چھین کر اس میں سے ریوالور نکال کر اپنے باپ کو گولی ماری ہے۔ کیوں فرزنہ بیگم؟"

فرزانہ بیگم نے ڈاکٹر ذاکر کو دیکھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "جو سچ ہے' وہی کہو۔"

فرزانہ نے سینئر آفیسر سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ "مجاہد کے باپ کو میرے بیٹے جانی نے قتل کیا ہے۔"

انسپکٹر ایک دم سے اچھل کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو!"

وہ بولی۔ "مجھے افسوس ہے' سچ کہنے سے ہم دونوں کا نقصان ہے۔ تمہیں پچیس ہزار نہیں ملیں گے اور میرا بیٹا قاتل کہلائے گا۔"

سینئر افسر نے کہا۔ "تمہارا بیٹا کہاں ہے؟""

"وہ سزا کے خوف سے بھاگ گیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "سر! یہ ماں بیٹے کی چال ہے۔ ڈاکٹر بھی ان کی چال میں شریک ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جانی قانون کے ڈر سے نہیں' مجاہد کے خوف سے بھاگ گیا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے' اپنے باپ کا قاتل اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

مجاہد نے پوچھا۔ "تمہیں انسپکٹر کس نے بتایا ہے؟ قاتل کی ماں بیان دے رہی ہے۔ میرے باپ نے بھی آخری سانسوں میں جانی کو قاتل کہا ہے۔ پھر بھی تم مجھے اپنے باپ کا قاتل کہہ رہے ہو۔ ویسے تمہاری یہ بات درست ہے' جانی میرے خوف سے کہیں چھپنے گیا ہے۔ مگر کہاں چھپے گا۔ دنیا دیکھنے میں بڑی ہے' ڈھونڈنے میں چھوٹی ہے۔ میں اسے

ڈھونڈ کر اپنے باپ کا بدلہ لوں گا۔"

سینئر افسر نے کہا۔ "مجاہد! اب تم نے کسی کو قتل کی دھمکی دی تو میں تمہیں جیل پہنچا دوں گا۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو خاموش رہو۔ فرزانہ بیگم تم شروع سے تفصیل بتاؤ۔ یہ واردات کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ بائی دی وے تمہارا بیٹا کہیں چھپنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔"

فرزانہ اسے تمام روداد سنانے لگی۔ راشی انسپکٹر کے ہوش اڑ رہے تھے۔ برسوں کی ملازمت میں پہلی بار اس پر برا وقت آرہا تھا۔

☆======☆======☆

پولیس والے پورے شہر میں جانی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ پولیس والوں سے زیادہ مجاہد اس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ سینئر افسر نے اسے اور فرزانہ بیگم کو سختی سے حکم دیا تھا کہ جب تک جانی گرفتار نہیں ہو' وہ دونوں شہر سے باہر نہیں جائیں گے اور چوبیس گھنٹے میں ایک بار علاقے کے تھانے میں حاضری دیا کریں گے۔

ڈاکٹر ذاکر پر بھی کڑی نظر رکھی گئی تھی لیکن چوبیس گھنٹے بعد وہ اچانک ہی غائب ہوگیا۔ اس نے فرزانہ سے وعدہ کیا تھا۔ "میں ہر حال میں تمہاری بیٹی کو مکمل کر دوں گا۔ دن رات اس پر توجہ دیتا رہوں گا۔ آپریشن کا ضروری سامان بھی لے جاؤں گا لیکن ایک اسسٹنٹ ضروری ہے۔"

فرزانہ نے کہا۔ "میں شادی سے پہلے ایک نرس تھی۔ ایک بار جینا کے باپ کی تیمارداری کے لئے اس کے عالیشان محل میں گئی تو وہیں دلہن بن کر رہ گئی۔ کیا میں اپنی بیٹی کے معاملے میں تمہاری اسسٹنٹ بن سکتی ہوں؟"

"ضرور' میرے جانے کے بعد تم پولیس والوں سے چھپ کر بیٹی کے پاس آجاؤ۔ اسے ہم دونوں کی ضرورت ہے۔"

فرزانہ نے سوچا۔ "ڈاکٹر کے روپوش ہونے کے بعد پولیس محتاط ہوجائے گی' مجھ پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ میں اپنی دانست میں چھپ کر جاؤں گی تو پولیس والے بھی وہاں پہنچ جائیں گے پھر جینا کو سزا سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

اسے معلوم تھا' ڈاکٹر کس وقت گھر سے جائے گا۔ وہ تھانے میں حاضری دینے کے بعد بنگلے میں آئی۔ برقع پہنا پھر رات کی تاریکی میں پچھلے دروازے سے نکل گئی۔ اس نے بیٹی تک پہنچنے کے لئے پورے شہر کا چکر لگایا۔ چار ٹیکسیاں بدلیں' جب یقین ہوگیا کہ

تعاقب نہیں ہو رہا ہے تو وہ ڈاکٹر کے پرائیویٹ بنگلے میں پہنچ گئی۔

ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم آج ہی چلی آئیں؟"

"ہاں' ماں کا دل نہیں مانتا کہ بیٹی کو کسی کے پرائیویٹ بنگلے میں تنہا چھوڑ دے۔ آپ برا نہ مانیں۔"

"برا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں جانتا ہوں' تم شروع سے مجھ پر بھروسا نہیں کرتیں اور کرنا بھی نہیں چاہئے۔ بھئی' جب میں اس پر اتنی محنت کر رہا ہوں' اسے مکمل کرنے کے لئے اپنا پورا کیریئر تباہ کر رہا ہوں اور پولیس والوں کو اپنا دشمن بنا رہا ہوں تو اس لڑکی پر میرا ہی حق ہونا چاہئے۔"

وہ چونک کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"صاف صاف کہہ رہا ہوں۔ میری عمر نہ دیکھو' میرا حوصلہ دیکھو۔ میں جینا کو ہر طرح خوش رکھوں گا۔ اس کا ایسا مکمل علاج کروں گا کہ یہ میرے بچوں کی ماں بھی بن سکے گی۔"

جینا نے کہا۔ "لعنت ہے تم پر۔ میں تمہیں انکل کہتی ہوں۔ تمہاری بیٹی جیسی ہوں اور تم اتنی بری نیت رکھتے ہو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ابھی تو اچھی نیت ہے تمہاری مکمل تبدیلی کے بعد شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم ماں بیٹی کو انکار ہے تو بری نیت بھی دیکھ لو گی۔"

فرزانہ بیگم نے کہا۔ "تم میری بیٹی کا کیا بگاڑ لو گے؟ زیادہ سے زیادہ علاج نہیں کرو گے۔ یہاں سے لاہور تک بے شمار ڈاکٹر ہیں اور میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔"

"پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کر رہی ہو۔ یہاں سے باہر نہیں جاسکتیں۔ کسی ڈاکٹر سے رابطہ قائم نہیں کرسکتیں۔ ہاں اگر بیٹی کو جیل پہنچانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔"

ماں بیٹی پریشان ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگیں۔ وہ بری طرح پھنس گئی تھیں۔ ڈاکٹر کا پرائیویٹ بنگلہ ان کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی اور ایک جیل بھی تھی۔ ماں اس جیل سے نکل کر بیٹی کو دوسری جیل میں پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ بیٹی نے کہا۔ "امی! یہ ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ مگر یہ بھول رہا ہے کہ میں اقبال جرم کا حوصلہ

کرچکی ہوں' یہاں سے نکل کر سزا پانے کا بھی حوصلہ کر سکتی ہوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "نہیں بیٹی! مکمل تبدیلی سے پہلے باہر جانے کی حماقت نہ کرنا۔ ہمیں موجودہ مسئلے پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب تمہارے ابو کے بہت گہرے دوست ہیں' میں انہیں بہت پرانی دوستی کا واسطہ دے کر احتجاج کرتی ہوں کہ یہ اپنی منفی سوچ بدل ڈالیں ورنہ نقصان کسی ایک کو نہیں تینوں کو پہنچے گا۔"

وہ بولا۔ "مجھے نقصان کی پرواہ نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ آیا ہوں آئندہ اس کے لئے دنیا بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ تم دونوں کو سوچنے سمجھنے کے لئے ساری رات پڑی ہے۔ صبح مجھے فیصلہ سنا دینا۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جینا غصے سے تلملا رہی تھی' اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی اور دبی زبان سے ڈاکٹر کو گالیاں دے رہی تھی۔ ماں نے سمجھایا۔ "غصہ کرنے اور گالیاں دینے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرو۔"

"وہ میرے متعلق کیسی باتیں کر گیا ہے۔ کیا آپ کو شرم نہیں آرہی ہے' ذرا بھی غصہ نہیں آرہا ہے؟"

"تم غصے میں کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اسے بھی گولی مارنا چاہتی ہوں۔"

"مجاہد کے باپ کو قتل کرکے کیا پالیا؟ ہماری مصیبتیں بڑھتی جارہی ہیں۔"

"کیا آپ چاہتی ہیں' میں اس بڈھے کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاؤں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں چاہتی ہوں' تم صبر سے' ذہانت سے اور حوصلے سے کام لو۔ صبر کرنے سے اپنے اندر جلد بازی پیدا نہیں ہوتی۔ سوچنے سمجھنے کا کافی موقع ملتا ہے اور جب موقع ملے تو ذہانت سے سوچو۔ تمہیں مکمل لڑکی بننے میں کم از کم ایک سال کا عرصہ لگے گا۔ تم ایک برس تک اسے سبز باغ دکھا سکتی ہو' اسے اُلو بناتے رہنے کے لئے ذہانت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ یہ خوبیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن اکثر لوگ غصے اور جلد بازی میں ان خوبیوں سے کام نہیں لے پاتے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں گائیڈ کرتی

ہوں گی۔"

اس وقت جینا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ذہانت سے' بگڑی ہوئی بات کیسے بنائی
کتی ہے۔ ماں کی بات محض بزرگانہ نصیحت لگ رہی تھی۔ ویسے یہ بات سمجھ میں آگئی
ں کہ مکمل لڑکی بننے تک ڈاکٹر اس کی تنہائی میں نہیں آئے گا۔

بہرحال' بڑے صبر سے دن گزرنے لگے۔ وہ آپریشن کے مرحلے سے گزر گئی۔ ڈاکٹر
ں کا علاج کر رہا تھا' یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابھی شادی کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔
ا اور فرزانہ نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی جسمانی معائنہ
کرے۔ فرزانہ ایک نرس کی حیثیت سے جسمانی حالت کی رپورٹ دیتی رہے گی۔ ڈاکٹر
ضد نہیں کی۔ یہ بات مان لی کیونکہ ماں جھانسا دے رہی تھی کہ بیٹی پر اسی کا حق ہوگا
دہی بڑھاپے میں دولہا بنے گا۔

جب وہ لڑکا تھی تب ہی سر کے بال ہپیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ لڑکی بننے کے
ار پیدا ہوئے تو اس نے بالوں کو مکمل بڑھنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پہلے ایک برس تک
ا کی پروگریس رپورٹ کے مطابق علاج ہوتا رہا۔ ایک برس بعد کامیاب آپریشن ہوا۔
ہ نمایاں تبدیلیاں پہلے سے ہوتی آرہی تھیں۔ آپریشن کے ڈیڑھ برس بعد وہ بھرپور
یزہ نظر آنے لگی۔ یعنی کل ڈھائی برس میں سیاہ ریشمی زلفیں شانوں تک آگئیں۔
ھیں پیدائشی طور پر بڑی بڑی کٹورا جیسی تھیں۔ اب وہ غزالی ہوگئی تھیں اور غزل
ی تھیں۔ چہرے کی اور بدن کی جلد ایسی چکنی اور ملائم ہوگئی کہ چھو کر دیکھنے کو جی چاہتا

ایسے میں ڈاکٹر کیسے دیوانہ نہ ہوتا۔ دیوانگی پہلے سے بڑھ گئی تھی لیکن عمر کے حساب
کمزوری بڑھتی جارہی تھی۔ وہ حیران تھا۔ ڈیڑھ برس میں چلتے پھرتے ہانپنے لگا تھا۔ جبکہ
سے باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اعصاب کمزور ہوتے جارہے ہیں۔

ڈھائی برس بعد جینا پہلی بار شلوار قمیض اور دوپٹے میں ایک مکمل دوشیزہ بن کر بنگلے
باہر گئی تو ڈاکٹر بستر پر پڑا ہوا تھا۔ غصے سے مگر کمزوری سے کہہ رہا تھا۔ "فرزانہ تُو نے
رے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ مجھے چپکے چپکے اعصاب کمزور کرنے والی دوا کھلاتی رہی ہو۔

تُو نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا ہے۔"

فرزانہ نے کہا۔ "بڈھے! کیوں بکواس کرتا ہے۔ تُو ڈاکٹر ہے۔ میں دھوکے سے دو کیسے کھلا سکتی ہوں۔ کیا تُو کھاتے وقت دوا کو محسوس نہیں کر سکتا تھا؟"

"محسوس کر لیتا تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔ اگر دوا کم سے کم مقدار میں دودھ یا ک مشروب کے ساتھ دی جاتی رہے تو ڈاکٹر بھی اسے سمجھ نہیں پاتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں تُو نے ان ڈھائی برسوں میں مجھے تھوڑا تھوڑا کر کے بستر پر پہنچا دیا ہے۔"

فرزانہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج میری بیٹی پہلی بار پورے اعتماد کے ساتھ باہ گئی ہے۔ خدا کرے مجاہد اور پولیس والے اسے پہچان نہ سکیں۔"

وہ بولا۔ "خدا کرے، پہچان لیں۔ اگر میں اسے حاصل نہ کر سکا تو تھانے پہنچ جاؤ گا۔ مجاہد کے پاس بھی جاؤں گا، اسے بتاؤں گا کہ میں نے اسے زیر علاج رکھ کر لڑکی بنا ہے۔ یہ وہی جانی ہے جسے وہ قتل کرنا چاہتا ہے۔"

"ڈاکٹر! بستر سے اٹھ سکو تو ضرور ہم سے دشمنی کر لینا۔ ابھی تم نے جو دودھ پیا وہ تمہاری آخری خوراک تھی۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "آخری خوراک؟" وہ بستر سے اٹھنا چاہتا تھا مگر کراہ کر ر گیا۔ اندر سے بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اٹھ کر بیٹھ سے سر چکرانے لگا تھا۔ وہ پھر تکیے پر گر پڑا۔

فرزانہ نے کہا۔ "ابھی تم نے میری شاہکار بیٹی کو دیکھا۔ اسے تم نے ہی شاہکار بنا ہے۔ افسوس! حسرت سے دیکھ دیکھ کر مر جاؤ گے مگر اسے چھو نہیں سکو گے اور اب چھونے کی خواہش کرنے کا وقت بھی گزر چکا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی پھر اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ لیا۔ وہ کمزوری سے کانپتے ہوئے بولا۔ "دور ہو جا۔ میرے پاس مت آ۔"

وہ بستر پر چڑھ گئی، پھر اچانک ہی تکیہ اس کے منہ اور ناک پر رکھ کر دونوں ہاتھو سے دبا دیا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اپنے ہاتھوں سے اسے دھکا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ایک جان چھوڑنے والے اعصابی مریض کی کوشش تھی جو مشکل سے چند سیکنڈ تک جار

رہی۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑے۔ جسم ساکت ہو گیا۔ گرما گرم شاہکار تراشنے والا ہمیشہ کے لئے سرد پڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جینا ایک ٹیکسی میں واپس آئی۔ بستر پر ڈاکٹر کی لاش کو دیکھا۔ فرزانہ نے کہا۔ "یہ ابدی نیند سو رہا ہے وقت ضائع نہ کرو۔ اپنا سامان لے کر چلی جاؤ۔"

"امی! سچ سچ بتائیں آپ یہاں کیا کریں گی؟"

"میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ جب بھی حالات اجازت دیں گے، تم سے ضرور ملنے آؤں گی۔"

وہ باتیں کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئیں۔ وہاں جینا کا ایک سوٹ کیس اور چھوٹی اٹیچی رکھی ہوئی تھی۔ ماں نے اچھی خاصی رقم خرچ کر کے بیٹی کا نیا شناختی کارڈ، دسویں پاس کا سرٹیفکیٹ اور ڈومیسائل وغیرہ بنوا لیا تھا۔ وہ برقع پہن کر جایا کرتی تھی اور یہ سارے کام کرتی رہتی تھی۔ لڑکیوں کے ایک ہاسٹل میں جینا کی رہائش کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

وہ ماں کے گلے لگ کر روتے ہوئے بولی۔ "آپ میرے لئے سب کچھ کرتی آ رہی ہیں۔ میں آپ کے لئے کچھ نہ کر سکی۔"

"تم نے ماں کی عزت بچائی۔ اس سے بڑا کام اور کیا ہو سکتا ہے، پھر تم میری بات مان کر ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ مجاہد دشمنی بھول چکا ہو گا اور تمہیں قبول کر لے گا۔"

"مجھے پورا یقین ہے۔ میں جان دے کر بھی اسے منا لوں گی۔"

"ایک بار پھر وعدہ کرو۔ تم اسے یہ کبھی نہیں بتاؤ گی کہ جانی تم ہی تھیں۔ عورتیں اپنے مرد کی محبت میں سرشار ہو کر ایسی باتیں بتا دیتی ہیں جو بعد میں ان کی تباہی کا سبب بنتی ہیں تم یہ غلطی نہیں کرو گی۔"

"میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

وہ رو رہی تھی۔ اس نے بیٹی کے آنسو پونچھے، اسے خوب پیار کیا پھر دروازے تک چھوڑنے آئی۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تو اس نے دروازے کو بند کیا۔ اپنے بیڈ

روم میں آئی۔ میز پر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ پھر لکھنے لگی۔

"میری یہ تحریر متعلقہ افسر کے لئے ہے۔

میں مسماۃ فرزانہ بیگم زوجہ ملک اکبر شاہ مرحوم یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میرے بیٹے جانی نے میری عزت بچانے کے لئے عابد علی خان کو ہلاک کیا تھا۔ میں ڈیڑھ برس سے بیٹے کی تلاش کر رہی ہوں اب مایوس ہو چکی ہوں۔ وہ اس دنیا میں ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ضرور رابطہ قائم کرتا۔

اگر وہ زندہ ہے تو میں اسے مجاہد کے انتقام سے بچانے کے لئے خون بہا ادا کر رہی ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں تقریباً بائیس لاکھ روپے ہیں اور لاکر میں دو لاکھ کے زیورات ہیں۔ میں یہ تمام رقم اور زیورات مجاہد کے نام کر چکی ہوں۔ اس سلسلے میں میرا ایک خط بینک منیجر اور ایک خط میرے وکیل کے پاس پہنچ چکا ہے۔

آپ لوگوں سے گذارش ہے کہ مجاہد ولد عابد علی خان مرحوم کو خون بہا ادا کرنے کے سلسلے میں قانونی تقاضوں کو پورا کریں۔ شکریہ۔"

فرزانہ بیگم نے تحریر کے نیچے اپنا نام لکھا۔ وہاں سے اٹھ کر الماری کے پاس آئی' اسے کھول کر ایک ریوالور نکالا۔ الماری کو بند کیا۔ جس کاغذ پر تحریر تھی اسے تہہ کر کے اپنے گریبان کے اندر رکھا۔ وہاں سے چلتی ہوئی ایک ایزی چیئر پر آئی۔ پھر آرام سے بیٹھ کر نال کو کنپٹی سے لگایا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی اس بنگلے کی چار دیواری سے ٹھائیں کی آواز گونجتی ہوئی باہر آئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

☆======☆======☆

مجاہد کی قسم پہلے دن کی طرح ڈھائی برس بعد بھی جوان تھی' جوشیلی تھی بلکہ اس میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کم پیتا تھا' جانی کو بھلانے کے لئے اب زیادہ پینے لگا تھا۔ پھر وہ نشے میں اپنے آپ سے پوچھتا تھا۔ "میں جانی کو کیوں بھلانا چاہتا ہوں جب کہ اسے قتل کرنے کے لئے تلاش کر رہا ہوں۔ ذلیل' کمینہ' مکار نہ ملتا ہے' نہ دماغ سے جاتا ہے۔"

ابتدا میں اکثر یوں ہوتا تھا کہ جانی کے قد اور جسامت کا دبلا پتلا سا کوئی لڑکا دور سے نظر آتا تھا تو مجاہد غصے میں اس کی طرف لپکتا تھا۔ پہلی بار اس نے ایک لڑکے کی گردن دبوچ لی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالنا چاہا تھا' لڑکے نے چیخ مار کر سر گھمایا تو وہ کوئی اور تھا گردن پر گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ خود کو چھڑا کر دور بھاگ گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ چاقو مجاہد کے ہاتھ میں کھلا رہ گیا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگتا چلا گیا۔

دوسری بار جانی ایک بھیڑ میں نظر آیا۔ مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے چاند رات کی خوشی میں شاپنگ کر رہے تھے۔ اس بھیڑ میں کتنے ہی سروں کے پیچھے وہ ایک دکان کے قریب نظر آیا۔ مجاہد تیزی سے چلتا ہوا بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو پتا چلا وہ جانی نہیں ہے' فریب نظر ہے۔ جانی حواس پر اس قدر چھا گیا تھا کہ اس کی عمر کا اور قد کا ہر لڑکا دور سے جانی ہی دکھائی دیتا تھا۔

عقل نے سمجھایا۔ "مجاہد' ہوش میں رہا کرو۔ ورنہ رات کی تاریکی میں کسی بے گناہ کو جانی سمجھ کر قتل کر دو گے تو جیل چلے جاؤ گے۔ عمر قید کی سزا ہو گی۔ جیل سے باہر کی دنیا میں جانی آزاد گھومتا رہے گا اور تم آہنی سلاخوں کے پیچھے اسے قتل کرنے کی حسرت لئے مر جاؤ گے۔"

اس نے رفتہ رفتہ خود کو سنبھال لیا۔ باپ کے قتل کا انتقام لینے کے جذبے اور جنون کو اپنے اندر چھپا لیا۔ اوپر سے نارمل ہو گیا جانی کی تلاش میں لاہور گیا۔ وہاں مہینوں بھٹکتا رہا۔ پھر کراچی واپس آ گیا۔ پولیس والوں نے فرزانہ کے بینک اکاؤنٹ سے رقم نکالنے اور لاکر کھولنے کی پابندی عائد کر دی تھی۔ بینک کے منیجر سے کہا گیا تھا جب بھی فرزانہ کا چیک آئے یا وہ لاکر کھولنے آئے تو فوراً پولیس کو اطلاع دی جائے۔ مجاہد کو معلوم تھا کہ بینک اور لاکر میں لاکھوں روپے ہیں' فرزانہ اور جانی ایک نہ ایک دن اپنی رقم حاصل کرنے بینک ضرور آئیں گے۔ اسے یقین تھا' اس طرح وہ جانی کی شہ رگ تک پہنچ جائے گا۔

ڈھائی برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ انسان بدل جاتا ہے اور خبر نہیں ہوتی۔ اس بے خبر نے اچانک ہی ایک دن جینا کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ بالکل وہی شاپنگ سینٹر تھا جہاں جانی سے دوسری ملاقات ہوئی تھی' جہاں جانی

عورتوں والا پرفیوم پسند کر رہا تھا' جینا بھی اسی کاؤنٹر پر کھڑی اسی پرفیوم کی شیشی کو دیکھ رہی تھی۔

جینا اس سے بے خبر نہیں تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے والے آئینے میں اسے دیکھ کر انجان بن رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اپنی گردن اِدھر اُدھر کرکے اسے پوری طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ جینا نے گھوم کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ذرا جھجک گیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "سوری! تمہاری صورت کچھ آشنا لگ رہی ہے' میں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وہ بولی۔ "کر رہا تھا کا مطلب ہے' کوشش کر چکے ہو اور میں صورت آشنا نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ میں ابھی تک الجھن میں ہوں۔ یہ.......... یہ پرفیوم اسے بھی پسند تھا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں نے اسی دکان میں اسی کاؤنٹر پر اس سے کہا تھا' یہ لڑکیوں کا پرفیوم ہے' جب کہ وہ لڑکا تھا۔"

جینا ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں مدھ بھری موسیقی کا ترنم تھا۔ کانوں میں چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "میں نے یہ پرفیوم اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔"

وہ اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "لطیفہ سنا رہے ہو۔ ہنسی تو ضرور آئے گی۔ پہلے تو تم نے اس لڑکے کو سمجھایا کہ یہ عورتوں کا پرفیوم ہے۔ یہ سمجھانے کے باوجود تم نے لڑکیوں کا تحفہ لڑکے کو دیا۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے اگر نہیں ہے تو تحفے کا مقصد کیا تھا؟"

"دراصل میری خواہش تھی کہ وہ لڑکا نہ ہو لڑکی ہو۔ میں نے خیالوں میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں دیکھیں' جب میرے خیالات نے اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا اور پلکیں گھنی کر دیں تو وہ جھکی جھکی گھنی پلکوں کے پیچھے شرما رہا تھا۔"

جینا کی گھنی پلکیں بے اختیار جھک گئی تھیں وہ شرما رہی تھی' مسکرا رہی تھی۔ پھر

اسے غلطی کا احساس ہوا' وہ جلدی سے نظریں اٹھا کر بولی۔ "مسٹر! تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔ تعجب ہے' میں بھی تمہاری باتوں میں آکر بھول گئی تھی کہ اجنبی سے خواہ مخواہ باتیں کیے جا رہی ہوں۔"

"میرا نام مجاہد ہے' اگر اپنا نام بھی بتا دو تو ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں رہیں گے۔"

اس نے نام نہیں بتایا۔ پہلی ملاقات میں حد سے بڑھنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے کاؤنٹر مین کی طرف گھوم کر پوچھا۔ اس پرفیوم کی کیا قیمت ہے؟"

مجاہد نے وہ شیشی ہاتھ میں لے کر کہا۔ "قیمت جتنی بھی ہو' میں ادا کروں گا۔ یہ میری طرف سے تحفہ قبول کرو۔"

وہ خوش ہوئی مگر آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نے مجھے تحفے میں بکنے والی لڑکی سمجھا ہے۔ کسی جان پہچان کے بغیر تحفہ دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اگر جرأت اظہار کی اجازت ہو تو صاف صاف کہوں' تم اتنی حسین لگ رہی ہو کہ تمہیں دینے کے لئے خوشبو سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔ یوں سمجھو میں ایک خوبصورت غزل کی داد دے رہا ہوں۔ داد وصول کر لو۔"

"تم باتوں سے بہت اچھے لگتے ہو۔ مگر اندر سے بھی اچھے ہو یا نہیں۔ یہ بات میں چند لمحوں میں سمجھ نہیں سکتی۔ کبھی سمجھ لوں گی تو داد وصول کرنے کے متعلق سوچوں گی۔ فی الحال سوری۔"

وہ پلٹ کر دکان سے باہر جانے لگی۔ مجاہد نے جلدی سے پرفیوم کی قیمت ادا کی شیشی کو جیب میں رکھا پھر لپک کر باہر آیا۔ وہ فٹ پاتھ پر جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کافی فاصلہ رکھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا۔ "اکثر میرا خیال اسے دوشیزہ کے روپ میں پیش کرتا تھا' اس لڑکے کو ایک حسین لڑکی بنتے ہوئے دیکھتا تھا۔ آج ایسی ہی صورت حسن کی مورت نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جو ہم سوچیں ویسا ہو جائے۔ یہ خواب جیسا لگتا ہے۔"

اس نے ایک انگلی دانتوں تلے دبائی۔ تکلیف کے احساس نے بتایا' وہ خواب نہیں ہے۔ جیتی جاگتی حقیقت ہے لیکن جانی سے مشابہت کیوں ہے؟ اس کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ سیدھی سی بات یہی تھی کہ محض مشابہت کی بنا پر وہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ ورنہ حسین لڑکیاں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ وہ پسند بھی آتی ہیں۔ مگر یوں دیوانہ نہیں بناتیں۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کا پتا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح کبھی جانی سے دوستی کرنے کے لئے بے چین ہو گیا تھا اس طرح آج بھی دوستی کے لئے باؤلا ہو رہا تھا۔

اچانک وہ ہاتھ سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ پھر تیزی سے پلٹ کر اپنی کار کی طرف دوڑنے لگا۔ کار اس شاپنگ سنٹر کے پاس تھی' جہاں جینا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے اسے اسٹارٹ کیا لیکن پیچھے ایک کار پارکنگ کے لئے آ رہی تھی' اس کا راستہ رک گیا۔ اس نے جھنجلا کر ہارن پر ہارن بجایا۔ پیچھے والی کار نے اسے راستہ دیا۔ اس نے ریورس گیئر پر اپنی گاڑی کو پیچھے لے جا کر آگے بڑھانا چاہا تو آگے ایک ریڑھے والا آ گیا۔ اس نے غصے میں ریڑھے والے کو گالیاں دیں۔ وہ بولا۔ "اے بابو صاحب! کار میں بیٹھ کر لاٹ صاحب بن رہے ہو۔ مرد کے بچے ہو تو نیچے آ کر گالی دو۔ یہ ریڑھا تو یہیں رہے گا۔"

وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسٹیئرنگ گھما کر ریڑھے سے کتراتا ہوا آگے بڑھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی جس میں حسینہ کو بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کار اگلے سگنل تک دوڑائی۔ وہ چوراہا تھا' پتا نہیں وہ کس راہ پر گئی تھی۔ مجاہد اندازے سے سیدھا ڈرائیو کرتا چلا گیا۔ اس نے ٹیکسی کا نمبر یاد کر لیا تھا۔ بہت دور جا کر واپس ہوا۔ چوراہے کے باقی راستوں پر بھی گاڑی دوڑاتا رہا۔ ایک گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی وہ ٹیکسی نظر نہیں آئی۔

وہ جلوہ دکھا کر گم ہو گئی تھی ایسے میں طلب بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لئے بھی طلب بڑھ گئی تھی' تجسس بھڑکا رہا تھا۔ وہ کون تھی؟ جانی کی مشابہت لے کر کہاں گم ہو گئی...... وہ عجب دوغلی کیفیت میں تھا۔ جانی کو قتل کرنا چاہتا تھا اور جینا کی طلب میں

رمنا چاہتا تھا۔

وہ دن بھر اضطراب میں مبتلا رہا۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں میں آہستہ آہستہ کار رائیو کرتا ہوا ہر آنے جانے والی کو دیکھتا رہا۔ جب وہ شام تک نظر نہ آئی تو اس نے ایک وٹی سی گالی اسے دی۔ پھر اپنی کوٹھی میں آ کر وہسکی کی بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔ پہلے پیگ کا ہلا گھونٹ پی کر بڑبڑایا۔ "اونہہ' دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی ہے۔ تو نہ ہی اور سہی اور نہ سہی میں ابھی فون کر کے کسی حسین ساقی کو بلا لوں گا۔"

وہ ایک پیگ ختم کرنے کے بعد کسی حسینہ کو فون کرنا چاہتا تھا پھر دوسرا پیگ ختم رکے سوچا۔ "ذرا ٹھہر کر بلانا چاہئے' ابھی موڈ نہیں بن رہا ہے۔ مجھے جانی شدت سے یاد رہا تھا جب تک میں اسے قتل نہیں کروں گا' وہ مجھے یاد آتا رہے گا' لیکن نہیں' پچھلے نوں میں نے انتقام کی آگ کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ میرے اندر لاوا پکتا رہتا ہے۔ مگر اوپر ے خاموش رہتا ہوں مگر آج میری خاموشی ٹوٹ گئی ہے۔ اس حسینہ نے سامنے آ کر پھر نتقام کو میرے اندر بھڑکا دیا ہے۔"

اس نے تیسرے پیگ میں سوچا۔ "اچھا ہوا' وہ گم ہو گئی ٹیکسی میں بیٹھ کر دفع وگئی۔ آئندہ وہ نہ ملے تو میں نارمل رہوں گا۔ اگر ملے گی تو میں اسے لفٹ نہیں دوں گا۔ ں سے نظریں پھیر لوں گا۔ آنکھیں بند کر لوں گا یا آنکھیں پھوڑ لوں گا مگر اسے نہیں یکھوں گا اور اسے دیکھنے کے لئے ہے بھی کیا؟ جو مال مسالہ دوسری لڑکیوں میں ہوتا ہے' ہ اس میں بھی ہے۔ وہ کوئی انوکھی' غیر معمولی پٹاخا تو نہیں ہے۔"

چوتھا پیگ ختم ہوا تو اس کی ہنسی سنائی دی۔ اگرچہ اس نے ایک ہی بار اس کی ہنسی ئی تھی تاہم وہ چاندی کی گھنٹیوں کے کھنکتے ہوئے ترنم کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' چار لارج پیگ کا نشہ بول رہا تھا۔ در و دیوار گھوم رہے تھے اور وہ در ہ کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تاکہ یہ کوئی فریب نظر ہو تو ختم ہو جائے' وہ گم ہو جائے مگر نشے میں آنکھیں پھاڑنے کے باعث وہ ایک کی دو نظر آنے لگی۔ اس نے انچویں پیگ سے دو گھونٹ پیئے پھر کہا۔ "میں ایک کو بھلانا چاہتا ہوں۔ یہ دوسری کو بھی

لے آئی ہے۔"

اس نے آنکھیں بند کیں۔ پھر آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ چار چار دکھائی دے رہی تھیں اور وہ چاروں کہہ رہی تھیں۔ "میں آگیا ہوں۔ میں آگئی ہوں۔"

وہ آوازیں اس کے دماغ میں گونجنے لگیں' جب گونج ہوتی کہ میں آگیا ہوں تو جانی دکھائی دیتا تھا اور جب سنائی دیتا کہ میں آگئی ہوں تو جانی کی ہم شکل حسینہ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آتی تھی۔ ایک تو نشے سے کھوپڑی الٹ رہی تھی۔ دوسرے وہ دماغ کو چکرا رہی تھی۔

جب اسے جانی دکھائی دیا تو وہ غصے سے کھڑا ہوگیا۔ ڈگمگاتے ہوئے بولا۔ "سؤر کے بچے! میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اپنی جگہ کھڑے رہنا میں آرہا ہوں۔"

وہ آگے بڑھا۔ مگر لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ جینا اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "کیوں دشمنی کرتے ہو؟ مجھے دیکھو میں تمہارے لئے اپنا وجود بدل کر آئی ہوں۔ یہ ایسا چمکتا دمکتا وجود ہے جسے گلے لگا کر چوما جاتا ہے' دشمنی سے تھوکا نہیں جاتا۔"

وہ قریب آکر رک گئی تھی۔ اس کے گورے اور گلابی پاؤں نگاہوں کے سامنے تھے' دل کھینچ رہے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر پاؤں چھونے کو اور سہلانے کو جی چاہتا تھا۔ وہ منہ پھیر کر گرجتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جانی! تو ہزار روپ بدل کر آئے گا تو میں ہزار بار تجھے قتل کروں گا۔ تُو نے میرے باپ کو بے موت مار ڈالا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی ایک میرے خون کا سرچشمہ تھا۔ میں اس سے لڑتا جھگڑتا تھا اور ٹوٹ کر محبت بھی کرتا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا میرا باپ تھا۔ اس نے اپنے نطفے سے مجھے اتنی بڑی دنیا دی اور تُو نے دنیا دینے والے کو مجھ سے چھین لیا۔ تو یہ چمکتی دمکتی جوانی لے کر آئے گا تو یہ جوانی چھین لوں گا۔ تیرے حسن کی ساری کرشمہ سازیوں کو فنا کر دوں گا اور تجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالوں گا۔"

وہ گورے گلابی پاؤں پلٹ کر جانے لگے' اس نے چیخ کر کہا۔ "کہاں جاتا ہے۔ رک جا۔ مرد ہے تو سامنا کر۔"

"عورت ہوں۔" وہ دروازے سے پلٹ کر بولی۔ "میں تمہارے جیسے بے قدروں کے پاس ٹھہر نہیں سکتی۔ آہ کتنے ارمانوں سے آئی تھی اور کتنی حسرتوں سے جا رہی

ں۔"

وہ دروازے سے باہر آئی پھر دیوار کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "رک ؤ۔ واپس آجاؤ۔ میں تمہیں نہیں جانی کو قتل کروں گا۔ تم تو میری محبت ہو' میرے وازے تک چل کر آئی ہو۔ میں تمہیں گلے سے لگاؤں گا' تمہیں دل میں بٹھاؤں گا۔ جاؤ۔ آجاؤ۔ آ۔ جاؤ.........."

اس کی آواز ڈوبتے ڈوبتے گم ہوگئی۔ خاموشی چھاگئی۔ جینا دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ کھے سوچ رہی تھی۔ "مجھے اتنی رات کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر یہ دل نہیں مان رہا ۔ مجھے سمجھا رہا تھا۔ مجاہد کو پینے کی عادت ہے۔ روز نہ بھی پیتا ہو تو مجھے دیکھ کر پئے گا۔ ں نے سوچا تھا کہ وہ نشے میں سچ بولے گا۔ دل میں کوئی بات نہیں رکھے گا۔ آہ! اس کی یں سن کر دکھ بھی ہوا' خوشی بھی ہوئی۔ دیوانہ وار میری آرزو کر رہا ہے محبت سے اور ے قتل کرنا چاہتا ہے نفرت سے.........."

اس نے ذرا جھانک کر کمرے کے اندر دیکھا۔ وہ فرش پر پڑا تھا۔ کچھ نہیں بول رہا ۔ وہ کمرے میں آئی۔ دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچی۔ وہ مدہوشی میں کراہ ا تھا۔ جینا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مدہوشی میں نکھیں پوری طرح نہیں کھل رہی تھیں۔ وہ گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر سہارا دیتے ئے بولی۔ "چلو اٹھو۔ میں تمہیں بستر پر پہنچا دوں۔"

مجاہد کراہتے ہوئے اٹھنے لگا۔ جینا کا سہارا نہ ملتا تو وہ صبح سے پہلے اٹھ نہ پاتا۔ اس ے کھڑے ہو کر اپنا تمام بوجھ جینا پر ڈال دیا۔ اپنے بل پر چلتا تو پھر گر پڑتا۔ وہ پہاڑ کے تھ گھسٹتی ہوئی کسی طرح بستر تک پہنچی۔ پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کے ساتھ ں گری کہ وہ نیچے اوپر ہوگئے۔ پہاڑ تلے چیونٹی آگئی تھی۔ اس نے انتظار کیا' شاید پہاڑ رک جائے گا۔ انتظار اس لئے بھی کیا کہ زندگی میں پہلی بار پتا چلا' پیار کتنا ہی وزنی ہو' جھ نہیں لگتا' اور وہ پیار ایسا تھا کہ مدہوشی میں پڑا رہ گیا تھا۔

وہ اسی حالت میں ساری زندگی گزار سکتی تھی لیکن تہذیب اور شرافت' شرم و حیا ی کچھ سمجھاتی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے بوجھ کو ہٹایا۔ وہ بستر پر لڑھک کر چاروں

شانے چت ہوگیا۔ وہ فوراً اٹھ کر لباس درست کرتی ہوئی دور چلی گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جذبات اس کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے سے باہر آئی پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ دیکھتی تو پھر کھنچی چلی جاتی۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر چلی گئی۔

صبح ہوگئی۔ دھوپ کھڑکی سے گزرتی ہوئی مجاہد پر آئی تو آنکھ کھل گئی۔ وہ تیز روشنی اور دھوپ سے بچنے کے لئے اٹھ بیٹھا۔ سوچنے لگا۔ "میں نے پچھلی رات زیادہ پی لی تھی۔ مجھے نشہ ہوگیا تھا مگر ایسا لگتا ہے' جانی آیا تھا' میں نے اسے چیلنج کیا تھا۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک کر کھڑا ہوگیا۔ بستر کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "جانی نہیں وہ آئی تھی۔ لعنت ہے مجھ پر۔ میں نے جانی کو اپنے دماغ میں اتنا نقش کرلیا ہے کہ اس اجنبی حسینہ کو بھی جانی سمجھنے لگتا ہوں۔ یہ دشمن مجھے دماغی مریض بنا دے گا۔ اوہ خدایا' وہ آئی تھی۔"

وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم گھوم کر کوئی ایسی نشانی تلاش کرنے لگا جس سے اس کی آمد کا ثبوت مل سکے۔ مگر کوئی ایسی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ عقل کہہ رہی تھی ایک جوان لڑکی رات کو تنہا کیسے آئے گی؟ کس رشتے سے آئے گی؟ ان سوالات کا ایک بھی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ باتھ روم میں آگیا۔ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ شاور کے نیچے ٹھنڈے پانی سے دماغ ہلکا ہونے لگا۔ نیند اور نشے کی کیفیت ڈھلنے لگی۔ اب اسے صاف طور سے سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ اجنبی حسینہ پچھلی رات آئی تھی' جیسے بھی آئی ہو جس رشتے سے بھی آئی ہو۔ مگر آئی تھی۔

اس یقین سے بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے غسل سے فارغ ہوکر لباس پہنا۔ آئینے کے سامنے کنگھی کی۔ جرابیں اور جوتے پہنے پھر ناشتا کئے بغیر کار میں بیٹھ کر اسی شاپنگ سینٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں تھا۔ ایک امید تھی کہ وہ پھر کچھ خریدنے ادھر آسکتی ہے۔

وہ ایک گھنٹے تک اسٹیئرنگ سیٹ پہ بیٹھا شاپنگ سینٹر کے سامنے سے گزرنے والی

لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر قریبی ہوٹل میں آکر کچھ کھانے پینے لگا۔ وہ وہاں سے بھی شاپنگ سینٹر پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ناشتے اور چائے کا بل ادا کرتے وقت وہ نظر آگئی۔ وہ اچھلتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ دوڑتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا پھر سڑک پار کرنے لگا۔ ایک گاڑی نے اچانک ہی بریک لگائے۔ وہ حادثے سے بال بال بچا۔ گاڑی والے نے گالیاں دیں۔ مگر وہ اس کی کوئی آواز نہیں سن رہا تھا' اسے تو حسینہ کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دیوانہ وار اس کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اسی دکان کے اسی کاؤنٹر سے پرفیوم خریدنے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ پھر بولی۔ "تم؟ کیا آج بھی مجھے پرفیوم خریدنے نہیں دوگے؟"

وہ بولا۔ "میری ایک مشکل آسان کردو۔ میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔"

"کل الجھن میں تھے کہ میں کسی کی ہم شکل ہوں' آج کون سی الجھن ہے؟"

"کل رات تم میرے گھر آئی تھیں؟"

"اچھا تو مجھے خواب میں دیکھنے لگے ہو' یہ لفٹ لینے کا پرانا انداز ہے۔"

"بخدا میں نے خواب میں نہیں جاگتی ہوئی آنکھوں سے تمہیں اپنے کمرے میں دیکھا تھا۔"

"تمہیں ایسی باتیں کرتے شرم آنی چاہئے۔ کوئی سنے گا تو میرے بارے میں کیا سوچے گا؟"

"خدا کی قسم میں تمہیں غلط نہیں سمجھتا اور نہ ہی تمہیں بدنام کرنا چاہتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' مجھے کیا ہوگیا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ چلوگی؟"

"کہاں؟"

"اس سینٹر کے پیچھے ایک پارک ہے۔ وہاں لوگ بھی ہوں گے اور کسی درخت کے سائے میں تنہائی بھی ہوگی۔ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں' تمہیں ناگوار گزرے تو چلی جانا۔"

وہ بولی۔ "معلوم ہوتا ہے' تم آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑوگے' چلو۔"

وہ دکان سے باہر آئے۔ خاموشی سے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک تنگ گلی سے

گزرتے ہوئے سینٹر کے پیچھے ایک پارک میں آ گئے۔ پھر ایک درخت کے سائے میں پہنچ کر وہ بولی۔ "فرمائیے۔"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "عجیب آدمی ہو۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو تو میں کیا کروں؟ اپنے ماں باپ سے کہو' سسرال والوں سے التجا کرو۔"

"میں.........میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو' برا نہ ماننا۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو' کیسا مزاج رکھتی ہو۔ میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ میری دیوانگی کو یوں سمجھو کہ میں نے جاگتی ہوئی آنکھوں سے پچھلی رات تمہیں اپنے کمرے میں دیکھا ہے۔ تم شادی سے انکار کرو گی تو میں ہر رات خود کو شراب میں ڈبوتا رہوں گا اور تمہیں اپنی سانسوں کے قریب دیکھتا رہوں گا' یوں رفتہ رفتہ دماغی مریض بن جاؤں گا۔

"تم شراب پیتے ہو؟"

"ہاں' مگر میں برا آدمی نہیں ہوں' تم کہو گی تو میں کبھی بوتل کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ گھر میں جتنی بوتلیں ہیں سب کو توڑ دوں گا۔"

"میں کل سے دیکھ رہی ہوں' تم بڑی شدت سے مجھ میں دلچسپی لے رہے ہو۔ مگر میں اتنی جلدی تم پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔"

"بھروسا کرنے کے لئے پکے کاغذ پر کچھ بھی لکھوا لو۔"

"تم پکے کاغذ پر میرے نام دولت اور جائیداد لکھ سکتے ہو۔ میرا مستقبل محفوظ کرنے کا معاہدہ کر سکتے ہو۔ مگر محبت معاہدوں سے نہیں ہوتی۔ دل سے ہوتی ہے اور دل سے دل ملنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔"

"جتنا بھی وقت لگے۔ میں قیامت تک انتظار کروں گا۔ بس مجھ سے ملتی رہا کرو۔ میری نگاہوں کے سامنے رہو گی تو تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتا رہوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تم سچ مچ دیوانے ہو۔"

"کل تم نے تحفہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا' آج قبول کر لو۔ میں اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں لئے گھوم رہا ہوں۔"

اس نے بٹن کھول کر کوٹ کا ایک حصہ تھام کر اسے ذرا ہٹایا' جیب میں ہاتھ ڈال کر پرفیوم کی شیشی نکالی۔ جینا یکبارگی سہم کر چیخ مارتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ مجاہد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ کوٹ کی طرف انگلی اٹھاتی ہوئی بولی۔ "قاتل' تمہارے کوٹ کے اندر کوئی قاتل چھپا ہوا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو' بھلا کوئی کوٹ کے اندر چھپ سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟ جب بغل میں چھری ہو سکتی ہے اور آستین کے اندر سانپ ہو سکتے ہیں تو لباس کے اندر قاتل بھی چھپ سکتا ہے۔"

اس نے کوٹ کے اس حصے کو پھر ہٹا کر دکھایا اور کہا۔ "بدگمانی دور کرو۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "ایک شخص ہاتھ میں ریوالور لیے ہوئے ہے' مجھے صاف طور سے نظر آ رہا ہے۔"

اس نے کوٹ اتار کر کہا۔ "اب نظر نہیں آئے گا۔ یہ دیکھو۔"

جینا نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ ایک لائٹر سلگا کر اس کوٹ کو آگ لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "جو چیز تمہیں مجھ سے خوفزدہ کرے گی یا مجھ سے دور کرے گی' میں اسے جلا کر یا توڑ پھوڑ کر فنا کر دوں گا۔"

جلتا ہوا کوٹ ظاہر کر رہا تھا کہ مجاہد کتنی شدت سے اسے چاہتا ہے اور مجاہد جلتے ہوئے کوٹ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ "اس حسینہ نے کوٹ کے اندر کسی قاتل کو کیسے دیکھا؟ جبکہ وہ قاتل میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ جانی کو قتل کرنے والا ہے لیکن اس نے کیسے دیکھ لیا؟ کیا ایسے ہی دیکھا جیسے میں نے پچھلی رات اسے اپنے کمرے میں دیکھا تھا جب کہ یہ موجود نہیں تھی۔"

اس نے جینا سے کہا۔ "جب ہم کسی کے بارے میں شدت سے سوچتے ہیں تو وہ ہستی ہمارے سامنے اپنے سچے وجود کے ساتھ چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے جیسے پچھلی رات میں نے تمہیں اپنے کمرے میں دیکھا۔ کیا تم بھی کسی قاتل سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو۔

کیا وہ تمہیں سوتے جاگتے نظر آتا ہے‘ جیسے ابھی میرے کوٹ کے اندر نظر آرہا تھا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”ہاں‘ میں خوف زدہ ہوں۔“

”کس سے؟“

”میں اسے نہیں جانتی۔ اس شہر میں ایک شخص ایسا ہے جو اپنے لباس میں ریوالور یا چاقو چھپائے رکھتا ہے۔“

”کیا وہ تمہیں جانتا ہے؟“

”وہ مجھے نہیں جانتا۔“

”یہ کیسی دشمنی ہے‘ نہ تم اسے جانتی ہو نہ وہ تمہیں جانتا ہے۔“

”میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ بنگلہ دیش سے آئی ہوں۔ میری امی نے یہاں سے خط لکھا تھا کہ مجھے ڈھاکہ میں رہنا چاہئے‘ یہاں جان کا خطرہ ہے۔ ایک شخص میرے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔“

”تمہارے بھائی کا نام کیا ہے؟“

”جانی۔“

مجاہد کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم جانی کی بہن ہو اور جانی تمہارا بھائی۔ اب یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی کہ تم جانی کی ہم شکل کیوں ہو؟ اب تم کسی حیل وحجت کے بغیر فوراً بتاؤ‘ جانی کہاں ہے؟“

”یہی مجھے معلوم ہوتا تو میں اس شہر میں تنہا کیوں بھٹکتی؟ ہاں‘ مجھے یاد آیا کل تم نے مجھے کسی لڑکے کا ہم شکل کہا تھا‘ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ تم نے جانی کو پہلے کہیں دیکھا ہوگا۔“

”صرف دیکھا نہیں اچھی طرح اسے سمجھا بھی ہے۔ وہ مکار اور چالباز ہے۔ اسی نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔“

جینا سہم کر پیچھے ہٹ گئی پھر بولی۔ ”کیا تم وہی ہو؟ کیا تم ہی میرے بھائی کو قتل کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں‘ میں وہی ہوں اور اچھی طرح سمجھ گیا ہوں‘ تم مجھے اپنے حسن وشباب کے

جال میں پھانس کر اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہو۔ مگر وہ نہیں بچے گا‘ اس کی موت میرے ہاتھوں سے ہوگی۔“

”تم بکواس کرتے ہو۔ میں تمہارے جیسے بے رحم آدمی کو منہ لگانا پسند نہیں کروں گی اور تمہیں خوش فہمی ہے کہ میں تمہیں پھانس رہی ہوں۔“

”تم اس شہر میں کیا کرتی پھر رہی ہو‘ یہ تھانے میں معلوم ہوگا۔ پولیس والوں کو بھی تمہارے بھائی کی تلاش ہے۔ تم انہیں بتاؤ گی کہ وہ تمہاری ماں کے ساتھ کہاں چھپا ہوا ہے۔“

”میں ضرور تھانے چلوں گی۔ ہوسکتا ہے‘ پولیس کی مدد سے میں اپنی ماں اور بھائی تک پہنچ جاؤں۔“

وہ دونوں تھانے پہنچے تو نیا انکشاف ہوا۔ دو دن پہلے ایک بنگلے میں ڈاکٹر ذاکر اور فرزانہ بیگم کی لاشیں ملی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹر کی لاش اس کے رشتے دار لے گئے تھے۔ فرزانہ کی لاش اس کے رشتے داروں کے انتظار میں مُردہ خانے میں پڑی ہوئی تھی۔ جینا نے وہاں پہنچ کر ماں کی لاش دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ جدا ہوتے ہی ماں اپنی جان پر کھیل جائے گی تو وہ اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتی۔ فرزانہ بیگم کی آخری تحریر کی ایک نقل جینا اور ایک مجاہد کو دی گئی۔ جینا نے اسے پڑھ کر مجاہد سے کہا۔ ”اسے پڑھو اور تمہارے پاس عقل ہو تو سمجھو‘ میرے بھائی نے ماں کی عزت بچانے کے لئے قتل کیا تھا۔ تم اسی عیاش مقتول کے بیٹے ہو اور اس کے باوجود امی نے اپنی تمام دولت اور جائیداد تمہارے نام کردی ہے۔“

مجاہد نے اس آخری تحریر کو پھاڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں دولت اور جائیداد سے اپنے باپ کو واپس لاسکتا ہوں۔ مجھے دولت نہیں جانی چاہئے۔ میرے انتقام کی آگ اس کے لہو سے بجھے گی۔“

وہ غصے میں طنطناتا ہوا چلا گیا۔ جینا اس کے متعلق جذباتی انداز میں سوچ نہ سکی۔ ماں کی موت کا صدمہ بھاری تھا۔ وہ اس کی آخری رسومات کی ادائیگی میں مصروف ہوگئی۔ اس نے تھانے میں ایک گرلز ہوسٹل کا پتہ لکھوایا تھا۔ مجاہد نے وہاں جاکر معلوم کیا تو پتا

چلا' جینا نے پچھلے تین دن سے وہاں رہائش اختیار کی تھی۔ اس نے تھانے میں بیان دیا تھا کہ وہ تین دن پہلے بنگلہ دیش سے آئی تھی اور اپنا پاسپورٹ جلا دیا تھا۔ وہاں سے آنے والے اکثر لوگ پاکستان کے شہری بننے کے لئے بنگلہ دیش کا پاسپورٹ ضائع کر دیتے تھے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ تھانے کے انسپکٹر نے جینا کو بھی نظرانداز کر دیا تھا۔

اس طرح فرزانہ بیگم کا سابقہ بیان درست نکلا کہ اس کی ایک لڑکی اپنے ماموں کے پاس ڈھاکہ میں ہے اور وہ جلد ہی پاکستان آنے والی ہے۔ ایسی ہیرا پھیری کے باعث جینا پیدائشی لڑکی تسلیم کر لی گئی۔

مجاہد ایک دشمن کے انداز میں جینا سے رخصت ہوا تھا لیکن رات کو پیتے وقت جیسے جیسے نشہ چڑھتا گیا' ویسے ویسے قاتل کی بہن اس کے حواس پر غالب آتی گئی۔ وہ بڑبڑاتا رہا۔ اپنی خالی کوٹھی میں کبھی اسے چڑیل' جادوگرنی کہتا رہا' کبھی محبت سے پکارتا رہا۔ دوسری صبح پھر نارمل ہو گیا۔

جب اسی طرح راتیں گزرنے لگیں تو اس نے اپنا تجزیہ کیا۔ وہ ہر صبح نارمل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جینا کو نظرانداز کرنے اور اسے دل سے نوچ کر نکال پھینکنے کے لئے خود کو نارمل بنانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا۔

اس نے سوچا اگر یہی سلسلہ رہا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس نے پہلی فرصت میں تسلیم کیا کہ جینا اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑ رہی ہے۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسے کوئی ایسی راہ اختیار کرنا چاہئے کہ جینا کی محبت بھی ملے اور موقع ملنے پر وہ جانی کو قتل بھی کر سکے۔

ایسا محض مکاری سے کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی تدبیر سوچنے لگا۔ ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ جینا چالیس دن تک ماں کا سوگ منا رہی تھی۔ اس نے اطمینان سے منصوبہ بنایا۔ لاہور سے فرزانہ بیگم کا وکیل آیا تھا' اس نے مجاہد سے ملاقات کی۔ مجاہد ٹھیک چالیس دن بعد وکیل کے ساتھ جینا کے پاس پہنچا۔ وہ ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن وکیل کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مجاہد کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر مجاہد کا دل بے

بو ہو رہا تھا۔

دل تو ادھر بھی قابو میں نہیں تھا مگر وہ بظاہر خشک لہجے میں بولی۔ "میں ہر طرح سے باد ہو گئی۔ اب کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہاری بربادی نہیں چاہتا۔ اس لئے دو شرائط پر جانی کو معاف کر سکتا ہوں اور پچلی دشمنی ختم کر سکتا ہوں۔"

"میں اپنے بھائی کی سلامتی کے لئے تمہاری ہر شرط مان لوں گی۔"

"شرط یہ ہے کہ تمہاری امی کی وصیت کے مطابق تمام دولت اور جائیداد وصول رکے تمہیں دوں گا اور تم لینے سے انکار نہیں کرو گی۔"

جینا نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "دوسری شرط یہ ہے کہ پچھلی دشمنی ختم رنے اور نئی دوستی مستحکم بنانے کے لئے ہم ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ اسے بردستی نہیں' التجا سمجھو۔"

جینا نے جلدی سے سر کے آنچل کو گھونگھٹ بنا لیا۔

☆=======☆=======☆

وہ جس رات مجاہد کی دلہن بن کر اس کے بیڈ روم میں آئی' اسی رات پیار و محبت میں سرشار ہو کر مجازی خدا کو اپنی حقیقت بتا دینا چاہتی تھی لیکن ایسی نادانی سے پہلے ہی ماں کی نصیحتیں یاد آگئیں' ماں نے سمجھایا تھا۔ "کوئی بات کہنے یا کوئی کام کرنے کی جلدی نہ کیا کرو۔ اچھی طرح سوچو سمجھو' حالات کا جائزہ لو۔ عورت کو خصوصاً اپنے شوہر سے محتاط رہنا چاہئے۔ ازدواجی زندگی کی ابتدا میں وہ سحر پھونکتا ہے۔ اتنی محبت دیتا ہے کہ عورت دیوانی ہو جاتی ہے۔ جو بات نہیں کہنا ہو وہ بھی کہہ دیتی ہے' اپنی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ پھر جب وہ پرانی ہونے لگتی ہے تو مرد اس سے بیزار ہونے لگتا ہے تو دوسری لانے کے لئے بیوی کی اسی کمزوری کا طعنہ دیتا ہے۔

جینا نے سوچا۔ "لڑکے سے لڑکی بننا کوئی عیب کی بات نہیں ہے لیکن لڑکی بننے کے عمل میں کوئی نقص رہ گیا ہو کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجاہد طعنے دے گا۔ مجھے مکمل عورت تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ شاید میری سوکن لے آئے گا۔ نہیں' میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ کچھ عرصے انتظار کروں گی' جب ہر پہلو سے وہ مطمئن ہوتا رہے گا' مجھے عورت تسلیم کرتا رہے گا تو میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر اسے اپنی حقیقت بتا دوں گی۔

اس نے بات چھپالی۔ نادانستگی میں ہی سہی کچھ عرصے کے لئے خود کو قتل ہونے سے بچالیا۔ مجاہد کی محبت اور دیوانگی میں اس کے دن رات گزرنے لگے۔ وہ پہلے پہل اس کی محبت سے تھک ہار کر گہری نیند سو جاتی تھی۔ ایک رات اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا' مجاہد اس سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اس نے زیرو پاور کی مدھم روشنی میں کروٹ بدل کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ وہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ "نہیں چھوڑوں گا۔ جانی تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا............"

جینا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ محبت سے فریب کھا رہی تھی۔ مجاہد نیند میں اٹک اٹک کر اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ جتنا اس نے سن لیا تھا آئندہ ہوشیار رہنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ ماں زندہ نہیں تھی لیکن اس کی زندہ نصیحتوں نے بیٹی کی جان بچالی تھی۔

ہائے کس سنگدل سے دل لگایا تھا۔ اس سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ جینا تھا' اسی کے ساتھ مرنا تھا۔ وہ محبت سے جان مانگتا تو خوشی سے جان دے دیتی۔ مگر نفرت اور دشمنی کے حوالے سے حرام موت مرنا نہیں چاہتی تھی۔

ایک شام مجاہد گھر آیا تو اسے جینا کا رقعہ ملا۔ اس نے لکھا تھا۔ "میری طبیعت کچھ خراب ہے میں اسپتال جا رہی ہوں' جلد ہی واپس آجاؤں گی۔"

اس نے اسپتال کا نام لکھا تھا۔ مجاہد نے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کیا۔ کار میں بیٹھ کر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔ وہ پرائیوٹ اسپتال تھا۔ تمام ڈاکٹر شام کو آیا کرتے تھے۔ وہ مسز جینا مجاہد کے متعلق پوچھتا ہوا ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "فرمائیے کیا شکایت ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں مریض نہیں ہوں۔ اپنی وائف مسز جینا مجاہد کے متعلق پوچھنے آیا ہوں۔ کیا وہ یہاں آئی تھیں؟"

ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "وائف؟ کیا تم جانی کے شوہر ہو؟"

مجاہد نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا آپ کسی جانی کو جانتے ہیں؟ مگر۔ مگر آپ مجھے جانی کا شوہر کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"ابھی تم نے ہی جینا کو وائف کہا تھا۔ کیا تم نہیں جانتے یہی جینا پہلے جانی تھی۔"

"جانی تھی؟ کیا یہ میڈیکل کیس ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جانی کی جنس تبدیل ہوئی اور وہ جینا بن گئی؟"

"بے شک یہی بات ہے۔ میں سمجھ گیا' جانی نے یعنی موجودہ جینا نے اپنی حقیقت چھپائی ہے۔ میں نہیں سمجھتا اس میں چھپانے شرمانے کی کیا بات ہے۔ جب وہ یہاں آئی اور میں نے اسے پہچان لیا تو وہ گھبرا گئی اور کچھ کہے سنے بغیر چلی گئی۔"

"کیا اس کا علاج آپ نے کیا تھا؟"

"نہیں۔ ڈاکٹر ذاکر میرا دوست تھا۔ میرے تجربات کو افضل سمجھتا تھا اور پیچیدہ کیس میں مجھ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اس نے بتایا ایک لڑکا تبدیلی کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ میں ایک بار اس کا معائنہ کروں۔ لڑکے کی ماں اس سلسلے میں رازداری چاہتی تھی۔ اس لئے میں ڈاکٹر ذاکر کے ساتھ ایک بنگلے میں گیا' وہیں میں نے جانی کا معائنہ کیا تھا اور ڈاکٹر ذاکر کو چند اہم مشورے دیئے تھے۔"

"ڈاکٹر! اس کی تبدیلی جنس کا ریکارڈ ضرور ہوگا۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ ڈاکٹر ذاکر نے بڑی رازداری سے اس کا علاج کیا تھا۔ تم ریکارڈ دیکھ کر کیا کرو گے؟"

"میں ثبوت چاہتا ہوں۔"

"ثبوت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی الٹے پاؤں بھاگ گئی۔ جب میں نے اس کا معائنہ کیا تو وہ تقریباً تبدیل ہو چکی تھی۔ دو چار روز میں اس کا آپریشن لازمی ہو گیا تھا۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈاکٹر کے چیمبر سے نکلا۔ اس کے دماغ میں آندھی چلنے لگی تھی۔ اس کے باپ کا قاتل' شریکِ حیات بن کر اسے اُلّو بنا رہا تھا۔ وہ اسپتال سے باہر آیا۔ کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ اسے جینا کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ وہی پرفیوم کیوں استعمال کرتی تھی جو جانی استعمال کرتا آ رہا تھا۔ جینا نے یہ کیوں کہا تھا کہ اس کے کوٹ کے اندر قاتل چھپا ہوا ہے۔

اس نے ایک جھٹکے سے کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روکی۔ کار سے نکل کر دوڑتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ کھلا ہوا دروازہ بتا رہا تھا کہ جینا واپس آ گئی ہے۔ اس نے بیڈ روم میں آ کر دیکھا۔ وہ سنگار میز کے سامنے سنور رہی تھی۔ اسی پرفیوم کو اپنے لباس پر اسپرے کرنے جا رہی تھی۔ آہٹ سن کر پلٹ گئی۔ مسکرا کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کے تیور دیکھ کر چپ ہو گئی۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسے درندے کی طرح دیکھتا ہوا قریب آیا پھر دانت پیستے ہوئے پوچھا۔ "ڈاکٹر پرویز کے چیمبر سے بھاگ کر کیوں آ گئیں؟"

وہ گھبرا گئی۔ سہم کر بولی۔ "بس یونہی۔ میں نے سوچا مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔"

اچانک اس نے جینا کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "جانی! کیا تم ڈاکٹر پرویز کا سامنا کرو گے؟ بولو سامنا کرو گے؟"

وہ تکلیف سے چیختے ہوئے بولی۔ "آہ مجاہد! تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ میرے بال چھوڑ دو۔"

اس نے بالوں کو چھوڑ کر ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا۔ وہ کراہتی ہوئی سنگار میز پر آئی۔ آئینے سے ٹکرا کر بولی۔ "رک جاؤ مجاہد! تم میری محبت کی قسم کھاتے رہے ہو۔"

"اس سے پہلے میں نے باپ کی لاش کے سرہانے قسم کھائی تھی کہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے ڈھونڈ کر قتل کروں گا۔ تُو نے چھپنے کے لئے بڑے کامیاب منصوبے بنائے لیکن موت تجھے میرے پاس لے ہی آئی ہے۔"

وہ اسے لات گھونسے مارتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ "میں شراب کے ہر گھونٹ کے ساتھ سوچتا تھا' تجھے قتل کرنے سے پہلے تڑپاؤں گا اور اس بری طرح مارتا رہوں گا کہ کبھی تقدیر نے بھی تجھے نہیں مارا ہوگا۔"

وہ اسے مارتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ جینا زخمی ہوتی جا رہی تھی۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور محبت کا واسطہ دیتی جا رہی تھی۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو الماری کے پاس گیا۔ اسے کھول کر ایک ریوالور نکالا پھر اس کے چیمبر کو لوڈ کرنے لگا۔

جینا زخموں سے چُور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ سکتے کی حالت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے نشانہ لیا تو وہ بولی۔ "بے شک مار ڈالو۔ مگر ایک آخری خواہش پوری کر دو۔"

وہ غصے سے بولا۔ "جلدی بول بہروپیے! کیا چاہتا ہے؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ "گولی سینے پر مارنا' پیٹ پر نہیں.........." وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "یہاں تمہارا بچہ ہے۔"

ریوالور پر بے اختیار گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "یہ سیدھا سادا لہو کا حساب ہے۔ میں نے تمہارے باپ کا خون کیا لیکن خون کو رائیگاں جانے نہیں دیا۔ اُس خون سے تم ہو اور تمہارے خون سے یہ بچہ ہے۔ انسان مرتا ہے' لہو نہیں مرتا۔ حساب کرو' خون کے حساب سے تمہارا باپ زندہ ہے میرے پیٹ میں.........."

ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ جینا اس کے سامنے بہت بڑا سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ سوال تھا' کیا وہ اپنے خون کا خون کر سکتا ہے؟

☆======☆======☆

کلمۂ شہادت

اس دیس کی کہانی جہاں آگ وخون کی بارش ہوتی ہے،
آکسیجن کی جگہ بارود کا دھواں ہوتا ہے، جہاں وقت پڑنے پر
عورتیں بھی سروں پر کفن باندھ لیتی ہیں۔
لہولہو وادیِ کشمیر کی دلخراش داستان

میں ایک مصنف ہوں۔ ایک مصنف ہونے کے ناطے اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میرے قدر دان بہت ہیں اور یہی قدر دان میرے مخبر بھی ہیں۔ مجھے کہانیوں کے کردار بتاتے ہیں' واقعات سناتے ہیں۔ میں اپنے قدر دانوں سے صرف اپنا تعارف کرواتا ہوں اور بس۔ میرے تعارف کے جواب میں وہ کہتے ہیں۔ "بھئی آپ کمال کا لکھتے ہیں۔ آپ کے لئے میرے پاس ایک زبردست قسم کی کہانی ہے۔ جناب! مجھے یقین ہے اگر آپ میری کہانی کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر شائع کروائیں گے تو آپ کی واہ واہ ہوجائے گی۔ ادھر آپ کی کہانی لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے گی اور ادھر آپ کی شہرت آسمان کی بلندیوں پر۔"

اور میں جواباً مسکرا کر رہ جاتا ہوں کیونکہ میں یہی چاہتا ہوں۔

کہانیوں کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہوتی ہے۔ بعض پڑھنے والوں کے خیال میں "کہانی" ایک ایسا جھوٹ ہوتی ہے جسے مصنف بڑی خوبصورتی سے سچ کا لباس پہنا کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ سب خوابوں اور خیالوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جس دنیا میں مصنف خود رہنے کا عادی ہوتا ہے' دوسروں کو بھی اسی دنیا کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی ہی دنیا کی باتیں لکھتا ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والے اگر کہانیوں کو صرف ظاہری بصارت سے نہ پڑھیں بلکہ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھیں تو ہر کہانی زہریلے نشتر کی طرح بار بار ان کے دل و دماغ کو زخمی کرے گی۔ ضمیر کو جھنجوڑتی ہوئی محسوس ہوگی۔

میری زیر نظر کہانی ایک سچ بیانی ہے اور یہ بھی میرے ایک قدر دان کے فراہم کردہ ثبوت پر مبنی ہے۔ یوں کہیں کہ میرے ایک مخبر نے ایک سچائی کو بے نقاب کرنے

لئے' ہمارے اندر سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کے لئے ثبوت مہیا کئے ہیں۔ ایک ایسا مخبر جس کے جسم پر سرکاری وردی تھی۔ وہ وردی پہننے کے بعد صرف "یس" اور "نو" کہنے کا پابند تھا لیکن اس کے ضمیر پر کسی قسم کی وردی نہیں تھی۔ وہ انسانیت کے ناطے وردی کو آزادی کا پرچم بنا لیتا تھا۔ اس زندہ ضمیر عظیم شخصیت کا نام تھا سپاہی حضور بخش کشمیری۔

☆======☆=======☆

یہی کوئی چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ دن کا درجہ حرارت کافی حد تک بلند ہو چکا تھا۔ گرمی کی شدت تھی یا ٹریفک کے دھوئیں کی زیادتی کہ گھر سے آفس پہنچنے تک میرے سر میں شدید درد ہونے لگا۔ ظاہر ہے ایسے وقت لکھنا میرے لئے وبال جان بن جاتا ہے' دل یہی کرتا ہے کہ تکیے پر سر رکھ کر سو جاؤں۔ سرکاری ملازموں کی طرح سونے کے لئے میری کرسی کے سامنے بھی ایک میز تھی لیکن وہ نہیں تھی جس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ میں نے آفس بوائے کو آواز دی۔ "بھئی حمید! یہ آج بجلی کہاں چلی گئی ہے؟"

اس نے کہا۔ "بس جی! آپ کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے گئی ہے۔ میں ابھی نیچے گیا تھا تو لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ کہیں دور ایک بڑا سا درخت تاروں پر گرا ہے۔ اس لئے اردگرد کے تمام علاقوں کی بھی بجلی بند کر دی گئی ہے۔"

"پھر بجلی کب تک آنے کا امکان ہے؟"

"وہ جی! ابھی درخت کی کٹائی چھٹائی شروع ہوئی ہے۔ یہی کوئی بیس پچیس گھنٹے میں بجلی بحال ہونے کا امکان ہے۔"

"اوہ۔ مائی گاڈ!"

میں ایک دم سے اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ کل آنے سے پہلے فون کر کے معلوم کر لوں گا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے محکمے والے جو کام چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اسے اڑتالیس گھنٹے میں کرتے ہیں۔"

میری بات پر وہ "جی جی" کہہ کر رہ گیا اور میں اپنے آفس والی عمارت سے اتر کر بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کی شدت کے باعث ٹریفک میں بھی کافی حد تک کمی آ گئی تھی۔ بس اڈے پر مسافروں کا ہجوم تھا' شاید وہ سب میری طرح

بجلی سے مایوس ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ ایک بس آئی۔ اس میں پہلے ہی اتنا رش تھا کہ تل دھرنے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے طور پر اندازہ لگا لیا کہ جس طرح میں خالی بس کا انتظار کرتا رہتا ہوں' وہ مغرب کی اذان تک نہیں آسکتی۔ اس لئے وہاں سے صدر تک پیدل جانا ہی بہتر ہے۔ یوں بھی وہاں سے صدر تقریباً پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ سو میں پیدل ہی چل پڑا۔

بس اسٹاپ پر کھڑے رہنے سے بدن اور سر دھوپ کی تپش سے جل رہا تھا۔ چلنے سے گرمی کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہونے لگی۔ میں آرٹس کونسل کے پاس سے سیدھا لکی اسٹار والی سڑک پر جانے لگا۔ تھوڑی دور آگے جا کر ایک سڑک پاسپورٹ آفس کی طرف بائیں مڑتی ہے۔ موڑ کے پاس ہی پیچھے سے ایک موٹر سائیکل سوار تیزی سے آکر میرے سامنے رک گیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ تھا۔ اس میں سے میری آنکھیں کسی کو نظر نہیں آسکتی تھیں لیکن میں کسی کو بھی باآسانی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنے والے شخص کو دیکھا' وہ اچھا خاصا صحت مند نوجوان تھا۔ قد میں بھی مجھ سے پانچ چھ انچ اونچا ہی ہو گا۔ چہرے پر دہشت گردوں جیسی داڑھی تھی۔ اسی داڑھی کی وجہ سے میں کچھ سہم سا گیا۔ اس شہر کے حالات کا تقاضا یہی تھا' جس طرح دہشت گرد راہ چلتے لوگوں پر گولیاں برساتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور کسی کو اکیلا پا کر لوٹ لیتے ہیں۔ اگر ٹارگٹ بنانے والے سے کچھ حاصل نہ ہو تو قتل کر دیتے ہیں تو ایسی صورت میں میرا سہم جانا ایک فطری امر تھا۔ اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ”یقیناً آپ شکیل احمد ہیں؟“

اس کے منہ سے اتنے اعتماد سے اپنا نام سن کر یہ خیال آیا کہ ایک دہشت گرد میرے مکمل کوائف معلوم کرنے کے بعد ہی سزائے موت کے فیصلے پر عمل کرنے آیا ہے۔ اس کے اعتماد کے پیش نظر میں شکیل احمد ہونے سے انکار نہیں کر سکتا تھا پھر یہ کہ جب موت سر پر کھڑی ہو تو قدرتی طور پر زبان سچ بولنے لگتی ہے۔ اس خیال سے کہ مرتے وقت بھی جھوٹ بولیں گے تو روزِ حساب بخشش نہیں ہو گی۔ میں نے کہا۔

”جی.......... جی ہاں۔“

اس نے جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ بیگ میں ڈال دیا۔ میں اسے دیکھنے کے ساتھ

ساتھ اِدھر اُدھر بھی نظریں دوڑانے لگا اور دل ہی دل میں یہ دعا مانگنے لگا کہ اس طرف کوئی پولیس موبائل نکل آئے اور یہ دہشت گرد مجھے چھوڑ کر اپنی جان بچانے پر مجبور ہو جائے لیکن پولیس کا ایک سپاہی بھی ادھر نہیں آیا۔

اس نے بیگ سے اپنا ہاتھ باہر نکالا' اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے آفس گیا تھا' پتا چلا آپ ابھی نکلے ہیں۔ یہ میرے ایک دوست کی امانت آپ کے نام ہے۔ میں یہ بارا مولا سے لے کر آیا ہوں۔“

بارا مولا کا نام سنتے ہی میں چونک گیا۔ یہ کشمیر کے ایک علاقے کا نام ہے۔ جہاں آج کل دشمنوں نے ہاہا کار مچا رکھی ہے۔ ظلم و بربریت کا ایسا بازار گرم کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ جس روز یہ لاوا پھٹ پڑا اس روز نہ ہی دشمن رہیں گے اور نہ ہی ان کی شیطانیت' سب کے سب اس گرم لاوے کے ساتھ پگھل پگھل کر بہتے چلے جائیں گے۔

مذہبی اور جذباتی لگاؤ اپنی جگہ تھا مگر جو کچھ آنکھیں روز و شب دیکھ رہی تھیں اس سے بھی انکار ناممکن تھا۔ آنے والے کا حلیہ مشکوک تھا۔ وہ میرے اس جذباتی لگاؤ کے ذریعے مجھے یا میرے ملک کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا' اس لئے میں نے کچھ پوچھنے اور کہنے سے پہلے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار دیا۔ تاکہ ایک محب وطن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے کا موقع فراہم کروں۔ میرا چشمہ اترتے ہی اس نے سب سے پہلے میری آنکھوں میں جھانک لیا' جو سوال زبان پوچھنا چاہتی تھی اسے پڑھ لیا اور کہا۔ ”اس وقت کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا' ذرا جلدی میں ہوں۔ ابھی اور بھی بہت سے کام نمٹانے ہیں پھر واپس سری نگر جانا ہے۔ آپ اس میں جو مواد ہے اسے پڑھ لیجئے گا' دیکھ لیجئے گا میں آج سے تیسرے روز جانے سے پہلے آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ آپ بے فکر ہو کر اسے رکھ لیں۔ میں اب چلتا ہوں۔“

میرا پیشہ ایسا ہے کہ میں شک کئے بغیر رہ نہیں سکتا اور کسی سے مطمئن ہوئے بغیر چیز نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر تم چند لمحے رک کر حقیقت نہیں بتاؤ گے۔ اس

لفافے کو اپنے ہاتھ سے کھول کر نہیں دکھاؤ گے تو میں اسے سڑک پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جلدی سے بند پیکٹ کھول کر اس میں سے چند کاغذات' ایک ڈائری اور ایک آڈیو کیسٹ نکال کر دکھاتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔ باقی آپ گھر جاکر تفصیل سے دیکھ لیجئے گا۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آپ کو نقصان پہنچائے۔ فی امان اللہ۔"

پھر وہ آناً فاناً وہاں سے ہوا ہوگیا۔ میں نے ان چیزوں کو بڑی احتیاط سے لفافے میں رکھا اور صدر کی طرف چل پڑا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی غسل کیا پھر کھانا کھانے کے بعد ایک عدد پیناڈول کی گولی حلق سے نیچے اتاری اور سر تکیے پر ٹیک کر لیٹ گیا۔ کب میری آنکھ لگی مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ جب آنکھ کھلی رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ گھر کے تمام افراد گہری نیند سو چکے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ تخلیق کرنے کے لئے ایسے ہی سناٹے اور خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گہری خاموشی میں ہی الفاظ اور جملے تیزی سے دماغ میں اترتے ہیں۔

میں نے اُٹھ کر منہ دھویا' اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور ایک ڈبے سے پاپے نکال کر کھانے لگا۔ پیٹ کی آگ بجھی تو دماغ میں کچھ تازگی محسوس ہوئی۔ وہ باتیں یاد آنے لگیں جو دن میں میرے ساتھ پیش آئی تھیں۔ میں نے خاکی رنگ کا لفافہ اٹھایا اور اس میں سے وہ چیزیں نکالنے لگا جو بقول اس موٹر سائیکل والے کے کسی طرح کا ثبوت تھیں۔

ان میں چند خطوط تھے جو خوبصورت لیٹر ہیڈ کے صفحہ پر لکھے گئے تھے۔ ایک نیوی بلیو رنگ کی موٹی سی ڈائری تھی' ایک کیسٹ تھا اور ایک بند لفافہ تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "پہلے اسے کھول کر پڑھیں۔"

میں نے اسے کھول کر دیکھا' اس میں ایک خط تھا۔ جس کی شروعات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے تھی پھر میرا نام لکھا تھا۔

"برادر شکیل صاحب!

آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو! (آمین)

چند اہم ثبوت آپ کو روانہ کر رہا ہوں جو میں نے ایک بیوہ عورت کے گھر سے حاصل کئے تھے۔ یہ ثبوت وہ ہیں جو گزشتہ دنوں میں نے ایک فوجی سارجنٹ کی نگرانی میں چھاپے کے وقت حاصل کئے تھے اور ایک سپاہی دوست کی مدد سے جو میرے ساتھ بیوہ کے کمرے میں گیا تھا' چھپا لئے تھے۔ اس نے اس ثبوت کو چھپانے کی بات سن کر میری مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "تُو پاگل ہوگیا ہے۔ اگر سارجنٹ صاحب کو پتا چل گیا تو تیرے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "سردار سنگھ! ہم ایسے دوست ہیں کہ ایک کمرے میں ایک ساتھ رہتے' کھاتے اور سوتے ہیں۔ میں نے تجھے ایسی ایسی حقیقتیں بتائی ہیں کہ تُو نے نہ چاہتے ہوئے بھی سچائی کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جب سن سینتالیس کے ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے تو ہندوؤں نے اپنی زیادہ تر بندوقیں تم سکھوں کے کاندھوں پر رکھ کر چلائی تھیں۔ تم لوگوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔ تنہا کسی بھی سکھ کو دیکھ کر اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے تھے اور الزام مسلمانوں پر لگا دیتے تھے اور سکھ انتقام کی آگ میں اندھے ہو کر مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے۔ صوبہ پنجاب (موجودہ پاکستان) کے مسلمان انہی کی نسلوں کو جاگ جاگ کر بچا رہے تھے۔ انہیں تحفظ دے رہے تھے۔ ان کی بیٹی' بہن' بہو اور ماؤں کی عزتوں کو تحفظ پہنچا رہے تھے۔ انہیں مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر آنے والے ہندوؤں سے محفوظ رکھ رہے تھے۔ ورنہ لاہور شہر اور اردگرد کے علاقوں سے ایک بھی سکھ بچ کر صوبہ پنجاب ہندوستان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس نے کہا۔ "ہاں ہاں ویرا! مجھے یاد ہے۔ میرے بزرگوں نے بھی ایسی ہی باتوں کا ذکر کیا تھا اور اب بھی کرتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں نے کس طرح انہیں انتقام کی آگ سے محفوظ رکھا اور ہندوستان آنے میں ان کی مدد کی۔ سونہ وائے گرو دی! میں ہتھ جوڑ کر مسلمانوں کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔"

"تو پھر یہ کیوں نہیں سمجھ رہا ہے کہ آج تُو جس گھر میں کھڑا ہے یہ انہی عظمت والے مسلمانوں کی ایک بیٹی کا گھر ہے۔ ایک بیوہ کا گھر ہے۔ کیا تُو ایک پاک دامن عزت دار شریف بیوہ کی عزت کو داغ دار ہونے سے نہیں بچائے گا۔ کیا ایک محسن قوم کی بیٹی

کی شرم و حیا کا جنازہ نکال کر خوش ہو لے گا؟"

سردار نے کہا۔ "تو ایسا کرتے ہیں اسے جلا دیتے ہیں۔"

میں نے ناراضی سے کہا۔ "ثبوت جلا کر خود سارجنٹ کی نظروں میں آجائیں گے۔ ٹھیک کہتے ہیں گھڑی کی دونوں سوئیاں بارہ پر آتے ہی سکھوں کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔"

سردار نے جلدی سے دیوار پر لگی گھڑی دیکھی پھر شرمندہ سا ہو کر بولا۔ "تے فیر تُو ہی بتلا کیا کریں۔ میری عقل واقعی کام نہیں کر رہی ہے۔"

"اسے تُو اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کے اندر چھپالے۔"

"اوئے.......... یہ کیا کہہ رہا ہے اس طرح تو سارجنٹ مجھے گولی مار دے گا۔"

"شک کرے گا تو گولی مارے گا نا!"

"اس طرح تو' تُو بھی رکھ سکتا ہے۔"

"نہیں' میں کشمیری نہیں ہوں تو کیا ہوا۔ مسلمان ہوں۔ ویسے ہی سارجنٹ تھانے میں بھی مجھے ساتھ لانے پر جھک جھک کر رہا تھا۔ اگر نفری کم نہ ہوتی اور دوسرے کشیدگی والے علاقوں میں نہیں گئی ہوتی تو وہ مجھے کبھی ساتھ لے کر نہ آتا۔ وہ بہت متعصب ہے۔"

میری بات اس کے دل و دماغ میں سما گئی اور اس طرح یہ ثبوت سردار سنگھ کے ذریعے محفوظ ہو کر اب آپ تک پہنچ گئے ہیں۔

جس طرح ایٹمی فارمولا اگر محب وطن کے پاس ہو تو ملکی ترقی کا ضامن سمجھا جاتا ہے' اسی طرح یہ ثبوت بھی آپ کے پاس ہے۔ میں نے دشمن سارجنٹ سے یہ فارمولا بچا کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اسے اپنی تحریر سے ایسا پُر اثر بنائیں کہ سوئے ہوئے باضمیر لوگ ہڑبڑا کر جاگ اٹھیں۔ میں نے ثبوت پہنچانے میں جتنی جلدی کی ہے آپ اسے تحریر کی صورت میں پیش کرنے میں بھی جلدی کا مظاہرہ کریں۔ یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ کب پانی سر سے اونچا ہو جائے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اب اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ۔

آپ کا اپنا"

میں نے خط کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا لیکن اس کا نام کہیں بھی تحریر نہیں تھا۔ شاید اس نے مصلحتاً رازداری سے کام لیا تھا۔ میں نے اس خط کو تہہ کر کے لفافے میں رکھ دیا۔

خط کے بعد دوسری اہم چیز ڈائری تھی جس کے اندر نہ جانے کتنے انکشافات اور راز بند تھے۔ اسے کھول کر پڑھنے سے پہلے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر صحن میں آگیا۔ آسمان پر چمکنے والے چاند کو ایک ٹک دیکھنے لگا جس کے گرد سرخی مائل ہالہ بنا ہوا تھا۔ بزرگ کہتے ہیں جب چاند کے گرد ہالہ بنا ہو یا آسمان سرخ ہو رہا ہو تو یہ زبردست خون ریزی کی پیشگی اطلاع ہوتی ہے جو قدرت کی طرف سے زمین والوں کے لئے آگاہی ہوتی ہے۔ آسمان اس وقت بھی سرخ ہوا تھا جب پہلی جنگ عظیم واقع ہوئی۔ اس کے بعد ایسی ہی لالی دوسری جنگ عظیم سے پہلے زمین والوں کے سر پر منڈلائی اور اس کے بعد سے اب تک آتی اور جاتی رہتی ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے تو کچھ زیادہ ہی ہالے دکھائی دینے لگے ہیں۔ جس کا ثبوت سانحہ بنگلہ دیش' روس افغان جنگ' ایران عراق جنگ' بوسنیا اور کشمیر ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا جل رہی ہے اور دنیا کے ٹھیکے دار عیش و عشرت کی محفلوں میں مست ہیں۔ کبھی امن کا عالمی دن منایا جارہا ہے۔ ملکوں کی سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں مگر کسی کو پاس کھڑے مظلوم کی صدا نہیں سنائی دے رہی۔ تقریباً سینتالیس برسوں سے کشمیر کے مسلمان آزادی کے لئے چیخ رہے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب نے اپنے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال لیا ہے۔

میں سوچتا ہوا واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ڈائری کھول کر پڑھنے لگا۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا' مجاہدہ خدیجہ شیخ۔

مکان نمبر چوبیس' گلی نمبر سات۔

بارا مولا' کشمیر۔

میں نے دوسرا صفحہ پلٹا اور پہلی لائن پڑھتے ہی چونک گیا' مجھے ایسا لگا یہ ڈائری میری طرح کسی مصنفہ کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہوتے ہیں جو صرف اس کے حکم کی تعمیل کرتے

ہیں۔ کسی کی قطعی پروا نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی سے ڈرتے ہیں۔ ایسے اعمال کا مظاہرہ جب کوئی انسان کرتا ہے تو ہماری زبان سے بے اختیار نکلتا ہے۔ "یہ تو کوئی فرشتہ لگتا ہے۔"

میرے لئے وہ بھی فرشتے سے کم نہیں تھا۔ جب ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ اپنی جان بچانے کی غرض سے اِدھر اُدھر چھپ رہے تھے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر میرے آگے ڈھال بن گیا تھا۔ میری جان بچائی تھی۔

جب پہلی بار وہ فرشتہ میرے سامنے آیا تھا شام کے تقریباً چھ بجنے والے تھے۔ ہمارے علاقے کی عیدگاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میرے شوہر کسی خاص تنظیم یا گروہ سے منسلک نہیں تھے۔ بلکہ جہاں حق اور اصول کی بات ہوتی تھی لوگوں کی صف میں سب سے آگے نظر آتے تھے اور دھواں دار قسم کی تقریر سے لوگوں کو حق اور اصول پسندی کی طرف راغب کرتے تھے۔ وہ غضب کے شعلہ بیاں مقرر تھے جب لوگ انہیں تقریر کرتے ہوئے دیکھتے اور سنتے تھے تو جوش میں آجاتے تھے۔ ان کے منہ سے بے اختیار یہی فقرے ادا ہوتے تھے۔ "ہمیں تو ایسا لگتا ہے جیسے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا وقت پھر سے لوٹ آیا ہے۔ ہمارے سامنے وسیم علی جوہر نہیں بول رہا بلکہ مولانا محمد علی جوہر بول رہے ہیں۔"

اور میں ان کے منہ سے اپنے شوہر کے بارے میں ایسا سن کر پھولے نہیں سماتی تھی لیکن میری خوشیاں' میری آرزوئیں اور جواں دل کی جوان دھڑکنوں کی امنگیں ایک ہی جھٹکے میں نیست و نابود ہوگئیں۔ جب میرے شوہر کو کسی شرپسند نے گولی مار دی تھی۔ اس آخری تقریر والے دن بھی میں معمول کے مطابق سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ہی میری تین برس کی بیٹی ناہید بھی بیٹھی تھی۔ محلے کی خواتین میرے آس پاس بیٹھی وسیم کو سن رہی تھیں۔ وسیم نے لیاقت علی خان کی طرح اپنے قوت بازو کو بلند کیا۔ فولادی مکے کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "دوستو! بھائیو' ماؤں' بہنو! آج پھر وہی حالات ہیں کہ ہماری قوم کو اپنی بقا اور سلامتی کے لئے' اپنے حق کے لئے آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بکھری ہوئی انگلیوں کو سمیٹ کر اس فولادی مکے کی طرح

ب بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کو منہ توڑ جواب دیتا ہے جنہوں نے آج تک ہمیں' ہماری رومیوں کو قائم و دائم رکھا ہے۔

برصغیر کو آزاد ہوئے آج برسوں بیت چکے ہیں لیکن ہم آج تک ایک متنازع مسئلے ں بھینٹ چڑھائے جارہے ہیں۔ کسی کو آزاد کر دینا' کسی کو غلامی میں رکھنا یہ ایک گھناؤنی ر شاطرانہ چال ہے جو عالمی سطح پر چلائی جارہی ہے۔ دنیا بھر کے بڑے بڑے سربراہان ملکت جو کہ ہماری آزادی کو سلب کرنے کے لئے نت نئے منصوبے بناتے ہیں۔ بڑی بڑی ول اور لمبی ٹیبلوں کے گرد بیٹھ کر ہمیں بے وقوف بناتے ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں نجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے نزدیک ہماری آزادی ایک پیالی چائے سے ی سستی ہے۔ ان کا یہ رویہ ہمیں واضح انداز میں بتا رہا ہے کہ آزادی کبھی کسی قوم کو لیٹ میں رکھ کر نہیں ملتی بلکہ اسے چھیننا پڑتا ہے' جھپٹنا پڑتا ہے۔ اٹھو اور اس مٹھی کی طرح یکجان ہوجاؤ اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑو۔"

اسی لمحے "ٹھائیں ٹھائیں" کی آواز اُبھری۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگوں نے یکھا کہ گولی میرے وسیم کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی پیچھے لگے بینر سے ٹکرا گئی۔ اس کے اندر جتنی آگ اور جتنا زہر تھا۔ چند لمحوں میں اپنا کام کرگیا تھا۔ وسیم کا سر پہلے سامنے رکھے ڈائس سے ٹکرایا پھر ڈائس سمیت وہ اسٹیج سے نیچے میرے سامنے پہنچ گئے۔ انہیں تی بھی مہلت نہیں ملی کہ وہ نزدیک گرے تھے تو اپنی لاڈلی بیٹی کو آخری بار چوم ہی لیتے۔ پیار سے اس کا نام ہی پکار لیتے۔

جلسے میں ہلچل سی مچ گئی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گولی کہاں سے چلی؟ کس نے چلائی۔ بس لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ خود کو محفوظ کر رہے تھے۔ جیسے اب تب میں کوئی گولی ان کے تعاقب میں بھی پہنچنے والی ہو۔ ایسے وقت مجھے رونا چاہئے تھا۔ چیخ چیخ کر بین کرنا چاہئے تھا مگر میں خاموش تھی۔ ایک ہاتھ میں ناہید تھی اور دوسرا ہاتھ وسیم کے خون آلود سر پر تھا۔ میں ہکا بکا سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے وسیم سے الگ کیا پھر انہیں اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور جس ہاتھ نے مجھے ہٹایا تھا اسی شکنجے نے میرے بازو کو پھر جکڑ لیا اور بولا۔ "جلدی

چلیں، یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

مجھے سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہیں مل رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں ناہید تھی، وہ بری طرح سہم گئی تھی اس لئے میرے ایک شانے پر سر رکھ کر چپک گئی تھی اور دوسرا بازو اجنبی کے شکنجے میں تھا اور میں اس کے ساتھ ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔

وہ مجھے اور وسیم کی لاش کو لے کر قریبی تھانے میں پہنچ گیا۔ صحن میں ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر وسیم کے بے جان جسم کو لٹا دیا۔ میرے سر کی چادر کھینچ کر ان کی لاش کو ڈھانپ دیا۔ پھر اسی طرح بغیر دوپٹے یا چادر کے مجھے کھینچتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں لے گیا۔ تھانے دار بڑے ٹھاٹ سے ٹوپی میز پر رکھے کپ ہاتھ میں پکڑے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم بغیر اجازت اندر کیسے گھس آئے؟"

اجنبی نے بھی جواباً اسی طرح گرجتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی چند منٹ پہلے ایک جلسے میں اس عورت کے شوہر کو گولی مار دی گئی۔ اسے بیوہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کی ننھی سی بچی کو یتیم کر دیا گیا ہے۔"

پہلی بار میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میری بچی یتیم ہو گئی۔ اس کے سر سے باپ کا سایہ چھن گیا۔ میں بیوہ ہو گئی۔ میں زور زور سے چیخنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے ناہید کو اپنی چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔

تھانے دار کی آواز پھر ایک بار سماعت سے ٹکرائی۔ "اگر مر گیا ہے تو میں کیا کروں۔ کیا میں نے کہا تھا کہ جلسہ کرو؟"

اجنبی کے حلیے سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کوئی اعلیٰ عہدیدار ہو گا یا اثر و رسوخ والا یا دولت مند ہو گا۔ جس کے رعب و دبدبے سے تھانے دار مرعوب ہو جائے گا لیکن اس کے باوجود اینٹ جیسے فقروں کا جواب پتھر جیسے جملوں سے دے رہا تھا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے جلسے کے لئے نہیں کہا تھا لیکن جمہوریت میں ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے اور اس آزادی کا تحفظ آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ کم از کم پولیس کی ایک موبائل لازمی اس عید گاہ کے پاس تعینات کرتے۔"

تھانے دار نے بھی سختی سے کہا۔ "اے اے.......... ہمیں ہمارے فرائض سمجھانے ی کوشش نہ کر اگر ہم اپنے فرائض کی ادائیگی کرنے پر آ گئے تو اس علاقے کا ایک ایک مرد بچہ اندر کر دینے کے قابل ہے۔ تم لوگ سرکار کے خلاف زہر اگل رہے ہو اور یہ جو تم مجھے فرض شناسی سکھانے آئے ہو تو اس وقت تم بھی حوالات میں بند ہو سکتے ہو۔"

تھانے دار ایک لمحے کو رکا اور پھر اس اجنبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے تم نے اسے گولی ماری ہو یا اپنے کسی ساتھی سے چلوائی ہو اور خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے مرنے والے کی بیوہ اور یتیم بچی کو بھی لے کر آ گئے ہو؟"

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے میں صرف مقتول بیوہ کو لے کر نہیں آیا بلکہ اس لاش کو بھی لے کر آیا ہوں اور وہ اس وقت آپ کے کمرے کے باہر صحن میں پڑی ہے۔ برائے مہربانی اپنی سوچ کو لگام دیں۔ ورنہ.........."

تھانے دار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "اوئے.......... ورنہ کیا؟ کیا تُو مجھے مارے گا۔ مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا؟" پھر اس نے ایک جھٹکے سے گریبان چھوڑ دیا۔ "لے اٹھا لے میرے اوپر ہاتھ۔ مار مجھے، میں بھی تو دیکھوں تیرے بازوؤں میں کتنا لوہا بھرا ہے؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے ہچکی سی لگ گئی تھی۔ آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔ ں نے شاید میری اندرونی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے اپنے رویے میں ذرا سی بدلی پیدا کر لی اور لہجے کی سختی کو کم کرتے ہوئے کہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ اپنی ردی اور اس چار دیواری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ نامعلوم مجرم کے خلاف ایف آئی آر رج کریں اور لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیں۔"

تھانے دار نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔ ں سپاہی کو دیکھا جو ہاتھ میں رائفل لئے ہمارے پیچھے باہر سے اندر آ گیا تھا اور کہا۔ "اوئے ہری رام کو بلا کر لا۔ اس سے کہہ ایف آئی آر درج کرنے والا رجسٹر بھی لیتا آئے۔"

وہ سپاہی گیا پھر حوالدار ہری رام کو بلا کر لے آیا۔ اس نے رجسٹر کو کھولتے ہوئے پوچھا۔ "صاحب! کس کے خلاف کس بات کی رپورٹ لکھنی ہے؟"

تھانے دار نے اس اجنبی فرشتے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بہادر شیخ‘ لیکن آپ یہ ایف آئی آر میری طرف سے نہیں بلکہ مقتول کی بیوہ کی طرف سے درج کریں گے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیوں تمہارا مرنے والے سے یا اس بیوہ سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ میں نے اسے اور پھر تھانے دار کو دیکھا۔ تھانے دار نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا تو اب میں سمجھا یہ چکر کیا ہے؟“

”کیسا چکر؟“

بہادر شیخ کے سخت لہجے پر میں بھی چونک گئی۔ تھانے دار نے کہا۔ ”اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم اس کے ہیرو بن کر چلے آئے۔ اس سے میرا پہلا شک تم پر جاتا ہے۔ مقتول کی بیوہ ماشاء اللہ خوبصورت اور جوان ہے اور تم بھی بانکے جوان ہو۔“

اس کے چہرے پر بیک وقت کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ میں بھی ہکا بکا ہو کر تھانے دار کی شکل دیکھنے لگی۔ جس کے گندے دماغ میں ابال آنے لگا تھا۔ وہ نہ جانے اس کڑی کو کہاں سے کہاں ملا رہا تھا۔ تھانے دار نے حوالدار سے کہا۔ ”او ہری رام‘ اس ایف آئی آر میں قاتل نامعلوم تھا لیکن اب نامعلوم کی جگہ بہادر شیخ کا نام لکھو اور اڑتالیس گھنٹے کے ریمانڈ پر اسے حوالات میں بند کر دو۔“

میں پریشان ہو گئی۔ ”تھانے دار صاحب! یہ...... یہ...... آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرے محسن ہیں۔ انہوں نے مجھے بچایا ہے۔ میرے شوہر کی لاش کو قدموں تلے روندے جانے سے بچایا ہے۔ یہ قاتل نہیں ہو سکتے۔“

تھانے دار نے بدتمیزی سے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ”بی بی...... تم خاموش رہو۔ تمہیں نہیں معلوم یہ آج کل کے نوجوانوں کی ذہنیت کیسی گندی ہو گئی ہے۔ نہ کنواری دیکھتے ہیں اور نہ ہی بچوں والی۔ بس‘ جو بھی پسند آ گئی اسے حاصل کرنے کے لئے جال بچھا دیتے ہیں۔ مجھے تو شک بلکہ یقین ہے کہ اسے بھی تم اچھی لگ گئی ہو۔ اس نے تمہیں

حاصل کرنے کے لئے تمہارے شوہر کو گولی مار دی یا مروا دی ہے اور اب تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے خود ہی فرشتہ بن کر چلا آیا ہے۔“ پھر اس نے اس کے جبڑوں کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لیا اور کہا۔ ”فرشتے ایسے ہوتے ہیں۔ چہرے پر ذرا بھی نور نہیں ہے۔ شیطانیت جھلک رہی ہے۔“

وہ بولتے بولتے پھر ایک بار رکا اور دوبارہ اس سے مخاطب ہو کر بولنے لگا۔ ”اوئے ادھر آنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیتے کہ ہمارا جال تمہارے بچھائے ہوئے جال سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اب تم کسی بھی طرح سے ہمارے شکنجے سے نہیں نکل سکتے۔ ابھی اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر تم خود اپنے منہ سے اقبال جرم کرو گے۔“

حوالدار اور سپاہی‘ تھانے دار کے حکم پر اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے بڑھے لیکن وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے ہاتھ کو قمیض کے نیچے لے گیا پھر پھرتی سے باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ اس میں جتنی آگ ہے تم تینوں میں اتار دوں گا۔“

اس غیر متوقع حالات سے تینوں پولیس اہلکار سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ ایک ہی جگہ پر جم کر رہ گئے۔ ایف آئی آر درج کرنے کی غرض سے آنے والا حوالدار ہاتھ میں صرف رجسٹر اٹھائے ہوئے تھا۔ سپاہی نے بھی تھانے دار کا حکم سن کر رائفل ایک کاندھے پر لٹکائی تھی تاکہ اسے پکڑ کر حوالات تک لے جاسکے اور اتفاق سے تھانے دار کا پستول والا ہولسٹر بھی پچھلی دیوار کی کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا۔ سب کے سب بے بس تھے۔ میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ اب کیا ہو گا؟

بہادر شیخ نے کڑک دار آواز میں سپاہی کو کہا۔ ”اے اپنی بندوق زمین پر پھینکو اور حوالدار کے ساتھ اپنے تھانے دار کے پاس چلے جاؤ۔“

انہوں نے اس کا کہا ایسے مانا جیسے افسر اعلیٰ کا حکم ہو۔ پھر بہادر نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ تھانے دار نے فوراً ماحول کا اندازہ لگاتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔ ”تم جانتے ہو‘ تم کتنا بڑا جرم کر رہے ہو۔ تھانے کے اندر تم نے باوردی پولیس آفیسر پر پستول تان لیا ہے۔ قانون کو ہاتھ میں لیا ہے اگر تم واقعی بے قصور تھے تو اب مجرم بن

گئے ہو۔"

بہادر شیخ نے کہا۔ "جو زندگی کو ہتھیلی پر لے کر نکلتے ہیں۔ ان کی نظروں میں قانون لنگڑے اور لُولے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اہل کار درندے سے کم نظر نہیں آتے۔ اگر تم نے پانچ منٹ کے اندر اندر میرے مطالبات نہیں مانے تو میں ہمیشہ کے لئے تم تینوں کو خاموش کر دوں گا۔ جس طرح مقتول کی لاش باہر پڑی ہے۔ اسی طرح تمہاری لاشیں بھی اندر پڑی سڑ جائیں گی۔"

تھانے دار نے پوچھا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

"ابھی اسی وقت کسی اسپتال فون کرکے ایمبولینس منگواؤ۔ میری نظروں کے سامنے اس بیوہ کو لاش کے ساتھ اسپتال روانہ کرو۔ ہری اپ۔"

پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ باہر لاش کے پاس چل کر بیٹھیں۔ میں ان سے نمٹتا ہوں۔"

میرے باہر نکلتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم پھر اندر کیا ہوا۔ چند منٹوں میں ایمبولینس اپنا سائرن بجاتی ہوئی اندر آئی۔ اس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک مددگار بھی تھا۔ ان دونوں نے مل کر میرے شوہر کی لاش کو اسٹریچر پر اٹھا کر ایمبولینس کے پچھلے دروازے سے اندر رکھ دیا۔ میں بھی پیچھے بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ وہاں سے دو پولیس والے بھی سوار ہوگئے۔ ایمبولنس کی روانگی سے پہلے میں نے اس کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے اندر بہادر شیخ تھانے دار کے ساتھ بند تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو اس کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا۔ جہاں سے اس کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ جب تک ایمبولینس تھانے کی حدود سے باہر نہیں نکل گئی۔ وہ مجھے اور میں اسے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں اس کی سلامتی اور باحفاظت اس تھانے دار کی گرفت سے باہر نکل جانے کی دعائیں مانگتی رہی۔

اب یہ بات خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میری دعائیں کام آگئیں یا واقعی وہ فرشتہ تھا اور فرشتوں کی طرح خدا نے اسے وہاں سے نکال کر پھر اسے ایک بار میرے سامنے بھیج دیا تھا۔

میرے شوہر وسیم علی کا جنازہ تیار تھا۔ علاقے کے مرد عورت اور جوان سب جمع تھے مگر کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ جنازے کو اٹھا کر قبرستان تک لے کر جائیں۔ سب کے اندر ایک عجیب سا خوف تھا۔ شرپسندوں نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ جنازہ لے جانے والوں پر فائرنگ کرنے کا منصوبہ بنایا جاچکا ہے۔ ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔ "بیٹی میں تو کہتا ہوں تمہارے گھر کے آنگن میں بہت بڑی کچی زمین ہے' تم وسیم کو اسی آنگن میں سپرد خاک کردو۔ اگر افواہ میں صداقت ہوئی تو کئی لوگوں کی جانیں چلی جائیں گی۔ ایک جنازے کے چلتے ہی ہمیں کئی جنازے اٹھانے پڑ جائیں گے۔"

میں نے اور دوسری عورتوں نے غیر یقینی نظروں سے بڑے میاں کو دیکھا۔ میں نے کہا۔ "چاچا رحمان' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے جو اب ہوگا؟"

انہوں نے کہا۔ "بیٹا! اس ہفتے کے دوران ہم نے چھ جنازے اٹھائے ہیں۔ اب تو ہمارے یہ کاندھے بھی حوصلوں کی طرح دم توڑنے لگے ہیں۔ اسی لئے میں.........."

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ میں بھی ایمبولنس کے سائرن کی آواز سن کر اس جانب دیکھنے لگی۔ جدھر سب لوگ دیکھنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں ایک بڑی ایمبولنس بھیڑ کو چیرتی ہوئی جنازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور سیٹ کا دروازہ کھلتے ہی بہادر شیخ کا چہرہ نمودار ہوگیا۔ اس نے جنازے کے قریب آکر باآواز بلند کہا۔ "آپ لوگ جس موت سے خوفزدہ ہیں وہ آپ کی پوری کوشش کے باوجود آرہی ہے۔ ہر روز دو تین جوان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ایک بار اپنی آزادی کی خاطر ان ظالموں سے ٹکرا جاؤ۔ غازی بن کر زندہ رہو یا شہید ہوجاؤ۔"

لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا۔ اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے آپ لوگوں کی جیسی مرضی۔ میں کسی سے زبردستی نہیں کروں گا۔ البتہ ایک بات کی گزارش کروں گا کہ آپ میں سے کوئی بھی دو آدمی آگے آکر اس شہید کے جنازے کو ایمبولنس میں رکھوا دیں۔ میں اسے اکیلا ہی لے جاکر اللہ کی امانت اللہ کے سپرد کردوں گا۔"

ایسے وقت میں نے دیکھا۔ کئی عورتیں اور لڑکیاں اپنے بھائی' شوہر' بیٹے اور باپ کو پکڑ کر روک رہی تھیں۔ جیسے گولی وہیں سے چلنے کا امکان ہو۔ میں نے اپنے دل کو سخت

کرلیا۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ "چلیں آپ آگے سے اٹھائیں میں اپنے شوہر کا لاشہ خود اٹھاؤں گی۔"

مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس وقت بھی سارے مرد اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ جیسے ضمیر کے ساتھ ساتھ ان کی روحیں بھی جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ہیں اور مردہ لوگوں سے مزید کسی بات کی امید کرنا حماقت تھی۔ اپنا لاشہ آپ اٹھانا تھا۔

بہادر شیخ نے میری مدد سے میرے شوہر کا جنازہ ایمبولنس میں رکھا اور وہاں سے لے گیا۔ میں اس شش و پنج میں دیکھتی اور سسکتی رہی کہ اگر یہ فرشتہ اس وقت بھی نہ پہنچتا تو کیا میں اپنے شوہر کو اپنے ہی گھر کے آنگن میں دفنا دیتی یا ان کی لاش اسی جگہ پڑی پڑی سڑتی گلتی رہتی۔ میرے اندر عجیب کرب سا اٹھا اور میں زور زور سے چیخ کر رونے لگی۔ جتنا غبار میرے اندر جمع ہو گیا تھا اسے آنسوؤں کے ذریعے باہر نکالنے لگی کیونکہ مجھے جینا تھا۔ اپنے شوہر کے مشن کو آگے بڑھانا تھا لیکن یہ سب عدت کی مدت گزرنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اگلے روز محلے کا ایک بچہ میرے پاس مقامی اخبار لے کر آیا۔ اس میں وسیم کی شہادت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس میں ایک اور خبر پڑھ کر میں چونک گئی۔ اس میں لکھا تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے گزشتہ روز سول اسپتال کشمیر کے ایمبولنس ڈرائیور کو باندھ کر ایک جگہ قید کردیا اور ایمبولنس لے کر فرار ہو گیا تھا پھر تقریباً چھ گھنٹے بعد ہی اس نے ایمبولنس واپس اسی جگہ لاکر چھوڑ دی۔ جہاں وہ ڈرائیور کو باندھ کر گیا تھا۔

میری طرح ان لوگوں نے بھی یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ وہ نامعلوم نوجوان بہادر شیخ تھا۔ جنہوں نے اسے وسیم کا جنازہ لے جاتے دیکھا تھا۔

میں اس دن کے بعد سے گھر کی چار دیواری میں عدت کے لئے پابند ہو کر رہ گئی۔ البتہ مجھے عورتوں، بچوں اور اخبارات کے ذریعے مسلسل شہری حالات کے بارے میں خبر مل رہی تھی اور ان مردوں پر حیرت ہو رہی تھی جو مسلسل خاموش تھے، ایک ایک کر کے مر رہے تھے مگر آزادی سے جینے کے لئے لڑنے کی کسی میں جرأت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

میری عدت کے دن ختم ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے کہ اچانک میری پڑوسن نے یہ خبر دی کہ جس شخص نے وسیم کا جنازہ اٹھایا تھا وہ اپنی ماں اور گھر کے دیگر سامان

ساتھ اس محلے میں کرائے پر آیا ہے۔ پھر اسی دن شام کو بہادر شیخ کی والدہ ہمارے گھر آئیں۔ بہت ہی خوش اخلاق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری اپنی ماں پھر سے زندہ ہو کر آگئی ہو۔ چند ہی دنوں میں ہم دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ عدت کی مدت ختم ہوتے ہی انہوں نے مجھے اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ مجھے وسیم آزاد کشمیر سے بیاہ کر لائے تھے۔ اب وہ نہیں رہے تھے تو میری بیٹی ناہید کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ میں تعلیم یافتہ تھی۔ جانتی تھی کہ بیوہ کی عدت ختم ہوتے ہی دوسرا نکاح کرلینا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ مذہب اور قانون بھی اس بات کی اجازت اور حق دیتا ہے۔ میں نے ان کی خواہش کے آگے اپنا سر خم کردیا اور بڑی سادگی سے نکاح پڑھوا کر بہادر شیخ کے مکان میں پہنچ گئی۔ علاقہ اور محلہ وہی تھا بس مکان نمبر بدل گیا تھا۔ پہلے میں لائن کے آخری مکان میں رہتی تھی پھر میں سب سے پہلے مکان میں پہنچ گئی۔ پہلی رات ہی مجھ پر بہادر شیخ نے اپنے بارے میں کئی انکشافات کئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی تنظیم کے کارکن نہیں ہیں لیکن محکومی برداشت نہیں کرتے ہیں۔ لوگوں کو کتے بلی کی طرح مار دیا جاتا ہے لیکن ایسی واردات کی تفتیش نہیں ہوتی۔ قاتل کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ لہٰذا انصاف حاصل کرنے کے لئے ان سے تنہا جو ہو پاتا ہے وہ کرتے ہیں اور جب تک ہماری آخری سانس باقی ہے آزادی کی خاطر جنگ کرتے رہیں گے۔ لوگوں کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا کرتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے جیسے کشمیر کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کے ضمیر جاگ چکے ہیں، ہمارا "بارا مولا" بھی آزادی کی جدوجہد کی صف میں شامل ہو جائے۔

"آمین" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر میں نے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "اس آزادی کی چنگاری کو شعلہ بنانے کے لئے میں آپ کی بھرپور مدد کروں گی۔ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں میں ایسا جذبہ پیدا کروں گی کہ وقت پڑنے پر وہ سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گی۔"

پہلے پہل ہم دونوں کو اس معاملے میں زیادہ کامیابیاں نہ ہوئیں لیکن جب سوپور کی طالبات کی اجتماعی آبرو ریزی کی خبریں بارا مولا تک پہنچیں تو جہاں بارا مولا کے دوسرے

محلے گلیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی' وہاں ہمارے محلے میں بھی لوگ دشمنوں کے خلاف برہم ہوگئے۔ لوگوں کی بے حسی اور مردہ ضمیری میں جان پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات دھیرے دھیرے گھر کرنے لگی تھی کہ اگر انہوں نے اپنے حقوق اور اپنی شخصی و اجتماعی آزادی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو دشمن انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے مار مار کر ختم کردیں گے۔ کسی ایک بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے کہ کل وہ اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو آزادی کا رنگ دے سکے۔ کشمیر پر آزادی کا پرچم لہراسکے۔

جہاں فرشتوں کا وجود ہوتا ہے وہاں شیطان کی موجودگی بھی لازم ہوتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی روپ اور شکل میں آدھمکتا ہے۔ کشمور چاچا عرف کشری بھی شیطان کی طرح علاقے میں سر اٹھانے لگا جو کہ ہندوستان کے علاقے راجن پور کے مشہور ڈاکو پھول بہار عرف بہارو کا چھوٹا بھائی تھا۔ پہلی بار بہادر شیخ کا جھگڑا اس سے منشیات کے سلسلے میں ہوا۔ بہادر شیخ اس علاقے میں منشیات فروخت کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس بات پر ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہی لیکن ان دنوں بہادر شیخ اپنی نیک نامی کے باعث طاقتور تھے۔ تھانہ انچارج پرشاد لال نے درمیان میں آکر ان کی دوستی کرادی۔ کشمور چاچا عرف کشری نے اس علاقے میں منشیات فروخت کرنا بند کردی لیکن یہ ایک بڑا نقصان تھا' جس کا خمیازہ تھانہ انچارج پرشاد لال کو بھی بھگتنا پڑ رہا تھا۔

آدمی حالات سے سمجھوتا ضرور کرلیتا ہے مگر ہر گھڑی موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب بازی پلٹے اور کب وہ پھر سے حریف پر حاوی ہوجائے اور ایک روز ایسا موقع آہی گیا۔

بہادر شیخ میرے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بہت دنوں بعد ایک ساتھ کھانے کا وقت ملا تھا' مگر اسی وقت ایک بوڑھی خاتون دوڑتی بھاگتی' روتی ہوئی آئی کہ ان کی بیٹی کو کسی نے اغوا کرلیا ہے۔ وہ بہادر کے قریبی دوست کی سگی بہن تھی۔ بہادر نے اپنے اثر ورسوخ سے دباؤ ڈال کر اس لڑکی کو واپس گھر پہنچوا دیا۔ اس لڑکی کو کشمور چاچا نے اغوا کرایا تھا۔ اس لئے بہادر اور اس کی عارضی دوستی پھر سے دشمنی میں بدل گئی۔ انہی دنوں سیاسی حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے تھے۔ جو وفادار تھے ان پر بے وفائی اور دہشت

گردی کے الزامات لگنے شروع ہوگئے تھے۔ تھانہ انچارج کے مزاج میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ اسی کے اشاروں پر کشمور چاچا اور بہادر کے حامیوں میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ پرشاد لال نے انہیں لڑوا کر اپنے پچھلے نقصانات کا خمیازہ پورا کرنا شروع کردیا۔ اسے سری نگر کے اعلیٰ حکام سے یہ بھی ہدایت ملی تھی کہ بارا مولا میں بسنے والے حریت پسندوں کو سبق سکھا دو۔ بہادر شیخ اور اس کے ساتھیوں کو کسی نہ کسی بہانے سے ختم کردو۔

چنانچہ کشمور چاچا کی نشاندہی پر مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جانے لگے۔ بے گناہ افراد کو بھی کسی نہ کسی طرح آزادی کی تنظیم سے وابستہ کرکے گرفتار کیا جانے لگا۔ جن کے گھروں میں چھری چاقو بھی نہیں تھا وہاں سے نیزے' بھالے' بندوقیں یہاں تک کہ کلاشنکوف اور ہینڈ گرینیڈ تک برآمد ہونے لگے۔ اس بے انصافی پر احتجاجاً عام ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ سری نگر' سوپور' پونچھ' نورپور' رام پور' الوسہ' غرضیکہ جہاں جہاں آزادی کے متوالے تھے۔ انہوں نے اس ہڑتال میں بارا مولا کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہڑتال بے حد کامیاب رہی لیکن ماحول میں عجیب سی بے چینی تھی۔ بہادر شیخ نے رات گئے تک حالات کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "خدیجہ! یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ہمارے خلاف کشمور کو صرف مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے آزادی کے دشمنوں کے مضبوط اور مستحکم ہاتھ ہیں۔ ہمارے کئی وفادار اور اہم دوست گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ اگرچہ ہڑتال پُرامن اور کامیاب رہی ہے مگر کسی لمحے بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ تم ناہید کو لے کر کل صبح ہی ضلع باغ چلی جاؤ۔ امی بھی تمہارے ساتھ جائیں گی۔ وہاں میرا نھیال ہے تم لوگوں کو ہر طرح کا تحفظ مل جائے گا۔"

"اور آپ کا کیا ہوگا؟ آپ کہاں جائیں گے؟"

"جب تک ہوسکے گا میں حالات کا مقابلہ کروں گا۔ اگر شہید ہوگیا تو تمہیں دوسری بار بیوگی کی سفید چادر اوڑھنی پڑے گی۔"

مجھے بہادر کی اس بات پر غمزدہ ہو کر رونا چاہیے تھا مگر میں نے جن حالات میں خود کو سنبھالا تھا اندرونی طور پر چٹان کی طرح مضبوط ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے عہد

کرلیا تھا کہ میں بھی مردوں کی طرح اپنے کشمیر کے تحفظ' بقا' سلامتی اور آزادی کی خاطر بڑے سے بڑے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔ دختر کشمیر ہونے کا پورا پورا حق ادا کروں گی۔ میں نے کہا۔ "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ میں یہاں کی عورتوں کے اندر آزادی کی چنگاری کو بھڑکا کر شعلہ بناؤں گی۔ اب اگر میں آپ کے کہنے سے انہیں تنہا چھوڑ کر جاؤں گی تو ان کے حوصلے پست ہوجائیں گے۔ میں بھگوڑی کشمیرن کہلاؤں گی۔"

میری اس بات پر بہادر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں نے پھر کہا۔ "آپ ایسا کریں امی کے ساتھ ناہید کو ضلع باغ روانہ کردیں پھر ہم دونوں ہی مل کر اپنے اس علاقے کے لئے آزادی کی جنگ لڑیں گے اور فتح ہماری ہوگی انشاء اللہ۔"

☆======☆======☆

انشاء اللہ کے بعد ہی پلٹنے والا صفحہ کورا تھا۔ میں جلدی جلدی صفحے پلٹ کر دیکھنے لگا مگر خدیجہ کی ڈائری ادھوری رہ گئی تھی۔ میں متجسس ہوگیا کہ آخر آگے کیا ہوا؟ وہ پندرہ اور سولہ اگست کی شب تھی۔ میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جیسے کسی نے مجھے کرنٹ کا جھٹکا دیا ہو لیکن نہیں یہ میرے دماغ کا جھٹکا تھا۔ مجھے اچانک ایک بات یاد آگئی تھی۔ کچھ روز پہلے کا اخبار میرے دماغ میں چیخ رہا تھا۔ میں جلدی سے اپنی الماری کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے اوپر ہی تمام اہم اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ میں نے چھانٹ کر سولہ اگست کا اخبار نکالا' یہ شام کا ایک اخبار تھا اس میں ایک خبر پر نظریں جم گئیں۔ صبح سوا سات بجے کے لگ بھگ ایک اسکول بس کو مین روڈ پر آرمی چیک پوسٹ سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک مسافر ٹرین کو چند نامعلوم نقاب پوشوں نے آگ لگادی۔ اس دن دوپہر کے بعد علاقے کی پولیس نے فوج کی نگرانی میں بارا مولا کے اس محلے کی ناکا بندی کردی تھی جہاں بہادر شیخ رہتا تھا۔ عینی شاہدین کے کہنے کے مطابق یہ محاصرہ تقریباً چار سے چھ گھنٹے تک جاری رہا اور تقریباً چار سو نوجوانوں کو جن میں اسکول کے بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے گرفتار کرلیا گیا اور نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔

ڈائری کے صفحات کورے کیوں رہ گئے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی تھی۔ یقیناً بہادر شیخ بھی چھاپے میں پکڑا گیا تھا اور اس چھاپے کے دوران ہی یہ ڈائری اس سپاہی نے حاصل کی تھی۔ جسے میں اپنا مخبر کہہ سکتا ہوں۔

میں اپنی کہانیوں سے دوسروں میں تجسس پیدا کردیتا ہوں مگر اس وقت خود تجسس میں گرفتار ہوگیا تھا' آخر آگے کیا ہوا؟ میں اس کے بعد کے اخبار دیکھنے لگا شاید اس خبر سے منسلک کوئی نئی خبر سامنے آجائے' اور آگئی۔

اس واقع کا واحد عینی گواہ ایک پچاس سالہ بیمار بوڑھا تھا۔ اس نے بتایا کہ ظہر کی نماز کے بعد اچانک کچھ نوجوان اس کے گھر میں داخل ہوئے' اسی اثنا میں ایک اور نوجوان کو انڈین فوج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے پولیس اہلکاروں نے باندھ رکھا تھا۔ ان اہل کاروں نے ان سب نوجوانوں کو ایک کمرے میں بند کردیا اور کمرے کو تالا لگا دیا۔ چند منٹوں بعد ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چیخ رہے تھے۔ "ہمیں مت مارو' ہمیں گرفتار کرلو۔"

وہ داد و فریاد کرتے رہے اور گولیاں چلنے لگیں پھر میرے کانوں میں ان کی آخری چیخیں سنائی دیں۔ میں بھی کسی کا باپ تھا۔ میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ اگر میں اٹھنے بیٹھنے سے معذور نہ ہوتا تو اس بڑھاپے میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنے جوان مجاہدوں کو بچانے کی خاطر اپنی آخری سانس بھی دے دیتا مگر میں مجبور تھا۔ اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خدا کے حضور گڑگڑانے لگا۔ اسی لمحے ایک گرج دار آواز سنائی دی جو یقیناً فوجی سارجنٹ کی تھی۔ اس نے کہا۔ "اوئے کتے کے بچے۔ ان نعشوں کو چارپائیوں پر اٹھا کر ڈال۔"

اس نے جسے کتے کا بچہ کہا تھا وہ بھی ان اہلکاروں کی حراست میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کا نام اکرم بٹ تھا پھر وہ نعشیں ان ظالموں کی نگرانی میں تھانے بھیج دی گئیں۔

بزرگ حافظ حمید اللہ کے بیان کے بعد اکرم بٹ کا بیان تھا۔ اس نے اخباری رپورٹروں کو بتایا۔ "جب میں نے سارجنٹ کے حکم پر ایک ایک نعش کو اٹھا کر روشنی والی جگہ میں چارپائی پر ڈالا تو ان میں سے دو کو میں نے اچھی طرح شناخت کرلیا۔ ان میں سے ایک بہادر شیخ تھا۔"

جب میرے کسی کردار کو سوئی چبھتی ہے تو اس کی چبھن میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اسی طرح گرم گرم دھات کے ٹکڑے بہادر شیخ کے جسم میں نہیں اترے تھے بلکہ میرے جسم میں اترے تھے۔ مجھے اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ جیسے بہادر شیخ کی روح بے چین ہے اور اس کا سارا دھیان اس عورت کی طرف ہے جس پر بھری جوانی میں دوسری بار قیامت ٹوٹی تھی اور میں خود بخود بہادر شیخ کی بیوہ خدیجہ شیخ کے

بارے میں سوچنے لگا۔

میرے سوچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں مزید معلومات کے ذریعے اس سچ بیانی کو اپنی تحریر کی شکل دینا چاہتا تھا۔

میں جذبات میں بہتا ہوا ایک دم سے چونک گیا' مجھے یاد آیا کہ جو شخص مخبر کی حیثیت سے میرے پاس مخبر سپاہی حضور بخش کے دیئے گئے ثبوت کو پہنچانے آیا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ دو روز بعد پھر آئے گا۔ اس کا مطلب تھا مجھے مزید حقائق اس سے معلوم ہوسکتے تھے۔

اس رات کے بعد دوسری رات بھی میں نے بے چینی اور بے تابی سے آنکھوں میں کاٹی اور صبح ہوتے ہی اپنے آفس پہنچ گیا اور وہاں ہرایک سے کہہ دیا کہ کوئی بھی شخص مجھ سے ملنے آئے اسے میرے کمرے میں بھیج دینا۔

ظہر کی اذان ہونے تک وہ نہیں آیا پھر میں نماز پڑھنے چلا گیا۔ مسجد ہماری عمارت کی سیڑھیاں اترنے کے بعد مین گیٹ سے نکلتے ہی ہے۔ نماز کے بعد میری پہلی اور آخری دعا یہی تھی کہ اے خدا جلدی سے اس شخص کو بھیج دے جس کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ یوں لگا مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے ہی میری دعا قبول کرلی گئی کیونکہ وہ مسجد کے گیٹ کے باہر میرے نکلنے سے پہلے ہی کھڑا تھا شاید بلکہ یقیناً اس نے بھی اسی مسجد میں نماز پڑھی تھی اس لئے سر سے رومال اتار کر اسے تہہ کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ آپس میں ٹکرائی پھر ہم ایک دوسرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا' اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا اور میں اسی طرح ہاتھ پکڑے اپنی عمارت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کمرے میں پہنچ کر اس سے کچھ پوچھتا اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام راشد الباری ہے۔ میں ایک مجاہد ہوں مگر ایسا مجاہد جو دشمنوں میں دوست بن کر بلکہ رشتے دار بن کر اپنے کشمیر کی آزادی کے لئے جنگ لڑ رہا ہے۔ جب بارا مولا کے ایک محلے میں یہ واقعہ رونما ہوا جس کے کچھ ثبوت آپ کے پاس موجود ہیں۔ میں وہیں موجود تھا۔ ایک صحافی وشوا ناتھ گوپال کے بھیس میں۔"

"کیا واقعی؟"

اس نے میری حیرانی پر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ جس روز بہادر شیخ کو مارا گیا اس روز ہی مجھے سپاہی حضور بخش کی جانب سے چند ثبوت اور ایک اہم پیغام ملا تھا۔ دراصل وہ میری اصلیت سے واقف تھا کہ میں وشوا ناتھ گوپال نہیں بلکہ راشد الباری ہوں۔

پیغام میں لکھا تھا کہ بارامولا کے اس علاقے کے حالات بہت ڈرامائی ہو چکے ہیں۔ جہاں بہادر شیخ رہتا تھا۔ اگر میں حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں تو جلد از جلد بارا مولا پہنچ جاؤں۔ وہاں تک پہنچنا منہ سے نکلی بات نہیں تھی۔ نہ صرف پولیس فورس بلکہ فوج بھی ایکشن میں تھی۔ میں نے اپنے ایک سکھ دوست کے سسر جرنیل گوپال سنگھ سے بات کی۔ انہوں نے جواباً کہا کہ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اگر شرپسند دہشت گردوں نے جواباً کوئی کارروائی کردی تو کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بابا جی.......... آپ تو جانتے ہیں مجھے ایسے ہی ایڈونچر سے دلچسپی ہے۔ بس آپ مجھے اس بات کا ثبوت دے دیں کہ مجھے وہاں کوئی روکے گا نہیں۔"

گوپال سنگھ ایک زندہ دل جرنیل ہے اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "واہ گرو دی سونھ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرا داماد بھی میری طرح خطروں کا کھلاڑی ہے۔ اگر تُو نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں ہوم منسٹر سے بات کرلیتا ہوں اور ایک خط بھی لکھ دیتا ہوں تُو جا اور بے فکر ہو کر دہشت گرد کشمیریوں کا تماشا دیکھ۔"

گوپال سنگھ کی اس بات پر میرے اندر کا خون کھول گیا مگر میں نے خود پر قابو رکھ اور ان کے ذریعے ہوم منسٹر کے نام خط لے کر جیپ میں بارا مولا کے لئے روانہ ہو گیا۔

میری ایسی عادت ہے جب میں کسی ماحول کے بارے میں لکھ رہا ہوتا ہوں تو اس میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ کسی کردار کے حوالے سے بات کر رہا ہوتا ہوں۔ خود کو وہ تصو کرنے لگتا ہوں۔ اس طرح میں راشد الباری کو سن رہا تھا مگر اس کی جگہ خود کو محسو کر رہا تھا۔ میں وشوا ناتھ گوپال کے بھیس میں سوار ہو گیا تھا اور بارا مولا کی طرف چل ر تھا۔

سری نگر سے بارا مولا تک کا فاصلہ میں نے چھوٹے بڑے پہاڑی راستوں سے طے کیا اور چند گھنٹوں میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں ڈرامائی حالات رونما ہونے والے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ تھانے جا کر اپنی آمد کی اطلاع اور مقصد بتا دوں تاکہ میری راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو مگر تھانے سے پہلے ہی مجھے ایک بند مکان دکھائی دیا جس کا بورڈ سبز رنگ کا تھا۔ وہاں سبز رنگ مسلمان کشمیریوں کی دکانوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس پر بٹ کریانہ مرچنٹ لکھا ہوا تھا اور نیچے علاقے کا نام لکھا تھا۔ میرے قدم خود بخود اس جانب بڑھ گئے۔ جیسے مجھے عجیب سی کشش کھینچ رہی ہو۔ اسے میں صرف اتنا کہہ سکتا تھا۔ شاید خدیجہ شیخ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور میں کھنچا چلا جا رہا تھا۔

وہ کالونی ایک' دو' تین کی ترتیب سے تھی۔ میں نے گزرتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہاں رہنے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ عجیب سی گہری خاموشی تھی۔ اچانک پیچھے سے ایک دروازہ کھلا۔ کسی نے مجھے آواز دی۔ "اے سنو۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بوڑھی خاتون تھیں۔ میں واپس پلٹ کر ان کے پاس آیا۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنا سوال کیا۔ "اماں جی! یہ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تم کہیں اور سے آرہے ہو؟"

"جی اماں جی۔ میں سری نگر سے آرہا ہوں۔"

"تو پھر اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤ' نہیں تو اس علاقے سے کہیں دور چلے جاؤ کیونکہ یہاں وردی والے اور غیر وردی والے اہلکاروں کے علاوہ مردوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ جو بھی یہاں تھا ان میں سے کچھ کو مار دیا گیا اور سینکڑوں کو نامعلوم مقام پر قید کردیا گیا ہے۔ ابھی ابھی شہید بہادر شیخ کا لاشہ اس کے دروازے تک پہنچایا گیا ہے۔"

آگے میں نے کچھ نہیں سنا۔ پیچھے سے بڑی بی آواز دیتی رہیں۔ مجھ سے رک جانے کی التجا کرتی رہیں لیکن میں دوڑنے کے انداز میں تیز تیز چلنے لگا۔ میں جلد از جلد خدیجہ کے دروازے پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس جیالے کی شکل دیکھ سکوں جسے بے بس کر کے گولی

مار دی گئی تھی۔

اس کالونی میں داخل ہوتے ہی مجھے سادہ لباس میں ایک اہل کار نے روک لیا۔

"اوئے تم کون ہو؟ اور اس علاقے میں کیسے آئے ہو؟"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بدتمیزی کرتا یا میرے ساتھ دوسروں جیسا سلوک کرتا، میں نے جیب سے اس اجازت نامے کی فوٹو کاپی نکال کر اس کی طرف بڑھادی، جو میں نے اسی مقصد کے لئے سری نگر سے کروائی تھی۔

اس نے اسے کھول کر پڑھا، شاید سمجھ نہیں سکا۔ اس لئے تھانے دار کے پاس لے گیا۔ جو جیپ کی اگلی سیٹ پر تن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں ایمبولینس کے اسٹریچر پر ایک کفن پوش نعش پڑی ہوئی تھی۔ اہل کار نے وہ پرچا بڑھایا تو وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے اس کی جیب پر لگی پلاسٹک کی پٹی پر نام پڑھا۔ وہ تھانے دار گردھاری لال تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر یہاں گھومیں اگر خطرہ ہوگا تو میرے آدمی خود ہی آپ کو اٹھا کر جیپ میں ڈال لیں گے اور باحفاظت ہوم منسٹر ہاؤس پہنچا دیں گے جہاں سے آپ باآسانی واپس سری نگر جاسکیں گے۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک طرف جاکر کھڑا ہوگیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سے ایک لڑکی نظر آرہی تھی جس کی گود میں چھوٹی سی بچی تھی۔ جسے چند عورتوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ رو نہیں رہی تھی بلکہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کو ہاتھوں سے ہٹا رہی تھی۔ یقیناً وہ خدیجہ شیخ تھی۔ میں نے ایک پولیس والے سے سرگوشی میں پوچھا۔ "وہ......... وہ لڑکی کون ہے؟"

اس نے بھی سرگوشیوں میں مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سالی دوسری بار بیوہ ہوئی ہے۔ اب بھی ایسی لگ رہی ہے کہ دو چار کو مار کر بھی اسی طرح جوان رہے گی۔"

مجھے خدیجہ کے بارے میں اس طرح کا ریمارکس ناگوار گزرا۔ میں اس کے پاس سے ہٹ کر ایمبولینس کے پاس پہنچ گیا جس کے پاس ہی اس کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی خدیجہ بھی بچی کو گود میں اٹھائے اس طرف آگئی اور آتے ہی اس ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "بھیا......... تم جانتے ہو ہمارے علاقے میں ایک بھی مرد نہیں بچا۔ سب ان

ظالموں کی جیلوں میں قید کر دیئے گئے ہیں۔ جس طرح تم شہید بہادر شیخ کا جنازہ یہاں تک لائے ہو۔ خود ہی چار مردوں کے ساتھ قبرستان لے جاکر دفن کر دیتے۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "بہن......... میں اسپتال کا ملازم ہوں اور احکامات کا پابند ہوں۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں اس کفن پوش شہید کو آپ کے دروازے تک پہنچا دوں۔ اگر میں نے مذہب اور انسانیت کے ناطے اسے دفن کرنے کے لئے آپ عورتوں کا ساتھ بھی دیا تو یہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہوجائیں گے۔ بلکہ میں ہی نہیں اگر کوئی فرشتہ بھی آسمان سے اتر کر آپ کی مدد کو آپہنچے تو یہ اسے بھی گولی مار دیں گے۔"

ایک بوڑھی خاتون جو غالباً بہادر شیخ کی والدہ تھیں اور غم سے نڈھال تھیں انہیں اسٹریچر کے سامنے کھلی جگہ پر پہنچایا گیا۔ خدیجہ زور زور سے بولنے لگی۔ "اے ظالمو! تم کیا سمجھتے ہو، کیا ہم عورتیں اتنی کمزور ہیں کہ اپنے مردوں کے جنازے اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھا سکتیں۔ ہمارا مذہب ہمیں قبرستان میں قدم رکھنے سے روکتا ہے لیکن جب تم جیسوں نے مذہبی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے تو پھر ہم بھی شہید کربلا کی خواتین کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھائیں گے۔"

وہ بول رہی تھی میرے کان سن رہے تھے لیکن میری نظریں ایک پولیس کے سپاہی کو دیکھ رہی تھیں، جس نے اپنے شانے پر لگے بلے کو اتار دیا تھا اور کمر کا بیلٹ کھول دیا تھا۔ اس وقت میری نظریں ادھر سے ہٹ کر خدیجہ پر گئیں، اس نے اپنے جسم کی سفید چادر اتار لی۔ اسے کفن کی طرح سر پر باندھ لیا۔ اس کے ساتھ دو اور نوجوان لڑکیوں نے بھی وہی حرکت دہرائی پھر وہ چلتی ہوئیں اسٹریچر پر پڑی میت کے پاس گئیں۔ وہ دونوں لڑکیاں میت کے پاؤں کی طرف چلی گئیں اور دوسری طرف۔ پھر خدیجہ نے جھک کر اسٹریچر کے دستے پر ہاتھ رکھا اور باآواز بلند کہا۔ "کلمہ شہادت۔"

جب کوئی کلمہ شہادت کا نعرہ بلند کرتا ہے تو مسلمان ہونے کے ناطے سب پر فرض ہوجاتا ہے کہ وہ جواب میں کلمہ پڑھے اگر زور سے نہ سہی کم از کم دل ہی دل میں ضرور پڑھے۔ میں وشوا ناتھ گوپال کے بھیس میں ضرور تھا مگر مسلمان تھا۔ اس لئے کلمہ میں نے

بھی دل ہی دل میں پڑھا' لیکن ایک مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اسی سپاہی نے جو کچھ دیر پہلے بلے اور بیلٹ اتار رہا تھا' اس نے بندوق پھینک دی اور پھر وہ کلمے کا جواب دیتے ہوئے خدیجہ کے بائیں طرف پہنچ گیا۔ ان چاروں نے مل کر اسٹریچر کو جنازے کی طرح کاندھے پر اٹھالیا۔

اسی وقت کہیں سے ایک فائر ہوا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ خدیجہ کے ساتھ اسٹریچر اٹھانے والا سپاہی زمین کی طرف گر رہا تھا۔ جنازہ ایک طرف جھک رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی پھر ایک بار آواز بلند ہوئی۔ "کلمہ شہادت۔"

اور میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ خدیجہ نے اسٹریچر کے دونوں دستے اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال لئے تھے اور قبرستان کی طرف چل پڑی تھی۔

☆======☆======☆

کڑوے بیج

اس عاقبت نااندیش شخص کی داستانِ عبرت جو
کانٹے بیج کر پھولوں کے اُگنے کی امید رکھتا تھا۔
دوسروں کے گھروں میں آگ بانٹنے والے کے جب
اپنے گھر تک آگ پہنچتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟
اس گھر کی المناک کہانی جس کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی تھی۔

وال کلاک کی میوزیکل ٹن ٹن ٹن۔ ٹرن ٹن ٹن نے خاموشی کو بڑے دھیمے انداز میں مرتعش کردیا۔ میں جو دکان میں بیٹھا سالانہ حساب کتاب چیک کر رہا تھا' چونک کر کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ نصف شب گزرنے والی تھی اور کام تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں تھے۔ صبح سے ہی سرد ہواؤں نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مال روڈ کی دکانیں سرے سے کھلی ہی نہیں تھیں اور جو کھلی تھیں وہ خریداروں کے ہرجائی پن کی وجہ سے بند ہوگئی تھیں۔ میری دکان مین روڈ پر تھی۔ میں نے بھی عصر کے بعد سوائے ایک شٹر کے تمام شٹر بند کروا دیئے تھے اور ملازموں کو چھٹی دے دی تھی۔

سوا بارہ بجے دکان کا حساب کتاب مکمل ہوگیا۔ میں مین سوئچ آف کر کے باہر نکل آیا۔ رات سوچکی تھی' ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ اکا دکا گزرنے والی گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے شٹر بند کیا تو خاموشی کرب ناک انداز میں چیخ اٹھی۔ کافی دیر تک اس چیخ کی گونج سنائی دیتی رہی۔ میں نے ذرا سا جھک کر تالا لگایا پھر کھڑا ہو کر مسجد شہدا کی طرف دیکھنے لگا۔

میری کار مسجد کے سائے میں کھڑی تھی کیونکہ دکان کے سامنے پارکنگ ممنوع تھی اس طرف چلنے سے پہلے اچانک ہوا کا ایک سرد جھونکا مجھے کپکپا گیا۔ اس کی سیٹی جیسی آواز سماعت سے ٹکرا کر دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لئے اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے چند افراد بیٹھے سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھے۔

دن کے وقت یہ بس اسٹاپ مسافروں کی انتظار گاہ ہوتا تھا لیکن اندھیرا ہوتے ہی

اس پر نشہ کرنے والوں کا قبضہ ہوجاتا تھا۔ میں نے ادھر دیکھا وہ دو اور چار کی ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنے اوپر کھیس ڈال رکھا تھا۔ سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا صاف طور سے کھیس کے اندر ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتا نظر آرہا تھا۔ یہ حقیقت بڑی غور طلب ہے کہ آدمی' آدمی سے چھینتا ہے' ایک دوسرے کا حق مار کر اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ صرف ایک نشہ ایسی چیز ہے جسے وہ بڑی بھائی چارگی سے بانٹ کر کھاتا پیتا ہے۔

میری توجہ اچانک دوسری سمت مبذول ہوئی ایک ٹیکسی بڑی تیزی سے آکر ریگل چوک پر رک گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک جھٹکے سے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھل گیا تھا اور ایک گٹھڑی نما چیز باہر آکر گر پڑی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ موسم سرما کی اوس اتنی دبیز ہوگئی تھی کہ ہر شے دھندلا گئی تھی۔ ٹیکسی کا دروازہ بند ہوگیا تھا' وہ دوبارہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔

مجھے خطرے کا یقین ہوگیا۔ پہلی بات یہی سمجھ میں آئی کہ ٹیکسی میں مجرمانہ ذہن کے لوگ تھے۔ وہ حرام کا مال یا کوئی غیر قانونی سامان گاڑی سے باہر پھینک کر گئے ہیں۔ میں فوراً ہی اپنی کار کی طرف جانے لگا۔ پولیس' تھانے سے ملوث ہونے والے کسی بھی معاملے سے دور رہنا دانش مندی ہے۔ کار کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ ایک انسانی کراہ سنائی دی۔ اس کراہ میں نسوانیت تھی۔

اگر کسی مرد کی کراہ سنائی دیتی تو شاید میں نہ رکتا۔ مرد کی فطرت ہے کہ وہ عورت کی آہٹ پر تھم جاتا ہے۔ جہاں ہوتا ہے وہیں جم جاتا ہے۔ گزشتہ روز قرطبہ چوک پر ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ اسی طرح راہ زنوں نے ایک معصوم بچے کو سڑک کے کنارے پھینک دیا تھا اور دور ایک جگہ جا کر چھپ گئے تھے۔ ایک شخص اس بچے سے ہمدردی کرنے اس کے قریب گیا تو پتا چلا' وہ تو نوزائیدہ ہے اور مردہ ہے۔ اسے پھینکنے والوں نے اس شخص کو گھیر کر اسے لوٹ لیا۔ اس کی جدوجہد اور چیخ و پکار سے محفوظ رہنے کے لئے اسے قتل کر دیا۔ یوں وہ بیچارہ ہمدردی میں مارا گیا۔

میں اس واقعے کو یاد کر کے تذبذب میں پڑ گیا لیکن ایک ایک قدم ٹھہر ٹھہر کے اس سمت بڑھتا رہا۔ مصیبت' آفت' دشواری اور بدبختی سب ہی مونث ہوتی ہیں اور اپنی

طرف کھینچتی ہیں۔ ویسے میں نے اپنا پستول بغلی ہولسٹر سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور یوں بھی گھر جانے کے لئے گاڑی تک پہنچنا ضروری تھا اور گاڑی تک پہنچنے کے لئے ریگل چوک کراس کرنا بھی لازمی تھا۔ اسی وقت ایک تکلیف دہ سی آواز سنائی دی۔ "پلیز ہیلپ می۔"

میں بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس کی صدا بتا رہی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ کسی خون کے رشتے سے بڑھتا تو میرا ہوتا' کسی محبت کے جذبے سے بڑھتا تو دل کی دھڑکنوں کو چھو لیتا لیکن اس ہاتھ سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ریگل چوک پر ٹریفک کے اشارے کی طرح تھا کہ مجھے کون سا موڑ مڑنا ہے یا میں اسے کہاں لے جاؤں گا۔ اس تجسس میں' میں نے ہاتھ تھام لیا۔ عجیب سی کشش تھی۔ اسے تھام کر سردی میں گرمی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کون تھے؟ تم کون ہو؟"

اس نے دوسرے ہاتھ کی بند مٹھی بھی میری طرف کر کے کھول دی۔ اس کی گوری اور نرم ہتھیلی پر ایک چھوٹی سی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرے پرس میں ایک سرنج ہے' پلیز ٹیکہ لگا دو۔"

میرے ابو ایک ڈاکٹر ہیں۔ ان کا اپنا کلینک ہے۔ جہاں میں نے بعض اوقات کمپاؤنڈری کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ اس لئے دواؤں اور انجکشنوں سے واقف ہوں۔ میں نے وہ شیشی اٹھا لی پھر اس پر نام پڑھتے ہی حیرانی سے پوچھا۔ "تم۔ تم نشہ کرتی ہو؟"

"ہاں۔ لیکن نشہ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ مجھے دو گھنٹے سے بہلاتے رہے' مجھے نوچتے کھسوٹتے رہے۔ وہ مطلب کے بندے تھے۔ کش پر کش لگانے کے بعد سگریٹ کے ٹوٹے کی طرح پھینک کر چلے گئے۔ خدا نے تمہیں فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ پلیز میرا کام کر دو۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "فرشتے کا کام تو زندگی دینا ہوتا ہے لیکن تم موت مانگ رہی ہو؟"

"یہ نشہ پہلے موت ہوتا ہے بعد میں زندگی کی اہم ضرورت بن جاتا ہے۔ میری جان نہیں بچاؤ گے تو میرے قاتل کہلاؤ گے۔"

"ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔ بار بار اذیت میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے آدمی مر جائے۔"

"کیوں مر جائے؟ کیسے مرد ہو۔ ایک عورت کو زندگی دینے کا کام نہیں کر رہے ہو' مرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر میرا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "میری طلب تمہارے گریبان تک پہنچ گئی ہے۔ اپنی عزت اور میری جان بچالو۔"

میں بری طرح پھنس گیا' اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا۔ خدا کا شکر تھا کوئی نہیں تھا۔ ہوگا بھی تو اوس کے دھندلکے میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا گریبان چھڑایا پھر اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ ٹیکہ لگوانے کے لئے التجائیں کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میری گاڑی میں چلو۔ میں یہاں کوئی الزام اٹھانا نہیں چاہتا۔"

وہ میرے سہارے چلتی ہوئی گہری سانسیں لیتی ہوئی بولی۔ "گاڑی کتنی دور ہے۔ میں ڈوب رہی ہوں۔ پلیز مجھے بچالو۔"

"میرے ابو ڈاکٹر ہیں۔ میں ان سے تمہارا علاج کراؤں گا' تمہیں ایک نئی زندگی دوں گا۔"

"پہلے وقتی زندگی دے دو۔ تم نے مجھے اور چند منٹ اسی حالت میں رکھا تو میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگوں گی۔"

"میری گاڑی چند قدموں کے فاصلے پر پارک ہے۔ وہیں ٹیکہ لگاؤں گا۔"

وہ لڑکھڑا گئی' میری بانہوں میں جھول گئی۔ میرے دل میں آیا اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ کوئی پولیس والا دیکھ لیتا تو یہ معاملہ طول پکڑ لیتا۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ کمبل گرم ہوتا ہے۔ وہ لپٹ جائے تو اس کی آنچ پیچھا چھڑانے نہیں دیتی۔ میں نے کار تک جلدی پہنچنے کے لئے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا پھر تیزی سے چلتا ہوا کار کے پاس آیا' اسے زمین پر کھڑا کیا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر ٹھونس دیا۔

میں کار کے پچھلے حصے سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ اس نے پچھلی سیٹ سے آگے کو جھک کر اپنے گورے چکنے بازو کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ٹیکہ لگاؤ۔“

میں کار کی اندرونی مدھم روشنی میں اس کا بازو دیکھتے ہی حیرت سے بولا۔ ”او مائی گاڈ! تمہارا تو پورا بازو چھلنی ہے۔ کیا پیدا ہوتے ہی نشہ کرنے لگی تھیں؟“

میری بات میں کوئی مزاح کا پہلو نہیں تھا مگر وہ مسکرانے لگی لیکن وہ مسکراہٹ لمحاتی تھی پھر کرب کی صورت میں چہرے پر پھیل گئی۔ اس کا ایک ہاتھ انجکشن کی طلب میں میری طرف تھا دوسرا ہاتھ اس کے منہ تک چلا گیا۔ اس نے کہا۔ ”پلیز وقت ضائع نہ کرو۔“

واقعی اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ بعض حالات میں مریض کی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنا یا ایک خلاف عقل قدم اٹھانا لازمی ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے دوا سرنج میں بھر کر سوئی اس کی ایک نس میں داخل کر دی۔

سوئی کے گھستے ہی اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے بند ہوئیں پھر کھل گئیں۔ وہ کچھ دیر تک مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر پیچھے ہو کر سیٹ کی پشت سے ٹک گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے عقب نما آئینے کا رخ بدلا تو وہ آئینہ دل میں اتر آئی۔ پچھلی سیٹ پر آدھی لیٹی ہوئی تھی' آدھی بیٹھی ہوئی تھی۔ آدھی ہوش مند تھی' آدھی مدہوش تھی۔ آدھی ڈارلنگ تھی اور آدھی وارننگ تھی کہ یہ کس کا مال ہے؟ کہاں لے جارہے ہو؟ کوئی پولیس والا نہیں ٹکرایا تھا۔ مگر ٹکرا سکتا تھا۔

اس کے گلابی ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ نیم مدہوشی میں اپنے اندر کے کرب کو بڑبڑاہٹ میں پیش کر رہی تھی۔ کرب کسی نوعیت کا ہو اس میں بناوٹ نہیں ہوتی۔ سچائی ہوتی ہے اور وہ پوری سچائی سے بول رہی تھی۔

☆======☆======☆

”مجھے تو یوں لگتا ہے' میں نے نشہ خود نہیں کیا یہ خود بخود میرے اندر داخل ہو گیا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' ہر سُو نشہ ہی نشہ دیکھا ہے۔ ابا کوئی کام نہیں کرتا تھا لیکن راتوں رات امیر بننے کے ہتھکنڈوں کی فکر میں رہتا تھا۔ اماں بھی اپنے آپ میں

نہیں تھی۔ نچلے طبقے میں رہ کر اونچے لوگوں کی برابری کرنا چاہتی تھی۔ اسے ہر ماہ نت نئے فیشن کے ملبوسات سلوانے کا شوق تھا' قیمتی زیورات سے خود کو نمایاں رکھنے کا جنون تھا۔ وہ ہر وقت ابا سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ان کے روز روز کے لڑائی جھگڑے سے میں تو کیا اڑوس پڑوس والے بھی پریشان رہتے تھے۔ انہی دنوں ہمارے پڑوس میں ایک پرائیویٹ کالج کے پروفیسر آ کر آباد ہوئے۔ وہ بہت اچھے تھے۔ انہوں نے اپنے کالج میں سفارش کر کے ابا کو چاٹ کی چھابڑی لگوا دی۔

چھابڑی لگانے سے ابا کے خواب پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس نے کئی بار یہ کام چھوڑنے کی کوشش کی مگر پروفیسر صاحب کے سمجھانے سے اسے جاری رکھا۔ پھر اچانک ہی انقلاب سا آ گیا۔ وہ اس کام پر خاص توجہ دینے لگا۔ پچاس روپے کی لاگت سے لگائی ہوئی چھابڑی سے دو سو روپے کا منافع ہونے لگا۔ اماں نے خوش ہو کر کہا۔ ”لگتا ہے اللہ مہربان ہو گیا ہے۔ اب تو گھر میں تینوں وقت روٹیاں پکنے لگی ہیں' پیسے بھی بچنے لگے ہیں۔“

”ارے رشیدہ کی ماں تُو روٹی کی بات کرتی ہے اب تو مرغ بریانی پکا کرے گی۔“

”اس کا مطلب ہے میں ہر مہینے کپڑے بھی سلوایا کروں گی۔“

ابا ایک دم سے سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”زیادہ بکواس نہ کر۔ میرے پاس تیری فضولیات کے لئے پیسے نہیں ہیں۔“

وہ پاؤں پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک ماہ بعد ہی ابا کی سر پر اٹھانے والی چھابڑی تین پہیوں والی ریڑھی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ابا نے ریڑھی لے جانے لانے اور چاٹ فروخت کرنے کے لئے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے رکھ لئے۔ وہ بچے ریڑھی دھکیلتے ہوئے آگے آگے چلتے تھے۔ وہ پیچھے چلتے ہوئے خود کو شہنشاہ سمجھتا تھا لیکن اماں کو کبھی ملکہ عالیہ بننے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کر رکھتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی تھی۔ ابا کے تیور ہی کچھ سے کچھ ہو گئے تھے۔ اب وہ چھابڑی والا نہیں چاٹ فروش کہلاتا تھا۔

پروفیسر صاحب اس کی ترقی پر بہت خوش تھے انہوں نے مزید کوشش کر کے ابا کو اندر ہی ایک اسٹال بنوا دیا۔ اب صبح ریڑھی پر مال جاتا تھا اور بکتا اسٹال پر تھا۔ ایک دن وہ

صبح صبح ریڑھی تیار کر کے اپنے اجرتی لڑکوں کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نو بجے تک نہ آئے۔ چنانچہ ان کو پکڑ کر لانے کے لئے وہ بجی سجائی ریڑھی چھوڑ کر چلا گیا۔ میں عام لڑکوں کی طرح چاٹ کھانے کی شوقین تھی' خاص کر کھٹائی اور مصالحہ تیز۔ میں نے باورچی خانے سے ایک پلیٹ لی پھر اس میں سے چاٹ نکالی دو چمچے مصالحہ چھڑک کر ایک ڈونگا کھٹائی کا پانی ڈال دیا اور کمرے میں آ گئی۔ پھر اسی سے چھپ کر خوب مزے لے لے کر کھانے لگی۔

میں چھابڑی کی بچی ہوئی چاٹ اکثر کھاتی رہتی ہوں۔ مگر اتنا مزا کبھی نہیں آیا۔ جیسا اس روز آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد مجھ میں عجیب سا سرور پیدا ہونے لگا۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔ میں سیکنڈ شفٹ کے اسکول میں دسویں جماعت میں تھی اس روز اتنی غنودگی طاری ہوئی کہ اسکول نہ جا سکی۔ شام تک بستر پر پڑی سوتی رہی اور خوابوں کی دنیا میں جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی۔ ایک آدھ بار اماں اٹھانے بھی آئی لیکن اس کی آوازیوں لگی جیسے اندھے کنوئیں سے پکار رہی ہو۔

اگلے دن میں نے دوبارہ چاٹ چرا کر کھائی مگر اس میں وہ لذت نہیں تھی۔ نہ مجھ پر سرور طاری ہوا نہ ہی نیند آئی۔ مجھ میں تجسس پیدا ہو گیا آخر اِس چاٹ میں اور اُس چاٹ میں فرق کیوں ہے؟ تجسس کسی بھی بات کا ہو' آدمی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ میں ہر روز چاٹ چرا کر کھاتی تھی' مصالحہ بھی زیادہ سے زیادہ ڈالتی تھی مگر وہ لذت پھر نہ ملی۔ میں حیرانی سے سوچتی تھی کہ آخر اس روز مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری زبان بے حس ہو گئی تھی یا چاٹ بدل گئی تھی۔ ایک دن ابا نے ریڑھی کو پوری طرح سجانے کے بعد اماں کو آواز دی "اے رشیدہ کی ماں۔ ذرا اسپیشل شربت کی بوتل لے آ۔"

اماں کمرے کے اندر سے ایک شیشے کی بوتل لاتے ہوئے بولی۔ "کتنی بار کہا ہے رات ہی مسالے میں ملا لیا کرو اسے' الگ رکھنا کیا ضروری ہے؟"

ابا نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے زیادہ مشورہ نہ دیا کر' اپنے کام سے کام رکھا کر۔"

اس نے چھیننے کے سے انداز میں بوتل اماں کے ہاتھ سے لے لی' اس میں سے دو چمچہ شربت نکال کر تسلے میں ڈال دیا جس میں پہلے سے دوسرا مصالحہ موجود تھا۔ پھر مرتبان

اماں کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "لے اسے لے جا کر احتیاط سے رکھ دے۔"

میں کمرے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈونگے کی مدد سے مرتبان کی کھٹائی اچھی طرح مکس کرنے لگا۔ میری نظر ابا پر کم اماں پر زیادہ تھی کیونکہ جس کی تلاش تھی وہ چیز اماں کے ہاتھ میں تھی' وہ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیوں اس کے پیچھے کمرے تک آئی ہوں۔ ابا نے احتیاط سے رکھنے کو کہا تھا' اس نے بے پروائی سے سامنے ہی طاق میں رکھ دیا پھر دوسرے کمرے میں پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

میں ابا کے پاس آئی وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے آواز دے کر کہا۔

"ابا ایک پلیٹ چاٹ تو دے جا بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔ اماں غصے میں ہے لگتا ہے آج ناشتا نہیں ملے گا۔"

اس نے انکار نہیں کیا۔ پلیٹ بھر کر دی مگر کھٹائی کا پانی نہیں ڈالا۔ میں نے کہا۔

"کھٹائی تو ڈال دے۔"

"یہ تیرے کھانے کی نہیں ہے تو باورچی خانے کے پتیلے سے نکال لے۔"

ابا مشورہ دے کر چلا گیا۔ میں پلیٹ لے کر باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ میں نے پہلے ایک چمچہ مصالحہ ڈالا اس پر ایک چمچہ بھر کر کھٹائی کا پانی ڈالا مگر مزا نہیں آیا۔ پھر کھٹائی ایک کپ میں لے کر پینے لگی دوسرا چمچہ مصالحہ ڈالا۔ پھر مزا نہ آیا تو میں کمرے میں آئی جہاں بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے تھوڑا سا شربت نکال کر پلیٹ میں ڈال کر اسے اچھی طرح چاٹ میں مکس کیا اس کے بعد ایک چمچ بھر کے منہ میں رکھا تو کھوئی ہوئی لذت واپس مل گئی۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک پلیٹ میں کتنا شربت ڈالنا چاہئے لیکن ابا نے جتنے پانی میں صرف دو چمچ شربت ملایا تھا اس کے مطابق اس پلیٹ میں چند قطرے بہت تھے مگر میں نے چند قطروں کے بجائے آدھا چمچ ڈال لیا جس کا اثر یہ ہوا کہ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں اگلی صبح تک بستر پر پڑی رہی۔ ابا نے جگایا تو اس وقت بھی آنکھوں میں خمار تھا اس نے محاورتاً کہا۔ "کیا بھنگ پی رکھی ہے؟"

"نہیں ابا۔ میں نے تو بس تیری چاٹ میں شربت زیادہ ڈال کر کھا لیا تھا۔"

"کون سا شربت؟"

"وہی جو بوتل میں رکھا ہوا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے کمبخت؟ تُونے اس بوتل کو ہاتھ کیوں لگایا؟"

"کھانے کی چیز ہے اس لئے ہاتھ لگایا' آخر دوسرے بھی وہ شربت چاٹ میں ڈال کر کھاتے ہیں۔"

ابا نے اماں کو آواز دے کر کہا۔ "ادھر آ' دیکھ تیری بیٹی نے کیا گل کھلایا ہے۔ میں نے تجھے کہا تھا کہ اسپیشل شربت کی بوتل ایسی جگہ رکھنا کہ کسی کی نظر نہ پڑے؟ کسی کا ہاتھ نہ جائے پھر یہ کیسے پہنچ گئی؟"

اماں کیا جواب دیتی اسے۔ اس نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے بات بنائی۔ "یہ اب بچی نہیں رہی کہ سب سے اوپر والی طاق پر رکھوں تو اس کا ہاتھ نہ پہنچے۔ بہرحال آئندہ تالے چابی میں رکھوں گی۔"

وہ دونوں مجھے بستر پر چھوڑ کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں سوچا کرتی تھی آخر ابا کے پاس ایک دم سے اتنی دولت کیسے آنے لگی ہے؟ چھابڑی اسٹال میں کیسے بدل گئی ہے؟ ابا ایک معمولی چاٹ بیچنے والے سے اسٹال کا مالک کیسے بن گیا ہے؟ اب سمجھ میں آرہا تھا یہ سب اس اسپیشل شربت کا کمال تھا جو مجھے نئی لذتوں سے آشنا کررہا تھا۔

یقیناً گاہک پروانوں کی طرح اسٹال پر آتے ہوں گے تب ہی صبح بھر کر جانے والا پتیلا شام کو خالی ہوجاتا تھا اور ابا کی جیبیں نوٹوں سے بھر جاتی تھیں۔

ابا کی کمائی سے گھر ٹھیک چل رہا تھا۔ گھر کی اور میری ضرورتیں پوری ہورہی تھیں۔ البتہ اماں کی خواہشات کا دم گھٹتا رہتا تھا۔ ایک روز وہ بولی۔ "میں کہیں نوکری کروں گی۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔"

ابا نے کہا۔ "مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں گھر کے اخراجات کے علاوہ تجھ پر بھی خرچ کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ تُونے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔"

"کیا تُو بھی یہی چاہتا ہے کہ میں دوسروں کی غلامی کروں؟"

"غلامی نہیں بزنس' میرے جیسا بزنس کرے گی تو ہماری آمدنی دگنی ہوجائے گی۔"

"ہائے! پھر تو میں ریشمی کپڑوں اور سونے کے زیوروں میں چھپ جاؤں گی۔"

"کیا دلہن بن کر پھر کسی سے نکاح پڑھوائے گی۔ ہمیشہ اپنے کو جوان سمجھتی رہتی ہے۔ بیٹی جوان ہوگئی ہے' اس کے لئے سوچا کر۔ جوان لڑکی کے گھر میں سونے چاندی کی چمک ہو تو رشتے جلدی آتے ہیں اور اچھے آتے ہیں۔"

"میں ریڑھی کہاں لگاؤں گی؟"

"جس کالج میں میرا اسٹال ہے' اسی کے قریب لڑکیوں کا بھی کالج ہے' تُو وہاں ریڑھی لگانا۔ وہاں کے چوکیدار اور چپڑاسیوں سے میری اچھی خاصی دوستی ہے' تجھے آسانی سے جگہ مل جائے گی۔"

تین دن بعد ہی ابا واپسی پر ایک اور ریڑھی لے آیا۔ اس کے ساتھ ایک بارہ برس کا لڑکا تھا۔ یوں اماں بھی کاروبار سے لگ گئی۔

ابتدا میں یہ کام مایوس کن دکھائی دیا پھر کھانے والوں کو اس کی لت پڑنے لگی۔ میں دس جماعتیں پاس کرچکی تھی۔ نیا سال شروع ہوتے ہی میرا داخلہ اسی کالج میں ہوگیا جہاں اماں ریڑھی لگایا کرتی تھی لیکن میرے لئے مشکل ہوگئی تھی۔ میرے اور نشہ کے بیچ میں اماں رکاوٹ بن گئی۔ جب سے اس نے ابا کے کاروبار کو اپنایا تھا۔ شربت کی زیادہ حفاظت کرنے لگی تھی۔ ہمارے گھر میں لکڑی کی الماری تھی جس میں ایک لاک ہوا کرتا تھا۔ اماں نے اس پر موٹی زنجیروں والی ایک اور کنڈی لگوا دی اس پر بڑا سا تالا لگانا شروع کر دیا۔ اگر میں کسی بہانے سے کالج سے چھٹی بھی کرلیتی تو نشہ ہاتھ نہیں آتا تھا اور کالج میں فروخت ہونے والی چاٹ کھانے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔ وہ طالبات کے سامنے جھڑک کر کہتی تھی۔ "تجھے ڈاکٹر نے کھٹا کھانے سے منع کیا ہے' تیز مصالحے اور کھٹائی کا بھی پرہیز بتایا ہے۔ میں ماں ہوں اپنے ہاتھوں سے تجھے مرنے نہیں دوں گی۔"

اماں طالبات کو یہ باتیں سنا کر میرے چاٹ نہ کھانے کا جواز پیش کرتی تھیں اور میں کھانا چاہتی تھی۔ چند لڑکیوں کو سہیلیاں بنا کر انہیں روپے دیتی تھی۔ وہ اماں سے خرید کر لاتی تھیں۔ پھر ہم کہیں چھپ کر کھاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سہیلیوں سے جھگڑا

ہو جاتا تھا۔ میں نشہ کی خاطر انہیں مناتی تھی لیکن وہ نخرے دکھاتی تھیں۔ کبھی چاٹ لاکر کھلاتیں، کبھی محروم رکھ کر ترساتی تھیں۔ مجھے ان پر بڑا غصہ آتا تھا۔ کھانے کے لئے ان کے پاس اپنی رقم ہوتی تھی، میرے غصے سے ان کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ میرا ہی بگڑتا تھا۔ میں طلب میں بے چین ہو جاتی تھی۔ میرے پاس رقم ہوتی تھی۔ دکان میرے گھر کی تھی، بیچنے والی میری ماں تھی مگر مجھے چاٹ کی ایک چٹکی نہیں ملتی تھی۔

گھر سے کالج تک ریڑھی لانے والا لڑکا کوئی چودہ برس کا تھا، مجھ سے تین برس چھوٹا۔ لنڈے کا لباس پہنتا تھا جو قیمتی نظر آتا تھا۔ بات بات پر فلمی مکالمے بولتا تھا اور گانے گایا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "چھیمے! دوستی کرے گا؟"

وہ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولا۔ "کتنی ہی لڑکیاں مجھ سے دوستی کرتی ہیں مگر مطلب سے دوستی کرتی ہیں تاکہ میں پلیٹ میں زیادہ چاٹ دیا کروں۔ کچھ ایسی ہیں کہ مجھ سے عشق کرنے لگی ہیں۔"

"یہ تیرے عشق کرنے کی عمر ہے؟"

"میں اپنے منہ سے کیا تعریف کروں۔ تم عشق کرکے دیکھ لو۔"

"ایک الٹا ہاتھ رسید کروں گی۔ منہ گھوم جائے گا۔ اماں تجھے کتنے پیسے دیتی ہے؟"

"روز کے چھ روپے۔"

"میں روز چار روپے دوں گی۔ اس طرح مہینے میں تین سو روپے کمایا کرے گا۔"

"سمجھ گیا۔ اماں چاٹ کھانے نہیں دیتی اس لئے میں چھپا کر تمہاری کلاس میں لایا کروں۔"

"ہاں تُو بہت سمجھدار ہے۔"

وہ کبھی کلاس میں کبھی کالج کی چھت پر چاٹ پہنچانے لگا لیکن ایک ہفتہ بعد ہی نخرے دکھانے لگا جبکہ میں اسے نقد رقم دیا کرتی تھی۔ ایک روز مجھے چاٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔

"آسینے نال لگ جا ٹھاہ کرکے۔"

میں نے گھور کر پوچھا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تھپڑ ماروں گی۔"

اس نے پلیٹ پیش کرتے کرتے واپس کھینچ لی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لا ادھر۔

نہیں تو ماروں گی۔"

"مارے گی تو پھر کبھی نہیں لاؤں گا۔"

میں نے خوشامد کی وہ بولا۔ "صرف چار روپے روز سے کام نہیں چلے گا۔"

"تو پھر کتنے لے گا؟"

"رقم نہیں بڑھاؤں گا مگر تجھے ہاتھ لگاؤں گا۔"

"تجھے شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے۔ میں تجھ سے بڑی ہوں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس سے پلیٹ چھیننے لگی۔ اسی چھینا جھپٹی میں آدھی پلیٹ گر پڑی وہ میرے ہاتھوں میں پلیٹ دے کر بولا۔ "یہ لے مگر کل کیا ہوگا؟ میں لاؤں گا نہیں تو چھینے گی کیا؟"

اس وقت طلب پوری ہو رہی تھی۔ میں نے پرواہ نہیں کی۔ دوسرے دن اس نے چیلنج کے مطابق سپلائی روک دی۔ میں کبھی چھت پر کبھی نیچے آتی جاتی رہی اسے اشارے کرتی رہی۔ وہ مجھے دیکھتا تھا اور نظرانداز کرتا تھا۔ وہ آخری کلاس کے وقت ایک ٹرے میں کئی پلیٹیں رکھ کر پرنسپل کے کمرے کی طرف لے جانے لگا۔ میں نے اسے راہداری میں پکڑ کر غصہ سے کہا۔ "اے اتنے نخرے کیوں کرتا ہے؟"

وہ اکڑ کر بولا۔ "غصہ کرے گی تو اماں سے جاکر بول دوں گا۔"

وہ جانے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے خوشامد کی۔ "دوستی کرلے۔ میں ابھی کلاس میں نہیں جاؤں گی۔ اوپر چھت پر انتظار کروں گی۔ آئے گا ناں؟"

وہ بولا۔ "کل رات میں نے جو فلم دیکھی ہے اس میں بھی ہیروئن اپنے ہیرو کو چھت پر بلاتی ہے۔ ہیرو کہتا ہے دنیا چھت پر چاند دیکھنے آتی ہے۔ تم بھی دکھاؤ گی تو آؤں گا۔ ہیروئن شرما کر بھاگ جاتی ہے۔ تم بھی شرما کر جاؤ۔ میں ابھی مال مصالحے کے ساتھ آرہا ہوں۔"

وہ آگے جاکر پرنسپل کے کمرے میں غروب ہو گیا۔ میں چھت پر آگئی۔ کسی کو دولت کی پڑی رہتی ہے، کسی کو شہرت کمانے کا شوق ہوتا ہے، کسی کو محبوب کا انتظار ہوتا ہے۔ مجھے سرور حاصل کرنے کی بے چینی تھی۔ وہ ایک پلیٹ لے آیا۔ پلیٹ میرے ہاتھ میں

دے کر مجھے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ میں اسے گالیاں دے رہی تھی اور چاٹ کے مزے لے رہی تھی۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک پہلو ہے کہ جہاں لذت ملتی ہے وہاں نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر نفرت ہو تو وہ رسمی یا نمائشی ہوتی ہے۔ چھیپے سے میری نفرت بھی یونہی سی تھی۔ چاٹ کی لذت نے پہلی بار میری حیا کو گہنا دیا تھا۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کیا تھا کہ دن کا وقت ہے کالج کا ماحول ہے' وہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ بس ذرا ہاتھ لگا رہا ہے۔ بچہ ہے بہل رہا ہے۔ انگلی سے پنجے تک پہنچے گا تو چھت سے نیچے پھینک دوں گی۔

ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ جب وہ ہماری عمر کے تھے تو بڑے معصوم اور نادان ہوا کرتے تھے۔ ہم اپنی عمر سے زیادہ چالاک اور ہوس ناک ہیں۔ ہمیں جو کتاب پڑھنے کو ملتی ہے اس میں نشہ ہوتا ہے' جو فلم دیکھنے کو ملتی ہے اس میں نشہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی دنیا کی نشہ آور ہواؤں میں سانسیں لے رہے ہیں۔

میری تو یہ حالت تھی۔ پتہ نہیں اماں کی چاٹ کھانے والی دوسری طالبات اور ابا کی چاٹ کھانے والے طلبا کس عالم میں رہتے ہوں گے اور طلب پوری کرنے کے لئے کیسی کیسی بے حیائی سے گزرتے ہوں گے۔

طالبات کے شوق کا عالم یہ تھا کہ کالج جمعہ کو بند ہوتا تھا۔ وہ جمعرات کو پارسل پیک کروا کر چاٹ گھر لے جاتی تھیں اور اسے فریج میں رکھ کر کھاتی تھیں۔ جمعہ کو تعلیم کا ناغہ ہوتا تھا چاٹ کا ناغہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز سیکنڈ ایئر کی ایک طالبہ نے امی سے کہا۔ "ماسی! کل میری سالگرہ ہے ہم نے کھانوں میں چاٹ کا بھی آئیٹم رکھا ہے۔ کل تم سارا سامان لے کر ہماری کوٹھی میں آجانا۔ جتنی پلیٹیں کھائی جائیں گی اتنا بل تمہیں مل جائے گا۔ یہ ایک ہزار ایڈوانس رکھو۔"

اماں خوش ہوگئی۔ جب بھی کوٹھیوں سے آرڈر آتا تھا' اس روز دو چار ہزار کی فاضل آمدنی ہوا کرتی تھی۔ ابا ہر تقریب میں جانے والی چاٹ کی کھٹائی اور مسالحہ بڑی احتیاط سے بناتا تھا تاکہ نئے کھانے والوں کو ناقابل فراموش لذت بھی ملے اور کسی کو نشہ آور شے کی ملاوٹ کا شبہ بھی نہ ہو۔

انسان ہو' حیوان ہو' پودا ہو یا خواہش ہو' ہر شے بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ درخت کبھی سکڑ کر پودا نہیں ہوتا۔ پودا رفتہ رفتہ درخت بنتا ہے۔ اسی طرح میری طلب بڑھ رہی تھی۔ میں چاٹ میں شربت کی مقدار بڑھاتی تھی لیکن ایک آدھ مہینے میں وہ مقدار کم لگتی تھی۔ میرا بدن مزید نشہ کے لئے پکارتا تھا اور میں مقدار بڑھا دیتی تھی۔

اماں ابا کا ریڑھا اور اسپیشل شربت اب مجھے کم پڑ رہا تھا۔ میں ایسا سرور چاہتی تھی جو ہمیشہ طاری رہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ نشہ کوئی سا بھی ہو' وہ اپنی مخصوص مدت کے بعد اتر جاتا ہے اور میں اتارنا نہیں چاہتی تھی ہمہ وقت بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں رہتی تھی۔ ایک رات شدت سے گھٹن کا احساس ہوا تو میں تازہ ہوا کے لئے چھت پر آگئی۔

اندھیری رات تھی پھر بھی ستاروں کی روشنی میں آس پاس کے مکانات واضح تھے۔ ساتھ والی چھت کی پانی کی ٹینکی کے پیچھے ایک دھیمی سی روشنی جھلمل کر رہی تھی جیسے چراغ جل رہا ہو۔ کسی نے ماچس کی تیلی جلائی تھی۔ اس کے ننھے سے شعلے کی جھلمل تھی جو بعد میں بجھ گئی۔ میں ادھر غور سے دیکھنے لگی۔ ادھر محدود سا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔ کوئی سگریٹ کے کش لگا کر دھواں چھوڑ رہا تھا۔ پھر کسی نے سرگوشی میں پکارا۔ "رشیدہ!"

میں پہچان گئی۔ وہ اویس تھا۔ ہمارے پڑوسی تھانیدار کا اکلوتا بیٹا۔ ان سے ہماری رشتے داری نہیں تھی لیکن رشتے داری سے بڑھ کر دوستی تھی۔ پولیس اور مجرم کا رشتہ خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اویس کا باپ قیس محمد میرے ابا کے دھندے کی سرپرستی کرتا تھا اور ابا اس کی جیب خالی نہیں ہونے دیتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "اویس! وہاں کیا کر رہے ہو؟"

ہماری چھتوں کے درمیان تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ میرے قریب دیوار کے اوپر آکر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "وہ تمہارا ملازم چھیپا کہہ رہا تھا تم نشہ کرتی ہو؟"

میں نے غصے سے کہا۔ "وہ کتا مجھے بدنام کرتا ہے۔ میں اس سے سمجھ لوں گی۔"

"بگڑتی کیوں ہو۔ میں بھی نشہ کرتا ہوں' یہ دیکھو۔"

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا پھر سارا دھواں میرے منہ پر پھونکنے لگا۔ پہلے تو مجھے ناگوار سا لگا مگر اس کی بو میں عجیب سی کشش تھی۔ وہ بولا۔ "اس کا ایک کش لگاؤ گی تو چاٹ کو بھول جاؤ گی۔ لو ایک کش لگاؤ۔"

میں چھت کے فرش پر دیوار سے لگ کر چھپنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ "کوئی دیکھ لے گا تو پورے محلے میں شور مچ جائے گا۔"

وہ بھی دیوار سے اتر کر میرے پاس بیٹھ کر بولا۔ "اتنی سردی میں کوئی چھت پر نہیں آتا۔ لے پھر سگریٹ' ایک سُوٹا لگا۔"

میں نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن اتنی معلومات تھی کہ سگریٹ کے ذریعے چرس اور ہیروئن وغیرہ کا نشہ کیا جاتا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیا وہ بولا "آہستہ آہستہ کش لگانا۔ نہیں تو کھانسنے لگے گی۔"

میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑا تھوڑا سا کش لگانے لگی۔ آہ! کیا بتاؤں مجھے سرور کا کیسا خزانہ مل گیا تھا۔ میں کئی ماہ سے اسی کے لئے جیتی اور مرتی' اور مرتی اور جیتی رہی تھی۔

اویس نے کہا۔ "بس کر اب مجھے دے۔"

میں نے سگریٹ والا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں اس کی قیمت لے لے۔ یہ نہیں دوں گی۔"

میں نے سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر نشیلے دھوئیں کو کھینچا۔ اویس نے مجھے کھینچ لیا۔

طلب اپنی اپنی ہوتی ہے۔ نشہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ میں اویس کے لئے نئی تھی۔ ہیروئن کا چسکا میرے لئے نیا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس ایسا سگریٹ ہوتا ہے تو میں پیدا ہوتے ہی تمہارے پاس چلی آتی۔"

"اب آجایا کرو' روز پلاؤں گا۔"

"یہ تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟"

"چھاپے مارنے کے بعد افیون' چرس اور ہیروئن وغیرہ کا ذخیرہ تھانے پہنچتا ہے۔ آدھا ذخیرہ سرکاری اور اخباری حساب میں جاتا ہے' آدھا پولیس والوں کے ہاتھ آتا ہے

میں اپنے ہی گھر سے چرا کر ایک جگہ چھپا دیتا ہوں۔"

وہ بتا رہا تھا۔ جب باپ ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو بیٹا گھر میں تنہا موج کرتا ہے۔ ماں مرچکی تھی۔ دور کے رشتے دار کبھی کبھی آتے تھے۔ باپ رات کو گھر میں سوتا تو بیٹا چھت پر آجاتا تھا۔ خدا نے آدم کو جنت میں تنہا رہنے نہیں دیا پھر اسے چھت پر کیسے تنہا رکھتا۔ اس لئے میں آگئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "روز آؤ گی؟"

"میرا بس چلے تو تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ جاؤں۔"

"ایسی بھی کیا بے بسی ہے؟"

"اماں ابا کی آنکھ کسی وقت بھی کھل سکتی ہے۔ ہر رات کیسے آؤں گی؟"

اچھائی کے راستے ایک دو ہوتے ہیں' برائی کے ہزار راستے کھلے رہتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "میں افیون لا کر دوں گا۔ رات کو کھانے پینے کی کسی چیز میں ذرا سی افیون ملا کر کھلاؤ گی تو اماں ابا صبح تک خراٹے لیتے رہیں گے۔"

یہ تدبیر سن کر میں اس پر قربان ہونے لگی۔ وہ مجھے نشہ دے رہا تھا میں اسے معاوضہ دینے لگی۔ دکانداری میں لین دین نقد رہے تو گاہک اور دکاندار کو قیمت ملتی رہتی ہے۔

ہماری دوستی پکی ہوگئی۔ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ اویس کا باپ دن کی ڈیوٹی پر تھانے میں ہے تو بیماری کا بہانہ کرکے گھر میں رہ جاتی۔ اماں ابا اپنے دھندے کے لئے جاتے تھے۔ اویس مخصوص سگریٹ لے کر میرے گھر آجاتا تھا یا میں چھپ کر اس کے گھر پہنچ جاتی تھی۔

گناہ چھپ جاتے ہیں' نشہ نہیں چھپتا۔ ہمارے والدین اور دنیا والوں کے سامنے ہماری سلگتی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں بتاتی تھیں کہ ہم نشے میں ہیں اور نشہ نہ ہو تو ہماری بے چینی اور چڑچڑا پن ظاہر کرتا تھا کہ ہماری طلب پوری نہیں ہو رہی ہے۔

اماں نے مجھے مارا پیٹا۔ ابا نے مجھے گالیاں دیں۔ میں جواب میں یہی کہتی تھی۔

"ہزار گالیاں دو' ہزار جوتیاں مارو' مگر ایک سُوٹا لگانے دو۔"

اماں اور دو تھپڑ مار کر کہتی تھی۔ "اری بے حیا! بد ذات! ہم تجھے اسکول اور کالج میں پڑھاتے ہیں۔ کیا تُو نے کتابوں سے یہی سیکھا ہے؟"

"اماں! کالج میں پروفیسروں سے زیادہ تم پڑھاتی ہو۔ جو دوسروں کو پڑھاتی ہو' وہی تمہاری بیٹی نے بھی سیکھا ہے۔"

اماں نے کہا۔ "ہمیں الزام دیتی ہے۔ ٹھیک ہے ہم جرم کرتے ہیں لیکن کوئی مجرم اپنی بہن بیٹی کو جرم نہیں سکھاتا۔ باہر گناہ کرنے والا اپنے گھر میں گناہ نہیں پھیلاتا۔"

میں نے پوچھا۔ "جب آپ کی نظروں میں گناہ باہر جائز ہے تو گھر میں ناجائز کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ جوتا پہننے کے لئے اپنا پاؤں ہوتا ہے اور مارنے کے لئے دوسرے کا سر ہوتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے یہی ہوتا رہے گا۔ ہم سے بحث مت کر۔"

اماں ابا مجھے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے جو منشیات کے عادی لوگوں کے علاج کے لئے مخصوص تھا۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ میں نے کہا۔ "معائنہ کیا کرتے ہو۔ ایک سگریٹ دے دو' میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہیں ایسے انجکشن لگاؤں گا کہ تم چرس اور ہیروئن کے سگریٹ بھول جاؤ گی۔"

"جب بھولوں گی تب بھولوں گی' ابھی تو مجھے عذاب سے نکالو۔"

ڈاکٹر نے اماں ابا سے کہا۔ "آپ لوگ بھیڑ نہ لگائیں۔ ویٹنگ روم میں انتظار کریں۔"

وہ کمرے سے چلے گئے' ڈاکٹر نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر واپس آکر بولا۔ "تم حسین اور جوان ہو۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی دولت ہے جس سے تم ہیروئن کا ایک سگریٹ خرید سکو۔"

"میرے والدین چاٹ فروش ہیں۔ ہم دولت مند نہیں ہیں پھر بھی میں ایک سگریٹ کے پچاس روپے دے سکتی ہوں' سو روپے دے سکتی ہو۔"

"اپنی بولی لگاؤ' تمہاری طلب پوری ہو جائے گی۔"

اس نے جیب سے ایک ننھی سی شیشی نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اونچی سوسائٹی کا نشہ ہے۔ لڑکیاں سگریٹ پیتی بری لگتی ہیں۔ دولت مند گھرانے کی لڑکیاں ایسے

انجکشن اور سرنج اپنے پرس میں رکھتی ہیں۔ جب بھی طلب ہوتی ہے اپنے ہاتھ سے ٹیکہ لگالیتی ہیں۔ یہ سب سے آسان اور سب سے باوقار نشہ ہے۔"

میں نے اس کی طرف کانپتا ہوا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے دو۔ میری جان بچاؤ' مجھے ٹیکہ لگاؤ۔ تم ایک ٹیکہ لگاؤ گے اللہ تمہیں دس لاکھ ٹیکے لگائے گا۔"

"اس معاملے میں اللہ کو بیچ میں نہ لاؤ۔ یہ شیطانی دھندے ہیں۔ میں تمہارے والدین کو رپورٹ دوں گا کہ تم نارمل نہیں ہو۔ تمہیں اسپتال میں رکھنا ہو گا۔ یہاں رہو گی تو ہماری تمہاری مرادیں پوری ہوتی رہیں گی۔"

میں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے ٹیکہ لگاؤ۔ مجھے سُوٹا لگانے دو۔ نہیں تو میں چیخ چیخ کر دنیا والوں سے کہوں گی' تم ڈاکٹر نہیں بدمعاش ہو' میرا علاج نہیں کرتے ہو۔ ارے میرا بدن نوچ لو مگر ایک سُوٹا لگانے دو۔"

میں جنونی انداز میں چیخ رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "چیختی رہو۔ آواز باہر جارہی ہے' ثابت ہورہا ہے کہ تم نارمل نہیں ہو۔"

اس نے مجھے تھوڑی دیر چیخنے دیا پھر وہ ٹیکہ لگادیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے مردہ بدن میں روح پھونک دی ہو' مجھے نئی زندگی دے دی ہو۔ میرا ذہن مسحور ہونے لگا۔ یہ دنیا جو روکھی پھیکی سی تھی اب رنگین اور پُربہار ہو گئی تھی۔ میرے چاروں طرف حسین پریاں رنگا رنگ لباس میں گنگنا رہی تھیں مجھے جھولا جھلا رہی تھیں۔ میں جھولتے جھولتے غافل ہو گئی' پھر ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میری غفلت کے دوران ڈاکٹر نے اماں ابا سے کہہ دیا تھا کہ میں ابنارمل ہوں اگر میرا باقاعدہ علاج نہ ہوا تو میں نشے کی طلب میں غلط راستوں پر چل پڑوں گی۔ مجھے کم از کم پندرہ دن اسپتال میں رکھا جائے اور کاؤنٹر پر جاکر دس ہزار روپے پیشگی جمع کرا دیئے جائیں۔

اماں ابا اگرچہ غلط دھندہ کرتے تھے لیکن میرے ہی مستقبل کو خوش حال بنانے کے لئے کرتے تھے۔ انہوں نے میرا باقاعدہ علاج کرانے کے لئے دس ہزار روپے جمع کرا دیئے۔ پھر میرے کمرے میں آئے' مجھے سکون کی گہری نیند میں دیکھ کر مطمئن ہوئے' ڈاکٹر

کا شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔

وہ دو نمبر ڈاکٹر تھا۔ ہمارے ملک میں جعلی سند حاصل کرنا اور رشوت کے ذریعہ قانون کی گرفت سے بچ کر رہنا بہت آسان ہے۔ میں نہیں جانتی اس اسپتال کے پس پردہ کیسے کیسے دھندے ہوتے تھے۔ میں تو صرف اپنی ذات پر ہونے والے عذابوں کو یاد کرتی ہوں پھر نشے میں گم ہو کر تلخ یادوں سے نجات حاصل کر لیتی ہوں۔

جب میں نیم مدہوشی میں ہوتی تھی دنیا کو کچھ پہچانتی تھی کچھ نہیں پہچانتی تھی تب اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ مجھے تازہ پھل کھانے کے لئے دیئے جاتے ہیں انکار کرنے کے باوجود دودھ اوولٹین وغیرہ پلایا جاتا ہے۔ مجھے ایک آیا صاف ستھرا رکھتی ہے۔ مجھے وقت پر دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں کہتی تھی' مجھے دوا نہ دو انجکشن دو۔

ڈاکٹر کا حکم تھا کہ مجھے مقررہ وقت پر مخصوص ٹیکہ لگایا جائے۔ اس نے سختی سے کہا تھا کہ میں بے وقت نشے کے لئے چلاؤں گی تو اس رات نشے کی خوراک نہیں دی جائے گی لہٰذا اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے مجھے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد مجھے ٹیکہ لگانے کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ ہر رات ڈاکٹر کے ساتھ کوئی نیا شخص آتا تھا۔ مجھے دیکھتا تھا اور پسند کرتا تھا۔ ڈاکٹر اس سے کہتا تھا۔ "آئیں پہلے نیکی کریں۔ اسپتال کو پانچ ہزار کا عطیہ دے کر ثواب دارین حاصل کریں۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ جاتا پھر عطیہ دے کر تنہا میرے کمرے میں آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن کی ننھی سی شیشی اور ایک سرنج ہوتی تھی۔ وہ انجکشن دیکھتے ہی بچہ ماں کے دودھ کے لئے کیا مچلے گا جیسے میں مچل جاتی تھی لیکن وہ شیشی اور سرنج کو مجھ سے ذرا دور ایک تپائی پر رکھتا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر اپنی مطلوبہ چیزوں کی طرف جانا چاہتی تھی مگر وہ جانے نہیں دیتا تھا۔ میری بے چینی سے اور تڑپنے کی اداؤں سے محظوظ ہوتا تھا۔ یہ ایسا کھیل ہوتا تھا جس میں ہارنے کے بعد مجھے نشے کی ٹرافی ملتی تھی۔

جب وہ چلا جاتا تھا تب میں تپائی تک پہنچتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک بار مجھے سکھا دیا تھا کہ کس طرح شیشی کی دوا سرنج میں لینی چاہئے پھر کس طرح سوئی کو ہاتھ کی کسی ایک نس میں پیوست کر کے اس نشے کو انجکٹ کرنا چاہئے۔ ہائے! انجکٹ کرتے ہی میری رگوں میں

لہو دوڑتا نہیں تھا ناچنے لگتا تھا۔ میرے بدن کی مزدوری مجھے مل جایا کرتی تھی۔

صبح ایک گھنٹے اور شام ایک گھنٹے کے لئے اماں ابا مجھ سے ملاقات کے لئے آتے تھے۔ اس وقت میں ہوش میں رہتی تھی' ہوشمندی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ خوش ہو جاتے کہ میں علاج سے ٹھیک ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا پندرہ دنوں تک میرا علاج ہوتا رہے گا۔ اس نے پندرہویں دن میرے پاس آ کر کہا۔ "تم میں بلا کی کشش ہے۔ جو آتا ہے تمہیں ہی پسند کرتا ہے۔"

"ڈاکٹر! مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ اب ایسا نہ کرو۔ مجھ سے انجکشن کی نقد قیمت لے لیا کرو۔"

"نہیں بے بی! قدیم زمانے میں سکے نہیں ہوتے تھے۔ ایک چیز دے کر دوسری چیز خریدی جاتی تھی میرے اسپتال میں سکے نہیں چلتے چیز کا چیز سے تبادلہ ہوتا ہے۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں؟ میں ٹیکے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر علاج کے بہانے مجھے مزید پندرہ دنوں کے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ میں انکار کر کے چلی جاتی تو وہ ٹیکے مجھے نہیں ملتے۔ میں گھر جا کر اپنی بوٹیاں نوچنے لگتی۔

پندرہ دن گزر گئے۔ اماں ابا مجھے لینے نہیں آئے۔ سولہویں دن ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کہاں ہیں تمہارے والدین؟ کل سے کیوں نہیں آئے؟ کیا اسپتال کا بل ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں؟"

"ڈاکٹر! شرم کرو۔ تم نے پندرہ دنوں میں مجھ سے پچھتر ہزار روپے وصول کئے ہیں۔ میں نشے میں رہتی ہوں مگر نیم ہوشمندی سے بہت کچھ سمجھتی بھی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بگڑتی کیوں ہو' اسپتال میں تمہارے نام کا اکاؤنٹ ختم کر دوں گا۔ تمہارے والدین سے علاج کا ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ وہ جب تک نہ آئیں یہاں آرام سے رہو۔"

مزید تین دن گزر گئے۔ میں نے ڈاکٹر کے چیمبر میں آ کر کہا۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں اماں ابا کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ میں گھر جا کر معلوم کروں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "واقعی تشویش کی بات ہے۔ تمہیں جا کر معلوم کرنا چاہئے۔"

کا شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔

وہ دو نمبر ڈاکٹر تھا۔ ہمارے ملک میں جعلی سند حاصل کرنا اور رشوت کے ذریعہ قانون کی گرفت سے بچ کر رہنا بہت آسان ہے۔ میں نہیں جانتی اس اسپتال کے پس پردہ کیسے کیسے دھندے ہوتے تھے۔ میں تو صرف اپنی ذات پر ہونے والے عذابوں کو یاد کرتی ہوں پھر نشے میں گم ہو کر تلخ یادوں سے نجات حاصل کر لیتی ہوں۔

جب میں نیم مدہوشی میں ہوتی تھی دنیا کو کچھ پہچانتی تھی کچھ نہیں پہچانتی تھی تب اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ مجھے تازہ پھل کھانے کے لئے دیئے جاتے ہیں انکار کرنے کے باوجود دودھ اوولٹین وغیرہ پلایا جاتا ہے۔ مجھے ایک آیا صاف ستھرا رکھتی ہے۔ مجھے وقت پر دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں کہتی تھی' مجھے دوا نہ دو انجکشن دو۔

ڈاکٹر کا حکم تھا کہ مجھے مقررہ وقت پر مخصوص ٹیکہ لگایا جائے۔ اس نے سختی سے کہا تھا کہ میں بے وقت نشے کے لئے چلاؤں گی تو اس رات نشے کی خوراک نہیں دی جائے گی لہٰذا اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے مجھے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد مجھے ٹیکہ لگانے کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ ہر رات ڈاکٹر کے ساتھ کوئی نیا شخص آتا تھا۔ مجھے دیکھتا تھا اور پسند کرتا تھا۔ ڈاکٹر اس سے کہتا تھا۔ "آئیں پہلے نیکی کریں۔ اسپتال کو پانچ ہزار کا عطیہ دے کر ثواب دارین حاصل کریں۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ جاتا پھر عطیہ دے کر تنہا میرے کمرے میں آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن کی ننھی سی شیشی اور ایک سرنج ہوتی تھی۔ وہ انجکشن دیکھتے ہی بچہ ماں کے دودھ کے لئے کیا مچلے گا جیسے میں مچل جاتی تھی لیکن وہ شیشی اور سرنج کو مجھ سے ذرا دور ایک تپائی پر رکھتا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر اپنی مطلوبہ چیزوں کی طرف جانا چاہتی تھی مگر وہ جانے نہیں دیتا تھا۔ میری بے چینی سے اور تڑپنے کی اداؤں سے محظوظ ہوتا تھا۔ یہ ایسا کھیل ہوتا تھا جس میں ہارنے کے بعد مجھے نشے کی ٹرافی ملتی تھی۔

جب وہ چلا جاتا تھا تب میں تپائی تک پہنچتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک بار مجھے سکھا دیا تھا کہ کس طرح شیشی کی دوا سرنج میں لینی چاہئے پھر کس طرح سوئی کو ہاتھ کی کسی ایک نس میں پیوست کر کے اس نشے کو انجکٹ کرنا چاہئے۔ ہائے! انجکٹ کرتے ہی میری رگوں میں

لہو دوڑتا نہیں تھا ناچنے لگتا تھا۔ میرے بدن کی مزدوری مجھے مل جایا کرتی تھی۔

صبح ایک گھنٹے اور شام ایک گھنٹے کے لئے اماں ابا مجھ سے ملاقات کے لئے آتے تھے۔ اس وقت میں ہوش میں رہتی تھی' ہوشمندی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ خوش ہو جاتے کہ میں علاج سے ٹھیک ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا پندرہ دنوں تک میرا علاج ہوتا رہے گا۔ اس نے پندرہویں دن میرے پاس آ کر کہا۔ "تم میں بلا کی کشش ہے۔ جو آتا ہے تمہیں ہی پسند کرتا ہے۔"

"ڈاکٹر! مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ اب ایسا نہ کرو۔ مجھ سے انجکشن کی نقد قیمت لے لیا کرو۔"

"نہیں بے بی! قدیم زمانے میں سکے نہیں ہوتے تھے۔ ایک چیز دے کر دوسری چیز خریدی جاتی تھی میرے اسپتال میں سکے نہیں چلتے چیز کا چیز سے تبادلہ ہوتا ہے۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں؟ میں ٹیکے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر علاج کے بہانے مجھے مزید پندرہ دنوں کے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ میں انکار کر کے چلی جاتی تو وہ ٹیکے مجھے نہیں ملتے۔ میں گھر جا کر اپنی بوٹیاں نوچنے لگتی۔

پندرہ دن گزر گئے۔ اماں ابا مجھے لینے نہیں آئے۔ سولہویں دن ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کہاں ہیں تمہارے والدین؟ کل سے کیوں نہیں آئے؟ کیا اسپتال کا بل ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں؟"

"ڈاکٹر! شرم کرو۔ تم نے پندرہ دنوں میں مجھ سے پچھتر ہزار روپے وصول کئے ہیں۔ میں نشے میں رہتی ہوں مگر نیم ہوشمندی سے بہت کچھ سمجھتی بھی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بگڑتی کیوں ہو' اسپتال میں تمہارے نام کا اکاؤنٹ ختم کر دوں گا۔ تمہارے والدین سے علاج کا ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ وہ جب تک نہ آئیں یہاں آرام سے رہو۔"

مزید تین دن گزر گئے۔ میں نے ڈاکٹر کے چیمبر میں آ کر کہا۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نا نہیں اماں ابا کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ میں گھر جا کر معلوم کروں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "واقعی تشویش کی بات ہے۔ تمہیں جا کر معلوم کرنا چاہئے۔"

اس نے دو سو روپے دیتے ہوئے کہا۔ "آنے جانے کا کرایہ رکھو۔ گھر میں خیریت ہو تو ماں باپ سے کہہ دینا ابھی علاج ادھورا ہے۔ رات سے پہلے چلی آنا۔ پتا نہیں تم نے ملک حیات صاحب پر کیا جادو کر دیا ہے' وہ ہر دوسرے دن چلے آتے ہیں۔ آؤ گی نا؟"

میں جواب دیئے بغیر جانے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آؤ گی۔ میں نہ بولوں تب بھی آؤ گی۔ تمہاری خوراک میرے پاس ہے۔"

وہ کمبخت درست کہہ رہا تھا۔ میں کسی ڈرگ اسٹور سے وہ انجکشن خریدنے جاتی تو دکاندار انکار کر دیتے۔ ایک کم عمر لڑکی سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ پولیس والے بھی پیچھے لگ جاتے۔ میں کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے کی طرح پھر ڈاکٹر کے پاس جانے والی تھی۔

میں گھر پہنچی تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ محلے کی دو چار عورتیں اپنے اپنے دروازوں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ میں نے چاچی خیراں سے پوچھا۔ "یہاں تالا کیوں ہے؟"

چاچی نے دروازہ بند کر لیا۔ میں دوسری پڑوسن سے پوچھنے پلٹی تو اس نے کھڑکی بند کر لی۔ ایک ایک کر کے سارے دروازے کھڑکیاں بند ہونے لگیں۔ میں نے اویس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا' اویس نظر آیا۔ وہ بہت اجڑا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے جسم کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "آؤ' جلدی آؤ۔ کچھ لائی ہو؟ دیکھو کوئی میرے بدن کو نوچ رہا ہے' میری رگوں میں لہو جم رہا ہے۔ ایک چٹکی دے دو۔"

میں نے کہا۔ "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو اچھا خاصا اسٹاک رہا کرتا تھا۔ کیا اب تھانے سے مال نہیں آتا؟"

"نہیں۔ میرا باپ مر گیا ہے۔ وہ میرا دشمن مر گیا ہے۔ والدین مرنے سے پہلے اپنی اولاد کے لئے زمین جائیداد چھوڑ کر جاتے ہیں' وہ میرے لئے ایک پڑیا بھی چھوڑ کر نہیں گیا۔"

میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا بک رہے ہو۔ کیا تھانیدار چاچا کا انتقال ہو گیا

ہے؟"

"ہاں بارہ دن ہو گئے۔ ادھر تم چلی گئی' ادھر وہ دنیا سے چلا گیا۔ تھوڑا سا مال تھا وہ کل تک چلتا رہا' آج ایک چٹکی بھی نہیں ہے۔ آہ رشیدہ! اڈوں پر چھاپے مارنے والا' تھانے سے آدھا مال گھر لانے والا باپ نہیں رہا۔ جو لوگ ابا سے مال خریدنے آتے تھے' وہ مجھ سے بھی مانگنے آتے تھے۔ میں ان سے بھیک مانگتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک اڈہ بتایا ہے۔ تم بیٹھو میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ کر پوچھا۔ "میرے اماں ابا کہاں ہیں؟"

"جیل میں۔"

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر جا رہا تھا۔ میں نے پھر راستہ روک لیا۔

"جیل میں کیوں ہیں؟ کس جیل میں ہیں؟"

"پتہ نہیں کس جیل میں ہیں۔ میرے ابا زندہ ہوتے تو تمہارے والدین پر آنچ نہ آنے دیتے۔ ایک دن اچانک ہی تمہارے گھر پر پولیس نے ریڈ کیا تھا۔ ایک فوجی افسر بھی تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس افسر کی کوٹھی میں چاٹ کی ون ڈش پارٹی تھی۔ اس پارٹی میں کئی ڈاکٹر اور ڈرگ کے ماہرین بھی تھے۔ انہوں نے چاٹ میں ملاوٹ کو پکڑ لیا لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کرایا پھر تمہارے گھر پر چھاپہ مارا' کافی مقدار میں افیون کوکین' برآمد ہوئی۔ تمہارے ماں باپ کی بہت بری طرح پٹائی ہوئی ہے۔"

وہ بول رہا تھا۔ میں سن رہی تھی۔ میرے والدین نے وکیل کے ذریعے ضمانت کی بڑی کوششیں کیں لیکن یہ مجرمانہ حرکت ایک فوجی افسر کی کوٹھی میں کی گئی تھی اس لئے ان پر بڑی سختیاں کی گئیں۔ عدالت سے ضمانت نامہ حاصل نہ ہو سکا۔ انہیں جیل بھیج دیا گیا ہے۔ اویس نے چابیوں کا ایک گچھا دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری اماں مجھے یہ چابیاں دے گئی تھی۔ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں بیٹھ گئی۔ نہ بیٹھتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے گھر کا تالا کھول کر اندر آئی۔ جیسے روح کے بغیر جسم خالی ہوتا ہے۔ ویسے ہی وہ گھر میرے والدین کے بغیر اجڑ گیا تھا۔ میں وہاں کھڑی ہوئی تھی پھر بھی وہ گھر خالی تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں ذلت اور بربادی کی آخری اسٹیج پر کھڑی ہوں۔ درس گاہوں میں زہر پھیلانے کا سلسلہ میرے گھر سے شروع ہوا تھا اور میرے گھر میں اور میری ذات پر ختم ہو رہا تھا۔ میرے اور بہن بھائی ہوتے تو یہ سلسلہ ان کی بھی تباہی تک جاری رہتا۔ میں اکیلی ہوں۔ یہ قصہ مجھ پر ختم ہو جائے گا جبکہ دوسرے گھروں میں یہ جاری رہے گا۔

میں نے سوچا مجھے عہد کرنا چاہئے کہ یہ ذلت کا راستہ چھوڑ دوں گی۔ اُسے چھوڑنے کے لئے نشہ چھوڑ دوں گی لیکن ادریس سگریٹ لے کر آیا۔ اسے سلگایا تو اس کے دھوئیں نے میرے عزم کو دھواں دھواں کر دیا۔ اگر میں عہد پر قائم رہتی' ایک سُوٹا بھی نہ لگاتی تو شام تک بدن ٹوٹنے لگتا۔ رات کو ٹیکہ لینے کے مقررہ وقت تک بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی۔ گھر جو عادت پڑی تھی وہ انتہا کو پہنچنے سے پہلے ختم ہو سکتی تھی۔ میں پھر سے ایک معصوم اور شریف زادی بن سکتی تھی لیکن دو نمبر کے ڈاکٹر نے ٹیکے کا رقیق مادہ میری رگوں میں پہنچا کر مجھے نشے کی بھکارن بنا دیا تھا۔

میں اس مایوس کن مرحلے میں تھی جہاں انسان مستقل مزاجی سے نشہ چھوڑنے کے فیصلے پر عمل نہیں کر پاتا۔ اندر سے ایسی بے چینی اور کرب میں مبتلا ہوتا ہے جیسے رگ رگ میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ سانس رک رک کر آتی ہے۔ ایسے لمحات میں علاج ایک ہی ہے' وہ ایک ٹیکہ ہی زندگی دیتا ہے۔ خواہ کیسی ہی بے حیا غلاظت بھری زندگی دیتا ہو۔ وہ تھوڑی سی زندگی جی لینے کا حق پہنچتا ہے۔

میں نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد جیل میں والدین سے ملاقات کی۔ اماں زنانہ جیل اور ابا مردانہ جیل میں تھا۔ پہلے ابا سے سامنا ہوا وہ بولا۔ "بیٹی! حوصلہ رکھو۔ میرے وکیل نے اپیل کی ہے' ضمانت ضرور ہوگی۔ میں جلد ہی گھر آؤں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "ابا! جب تک نہیں آؤ گے میں کیا کھاؤں گی؟ تُو نے کوئی جمع پونجی نہیں چھوڑی۔ گھر کا سامان بیچنے جاتی ہوں تو خریدار میرا بھاؤ پوچھتے ہیں۔"

"چپ ہو جا بیٹی! میرے سامنے ایسی باتیں نہ کر۔"

"چپ رہوں گی تو کیا جیل کے اندر سے مجھے روٹی بھیجے گا؟ باہر کوئی طالب علم تیری چاٹ کے بغیر نہیں رہتا۔ تیری چاٹ نے مجھے نشے کے چارٹ کے سب سے بلند گراف پر پہنچا دیا ہے۔ مجھے روٹی نہیں ٹیکہ چاہئے اور وہ ٹیکہ تیرے منہ پر تھوکنے کے بعد ملتا ہے۔"

وہ رونے لگا۔ آہنی سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا۔ میں وہاں سے چلی آئی۔ اماں کے پاس آ کر اسے بھی خوب سنائیں۔ اس پر ترس بھی آیا۔ اس نے دل کو لگتی ہوئی بات کہی کہ گھر سنبھالنے والا مرد غیرت مند نہ ہو تو اس گھر کی عورتیں حالات کے دھارے میں بے غیرت ہوتی چلی جاتی ہیں۔

یہ درست ہے۔ ہم تو آلہ کار ہیں۔ مرد ہمیں جیسے استعمال کرتا ہے ہم استعمال ہوتی رہتی ہیں۔ غیرت مند گھرانوں میں بھی عورتیں ہیں جو تہذیب اور شرافت کے دائروں میں مستعمل ہیں۔ ہم میں اور ان عورتوں میں جو فرق ہے وہ مرد کے طریقہ استعمال نے پیدا کیا ہے۔

میں گھر واپس آ گئی۔ ادریس سے کہا ہوا تھا کہ وہ میرے گھر کے صوفے بیچ دے تاکہ کچھ روز کے لئے روٹی اور ٹیکے کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ہمارا گزارہ اسی طرح ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے گھر کا سامان بیچتا تھا' کبھی میں بیچتی تھی۔ میں نے فرسٹ ایئر تک اور اس نے سیکنڈ ایئر تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن ہمارا حلیہ دیکھ کر کوئی ملازمت نہ دیتا۔ ہم خود کہیں کام کرنے کے قابل نہیں تھے۔ مدہوشی اور نیم مدہوشی میں عالیشان خیالی محل تعمیر کرتے وقت زندگی بہت خوبصورت لگتی تھی جب نشے کی طلب شدت اختیار کرتی تھی تو ایک ہی خیال قائم ہوتا تھا کہ کل کا بھروسہ نہیں ہے۔ زندگی آج ہی آج ہے۔ بس آج نشہ مل جائے۔ آج کے بعد ہم نہیں رہیں گے۔ تو یہ مکان اور یہ سامان کس کے کام آئے گا لہٰذا جو ہے اسے جانے دو اور ٹیکے کو آتے رہنے دو۔

صرف دو ماہ میں ہم دونوں کے مکانوں کا تمام سامان فروخت ہو گیا۔ ہم دونوں چڑچڑے اور بد مزاج ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے' پھر نشے میں ایک دوسرے کو معاف کر دیتے۔ ایک رات اس نے خوب جھگڑا کیا' میری خوب پٹائی کی۔ پھر ہم دم لگانے لگے تو اندر کا غبار نکلنے لگا۔ وہ بڑی دیر تک مجھے گلے لگا کر روتا رہا پھر ہم

غفلت کی نیند سو گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ میرے پاس نہیں تھا۔ پہلے مجھے روز صبح غسل کرنے کی عادت تھی۔ اب پانی سے ڈر لگتا تھا۔ ہفتے مہینے گزر جاتے تھے' میں غسل نہیں کرتی تھی۔ گرمی کے موسم میں گیلے کپڑے سے بدن رگڑ کر صاف کر لیتی تھی۔ میں نے ناشتا کرنے کے لئے اویس کو تلاش کیا۔ باہر آکر دیکھا اس کے دروازے پر کوئی دوسرا شخص تالا لگا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اویس کہاں ہے؟"

"پتا نہیں بی بی! ہم نے تو کل ہی اسے پے منٹ کر دی تھی اور اس مکان کا قبضہ لے لیا تھا۔ وہ ابھی گیا ہے تو ہم تالا ڈال رہے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس نے مکان کا سودا کر لیا ہے۔ آج کل میں اسے تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے ملنے والے تھے اور شاید مل گئے تھے وہ بینک میں رقم جمع کرنے گیا ہو گا۔ میں گھر میں آکر اس کا انتظار کرنے لگی۔ محلے والے ہمارے میل جول پر اعتراض کرتے تھے۔ اویس نے کہا تھا ہم شادی کر لیں گے۔ جو رقم ملے گی اس سے میرے مکان کے سامنے والے حصے میں دکان کھولیں گے اور آمدنی کا سلسلہ رکھیں گے۔

وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ میرے ساتھ میرے مکان میں زندگی گزارنے کے بھروسے میں اس نے اپنا مکان بیچ دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے زندگی میں کچھ ملا ہے تو وہ میرا اویس ہے لیکن میری سوچ کو زبردست دھچکا لگا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ دوسرے دن محلے کے ایک دکاندار نے بتایا کہ وہ ہوائی جہاز سے کراچی چلا گیا ہے۔

میں ایک دم سے ٹوٹ گئی۔ پچھلے دن سے اس کے انتظار میں بھوکی تھی' ٹھیک ہے کہ میں بدن کی پارسا نہیں تھی لیکن میری محبت میں تو پارسائی تھی۔ اس کے لئے جو انتظار تھا اس میں سچائی تھی۔ ایمان والے خدا کے نام پر روزہ رکھتے ہیں' میں نے اس کے نام سے فاقے کئے تھے۔ یہی تو محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ ورنہ کس کا ایمان ایک ٹکے کے عوض یا ایک سکے کے بدلے نہیں بکتا؟

میں اس کے جانے پر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ آہ! کیسا خالی مکان تھا' کیسی خالی دنیا تھی' کوئی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے والا نہیں تھا۔ میں دوپہر کو گرتی پڑتی دو

بر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے میری حالت پر تشویش کا اظہار کیا۔ جھوٹی سچی ہمدردی کی۔ مجھے پیٹ بھر کر کھلایا اور کہا۔ "کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں روٹی بھی تی رہے گی اور ٹیکہ بھی۔ بس اندھیرا ہوتے ہی چلی آیا کرو۔"

چوبیس گھنٹوں تک فاقے کرنے کے بعد روٹی ملے تو اس سے بھی نشہ ہونے لگتا ہے۔ میں تھکن سے چُور ہو کر بستر پر گر پڑی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں بند ہونا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر! برائی پھر برائی ہوتی ہے کبھی نہ کبھی پکڑی جاتی ہے۔ میرے ماں باپ کا جو حشر ہوا' وہ تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہاں تمہاری جیسی مریضہ کے پاس معمولی لوگ نہیں آتے۔ غیر معمولی شریف اور عزت دار آیا کرتے ہیں۔ وہ یہاں کے معاملات دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرتے۔ انہیں اپنی عزت اور شرافت عزیز ہوتی ہے۔ وہ وسیع ذرائع کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی سرپرستی کے باعث کوئی پولیس والا یہاں قدم نہیں رکھتا ہے۔"

وہ اور بھی کچھ کہتا رہا لیکن میری آنکھ لگ گئی۔ بڑی دیر تک گہری نیند سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ وہاں کی ایک خاص راز دار آیا نے آکر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے اچھی طرح غسل کرو۔ تمہارے لئے نیا لباس آیا ہے۔"

"میں غسل نہیں کروں گی۔ گیلے کپڑے سے بدن پونچھ لوں گی۔"

"مگر میں تو حکم کی بندی ہوں' اپنے سامنے غسل کراؤں گی۔ تمہیں ٹھنڈے پانی سے ڈر لگتا ہے اس لئے پانی گرم کیا گیا ہے۔"

مجھے غسل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ میں نے غسل تو کر لیا۔ لباس بھی نیا پہن لیا لیکن اویس کے جانے سے میرے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی اس سے میں جھنجلا گئی تھی۔ سوچ رہی تھی' زندہ رہ کر کیا کروں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی رشتہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنا کہہ سکوں۔ میرے پاس تو گود میں اٹھانے کے لئے ایک بلی کا بچہ بھی نہیں ہے۔ کیا میں مر نہیں سکتی؟

اصل بات حوصلہ ہے۔ مرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے تو زندگی کے فولادی مسائل سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور میرا تو صرف ایک مسئلہ تھا' نشے کی طلب اگر میں

اس طلب کو کچل دوں یا ناکام ہو کر جان دے دوں تو مجھ جیسی ایک بُری لڑکی کا اور اس دو نمبر اسپتال کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں نے پچھلے دنوں اماں ابا سے ملاقات کرنے کے سلسلے میں پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کو دیکھا تھا۔ اس کا نام عادل حسین تھا۔ وہ بہت ہی بااصول اور قانون کا کٹر بندہ تھا۔ اس کے متعلق سنا تھا کہ وہ رشوت دینے والوں کو خفیہ سیل میں لے جا کر ایسی پٹائی کرتا ہے کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتے تھے یا پھر رشوت کے لین دین سے توبہ کر لیتے تھے۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آج میری اماں ضمانت پر رہا ہونے والی تھی میں گھر کی چابیاں اسے دے کر آؤں گی۔ مجھے دو سو روپے کی ضرورت ہے۔"

اس نے روپے دیتے ہوئے کہا۔ "رات نو بجے تک آجانا۔ مجھے دھوکا دو گی تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ آئندہ تمہارے برے وقت پر کام نہیں آؤں گا۔"

میں آنے کا وعدہ کر کے اسپتال سے باہر آئی ایک رکشا والے سے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ تک چلنے کو کہا۔ وہاں پہنچی تو دفتر بند ہو چکے تھے۔ چوکیدار سے اعلیٰ افسر عادل حسین کی کوٹھی کا پتا معلوم کیا۔ کوٹھی میں پہنچی تو اعلیٰ افسر موجود تھا۔ وہاں کے دربان اور ملازموں کی بڑی خوش آمدیں کرنے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"جی میرا نام رشیدہ ہے۔ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ بہت بری ہوں لیکن سر! میں اتنی بری بھی نہیں ہوں۔ ایک برائی ختم کرنا چاہتی ہوں۔ آج کل پولیس والوں کو پہچاننا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ کون ایمان دار ہے اور کون بے ایمان؟ مگر آپ کی ایمانداری کا ہر جگہ چرچا ہے۔ میری عقل کہتی ہے کہ آپ ہی اس برائی کو ختم کر سکیں گے۔"

وہ ٹھنڈے سے لہجے میں بولا۔ "آرام سے بیٹھ کر سناؤ۔ قصہ کیا ہے؟"

میں نے اپنی روداد شروع سے آخر تک سنادی۔ اس نے سن کر پوچھا۔ "تم کیا سوچ کر آئی ہو، کیا ایسی برائیوں کو ختم کر دو گی؟"

"سر! برائیاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی، لیکن ہم آپ انہیں کم تو کر سکتے ہیں۔"

"شاباش، اچھے شہری کو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ہر شخص تھوڑی تھوڑی برائی کم

کرے تو یہ دنیا بہت خوبصورت ہو جائے گی۔ تم اس اسپتال میں واپس جاؤ میں ٹھیک گیارہ بجے رات کو پولیس پارٹی کے ساتھ وہاں چھاپہ ماروں گا انہیں رنگے ہاتھوں پکڑوں گا اور تمہیں سرکاری گواہ بنالوں گا۔"

میں اس کی ہدایت کے مطابق واپس آگئی۔ رات کے نو بج گئے تھے۔ نشے کی طلب ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا اگر پولیس ریڈ کا معاملہ طول پکڑے گا اور میں طلب میں ایب نارمل ہونے لگوں گی تو اعلیٰ افسر کے سامنے شرمندگی ہوگی۔ میں نے ایک ڈرگ اسٹور سے انجکشن کی شیشی لے لی۔ ایک سرنج ہمیشہ میرے پرس میں رہتی تھی۔ اس رات میرا ارادہ تھا کہ آدھی شیشی انجکٹ کروں گی تا کہ طلب بھی کسی حد تک پوری ہو اور میں حواس میں رہ کر باتیں بھی کر سکوں۔

میں اسپتال کے مخصوص کمرے میں آگئی۔ وہاں دوسرے کمروں میں دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ انہیں بھی علاج کے بہانے سے رکھا گیا تھا۔ وہ پیشہ کرنے والی لڑکیاں نہیں تھیں، شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ نشے کی عادت انہیں لے آئی تھی۔ وہ بھی میری طرح طلب سے مجبور ہو کر آتی جاتی رہتی تھیں۔ جو عورتیں خوبصورت یا قبول صورت نہیں ہوتی تھیں یا کچھ زیادہ عمر والی ہوتی تھیں انہیں اینٹی ڈرگس دوائیں دے کر رخصت کر دیا جاتا تھا۔ نشہ کرنے والے مردوں کو بھی اسی طرح ٹال دیا جاتا تھا۔ پولیس والوں نے یا اس علاقے کی کسی فلاحی تنظیم نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ اسپتال میں صرف جوان لڑکیاں کیوں رکھی جاتی ہیں۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یہ بے چینی نشے کے لئے بھی اور پولیس ریڈ کے نتائج دیکھنے کے لئے بھی تھی۔ ڈاکٹر نے آکر پوچھا۔ "کیا طلب ہو رہی ہے؟"

"ہاں مجھے ایک شیشی دو۔"

"شیشی اور سرنج تو مہمان لے کر آتا ہے۔ آج کا مہمان بھی حاضر ہے یہ دیکھو۔"

وہ کمرے میں آیا تو میں بستر پر حیرت سے اچھل کر بیٹھ گئی۔ وہ اعلیٰ افسر عادل حسین تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شیشی اور سرنج تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "کتے کے بچے!

میں نے تجھ سے کہا تھا اچھا مال پہلے مجھے پہنچایا کر۔ آج یہ میرے پاس نہ آتی تو مجھے خبر ہی نہ ہوتی۔"

"جناب! میں ابھی آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ یہ صرف اٹھارہ دنوں تک یہاں رہی تھی۔ ان دنوں آپ کے سینئر آتے رہے۔ ان کے سامنے تو آپ صرف سلیوٹ ہی کر سکتے تھے۔"

"اچھا اچھا جا' دفع ہو جا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ وہ میرے بیڈ کے پاس آ گیا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک تپائی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے شیشی اور سرنج وہاں رکھ دی۔ میں سکتے کی حالت میں تھی۔ اس سے کیا کہتی؟ ہم سب قانون کو محترم رکھنے والے اداروں سے کہتے ہی رہتے ہیں جیسے کتے راہ گیر سے کہتے رہتے ہیں۔ بھوں بھوں۔ بھوں بھوں۔ میں اس پر بھونک سکتی تھی۔ اسے کاٹ نہیں سکتی تھی۔ کیا میری یہ سچ بیانی پڑھ کر کوئی انہیں کاٹنے کو دوڑے گا؟ میں سمجھتی ہوں آدمی جب کاٹنے پر آئے تو اسے کتا کہنے والے بپھرا ہوا شیر تسلیم کرتے ہیں' لیکن میں جس ملک اور ماحول میں رہتی ہوں' وہاں پولیس کی تطہیر کرنے والا ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا ہے۔

وہ کتا چلا گیا۔ اس دوران میرے اندر لاوا پکتا رہا' منہ سے گالیاں پھوٹتی رہیں۔ میں روتی ہوئی بستر سے اتر کر تپائی کے پاس آئی' صدمات زندگی کو بھولنے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ میں نے شیشی اٹھائی تو اسے دیکھتے ہی غصے سے پھٹ پڑی۔ وہ ڈسٹلڈ واٹر کی شیشی تھی۔ اس میں صرف پانی تھا۔ میں اسے دروازے کی طرف پھینکتے ہوئے گالیاں دینے لگی۔

ڈاکٹر کمرے میں آیا۔ اس کے پیچھے تین شخص تھے جو صورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ اس نے کہا۔ "سؤر کی بچی! بہت دیر سے گالیاں دے رہی ہے۔ یہ ابھی تک تیری سمجھ میں نہیں آیا کہ چیخنے چلانے اور گالیاں دینے سے کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ عادل صاحب نے حکم دیا ہے کہ تجھے نوچ کھسوٹ کر سڑک پر پھینک دیا جائے اور تجھے خوب چلانے کا موقع دیا جائے پھر شاید تیری سمجھ میں آئے گا کہ جب تک عادل

صاحب ہیں ہمارے خلاف عدل جہانگیر نہیں ہوگا۔"

اس نے تینوں بدمعاشوں سے کہا۔ "اس کتیا کے ساتھ کتوں جیسا سلوک کرو اور عادل صاحب کے حکم کے مطابق اسے لے جا کر سڑک پر ہی پھینکو۔ معلوم تو ہو کہ ہم جو کرتے ہیں بہانگِ دہل کرتے ہیں۔"

میں کیا بیان کروں کہ انہوں نے میرا کیا حشر کیا۔ لوگ یوم حشر سے ڈرتے ہیں لیکن میں جس حشر کے میدان سے گزری ہوں اس کے بعد خدا کا خوف مٹ جاتا ہے' صرف ظالموں کا خوف دائم و قائم رہتا ہے۔ انہوں نے مجھے ریگل کے چوراہے پر لا کر پھینک دیا۔ میں ایک ٹیکے کے لئے چیختی رہی تھی ان سے کہا بھی تھا کہ میرے پرس میں ایک شیشی ہے پہلے مجھے نشے کا زہر دے دو تاکہ تمہارے ہاتھوں میں مرتے رہنے کا احساس مر جائے لیکن ظالموں نے اتنی سی بھی مہربانی نہیں کی تھی۔

وہ سڑک پر پھینک کر چلے گئے' میں شدتِ طلب سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرس کو کھولا اس میں سے شیشی نکالی لیکن ہاتھ اتنی بری طرح کانپ رہے تھے کہ سرنج میں دوا نہیں بھر سکتی تھی۔ تب ہی سرد اوس کے دھندلکے میں کوئی آیا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فرشتے نے میرا ہاتھ تھام لیا۔"

☆======☆======☆

ابو نے کلینک کے ایک کمرے میں اسے رکھا تھا۔ بڑی محبت اور ہمدردی سے اس کا علاج کر رہے تھے۔ اس کے ذہن میں بغاوت بھر گئی تھی۔ وہ ہمارے سامنے دوائیں کھا لیتی تھی لیکن عدم موجودگی میں پھینک دیتی تھی۔ ابو نے اسے ایک منی کیسٹ ریکارڈر دے کر کہا۔ "جب بھی تنہا رہو۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے بولتی رہو۔ اس معاشرے کو' یہاں کی انتظامیہ کو اور ظالموں کو جتنی گالیاں دے سکتی ہو' دیتی رہو جلد ہی تمہارا غصہ ختم ہو جائے گا۔ میں تمہیں نارمل رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

وہ منی ریکارڈر اس کے پاس رہتا تھا۔ وہ بولتی تھی اور بولتی رہتی تھی۔ بولتے بولتے ایک دن ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔ یہی انجام ہونا تھا سو ہو گیا۔

میں نے بستر پر اس کی لاش دیکھی تو اطمینان کی سانس لی کیونکہ اب جس بستر پر سونے جائے گی وہاں کوئی شیشی اور سرنج لے کر نہیں آئے گا۔

ہونا تو یہ چاہیئے کہ اس کی لاش کو اسی ریگل کے چوراہے پر لے جاکر ڈال دیا جاتا۔ وہ وہاں ٹریفک سگنل کی طرح رہتی اور ہم آپ اِدھر سے گزرتے وقت رک جاتے اور سوچتے کہ وہاں سے ہمیں کون سا موڑ مڑنا ہے؟

☆======ختم شد======☆